وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا الآیۃ

(قرآن کریم)

وَاِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا (الحدیث)

احسن الکلام

فی

ترک القرأۃ خلف الامام

جلد اوّل

جس میں قرآن کریم، صحیح احادیث، آثار حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ و اتباعِ تابعینؒ اور دیگر جمہور فقہاءؒ اور محدثین عظامؒ سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ امام کے پیچھے کسی نماز میں کسی بھی قسم کی قرأت عموماً اور سورۂ فاتحہ کی قرأت خصوصاً ممنوع ہے اور جہری نمازوں میں تو امام کے پیچھے قرأت کرنا قرآن کریم، حدیث صحیح اور اجماع کے خلاف ہے اور فی نفسہٖ منکر اور شاذ ہے اور جہری نمازوں میں حضرات ائمہ اربعہؒ کا اتفاق ہے۔ نیز عقلی اور قیاسی دلائل سے اس مسئلہ پر فیصلہ کن بحث کی گئی ہے اور فریقِ ثانی کو مسکت جوابات دیئے گئے ہیں اور اس طبع میں "خیر الکلام" اور "الاعتصام" میں کیے گئے اعتراضات کے جوابات کو خصوصیت سے ملحوظ رکھا گیا ہے۔

تالیف

ابوالزاہد محمد سرفراز خاں صفدر

طبع دہم ـــــــ جون ۲۰۰۶ء

نام کتاب ـــــــ احسن الکلام فی ترک القرأۃ خلف الامام

مؤلف ـــــــ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دام مجدہم

تعداد ـــــــ ایک ہزار

مطبع ـــــــ فائن بکس پرنٹرز لاہور

ناشر ـــــــ مکتبہ صفدریہ نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

قیمت ـــــــ دو سو پچیس روپے

ملنے کے پتے

- مکتبہ صفدریہ نزد گھنٹہ گھر گوجرانوالہ
- مکتبہ حلیمیہ جامعہ بنوریہ سائٹ کراچی
- مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور
- مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور
- کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی
- مکتبہ العارفی جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد
- مکتبہ رشیدیہ حسن مارکیٹ نیو روڈ مینگورہ
- مکتبہ نعمانیہ کبیر مارکیٹ لکی مروت
- مکتبہ امدادیہ ملتان
- مکتبہ حقانیہ ملتان
- مکتبہ مجیدیہ ملتان
- مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور
- اسلامی کتب خانہ اڈا کامی ایبٹ آباد
- مکتبہ فریدیہ ای سیون اسلام آباد
- دار الکتاب عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور
- مدینہ کتاب گھر اردو بازار گوجرانوالہ
- مکتبہ قاسمیہ جمشید روڈ نزد جامع مسجد بنوری ٹاؤن کراچی
- مکتبہ فاروقیہ حنفیہ عقب فائر بریگیڈ اردو بازار گوجرانوالہ
- کتاب گھر شاہ جی مارکیٹ گکھڑ

فہرست مضامین

تصدیقات علماءِ کرام

چوتھا باب

تمّت بعونِ اللہِ تعالیٰ

تصدیقاتِ علماءِ کرام

فخر الاماثل قدوۃ الصلحاء حکیم الاسلام الحاج الحافظ

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم

مہتمم دار العلوم، دیوبند۔

مخدوم و محترم زاد مجدکم

سلام مسنون نیاز مقرون۔ گکھڑ سے رخصت ہو کر بعافیت لاہور اور وہاں سے دیوبند پہنچا۔ احسن الکلام کا مطالعہ یاد اور شوقِ طبعی دامن گیر تھا۔ ماشاء اللہ تعالیٰ مسئلہ فاتحہ میں اسے ایک بحرِ ذخار پایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس سعی و محنت کو قبول فرمائے اور امت کی طرف سے آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

میں نے حسبِ وعدہ تقریظ لکھنے کا ارادہ کیا۔ لکھنے بیٹھا تو غیر متوقع طریق پر تحریر طویل ہو گئی جو احسن الکلام سے متاثر ہونے کا نتیجہ تھا۔ تقریباً پانچ صفحے فل سکیپ کے ہو گئے۔ اور تقریظ کی صورت نہ رہی۔ اب دو صورتیں ہیں یا تو آپ اس میں سے وہ زائد حصہ حذف کر دیں جس میں غالی اہلِ حدیث کو ناصحانہ خطاب ہے اور اگر اسے غیر ضروری نہ سمجھیں تو دوسری صورت یہ ہے کہ اسے تقریظ کے بجائے کتاب کا مقدمہ بنا دیجیے جو میری طرف سے ہو جائے گا۔ مقدمہ کے لیے یہ تحریر موزوں رہے گی، جو بھی صورت مناسب ہو کر لی جائے۔

میں بحمد اللہ تعالیٰ بعافیت ہوں۔ اُس شب کی مہمان نوازی کا شکر گزار ہوں۔ والسلام

محمد طیب

دیوبند

۷۵/۴/۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ (سورۃ الزمر)

محترم الفاضل مولانا محمد سرفراز خاں صاحب دام بالمجد والفواضل کی لطیف ترین تالیف احسن الکلام فی ترک قرأۃ الفاتحہ خلف الامام سے استفادہ کا شرف میسر ہوا۔ مطالعہ کے وقت ہر اگلی سطر پر آنکھوں میں نور دل میں سرور اور روح میں ثلج یقین بڑھتا جاتا تھا، اثبات مسئلہ کے سلسلہ میں مصنف نے سلاستِ بیان زورِ استدلال منصفانہ تنقید اور عادلانہ مدافعت سے مسئلہ کے تحقیقی اور الزامی دونوں پہلوؤں کو مضبوط اور مستحکم کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ کتاب کا مثبت حصہ بہت زیادہ دل آویز ہے جس میں متین انداز کے ساتھ مضبوط دلائل اور مؤکد شواہد سے مسئلہ کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا اور ساتھ ہی مسئلہ کے دفاعی پہلو سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا۔ کیونکہ مثبت پہلو کے ساتھ جب تک اس کا منفی پہلو صاف نہ ہو مسئلہ من کل الوجوہ مستحکم نہیں ہوتا مصنف نے جہاں مثبت پہلو سے ماننے والوں کے لیے سینہ کی ٹھنڈک کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ وہیں منفی پہلو کے دفاع سے نہ ماننے والوں اور ان طعنہ زنوں کا منہ بند کر کے ان پر حجت بھی تمام کر دی ہے جنھیں فاتحہ اور ترک فاتحہ سے زیادہ صرف گروہی تعصب اور اس کا تفوق ہی زیادہ سے زیادہ پیش نظر ہے، لیکن ان کے مقابلے میں یہ تردید مسئلہ کے کسی اجتہادی پہلو کی تردید نہیں بلکہ ان کے تخیلات اور غیر معتدل رویہ کی تردید ہے ورنہ ایک فروعی اور ایک اجتہادی اور اوپر سے مختلف فیہ مسئلہ کے ایک پہلو کے اثبات و تحقیق پر اتنا زور دیا جانا ظاہر ہے کہ مسئلہ کی جانب مخالف اور اس کے ماننے والوں کی تردید یا مخالفت کے لیے نہیں ہے نہ ہونا چاہیے اور نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے فروعی مسائل نہ تو تبلیغی ہیں کہ انہیں دوسروں تک پہنچایا جانا اور ان کا منوایا جانا ضروری ہو اور نہ معاذ اللہ تکذیبی ہیں کہ مخالف رائے رکھنے والوں کو جھٹلایا جانا اور ان کی تکذیب کیا جانا

روا ہو بلکہ محض ترجیحی ہیں جن میں حق و باطل کا نہیں محض خطاء و صواب کا اختلاف ہے وہ بھی علی الاطلاق نہیں بلکہ اپنا صواب بھی احتمال خطا کے ساتھ اور دوسروں کی خطا بھی احتمال صواب کے ساتھ مفید ہے اور پھر اس میں بھی دوسرے کی یہ متحمل خطا اس یقین کے ساتھ ہے کہ وہ اور اس کے ماننے والے اس پر مستحق اجر و ثواب اور مستوجب نجاۃ و فلاح بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے ذوجہتین مسائل میں جن میں جانب مخالف باطل بھی نہ ہو وہ خطا قطعی بھی نہ ہو اور پرسے نجاۃ و اجر کا استحقاق بھی یقینی ہو کسی فریق کو یہ حق کیسے مل سکتا ہے کہ وہ مسئلہ کی مخالف سمت کے ساتھ طعنہ زنی اور تشنیع سے پیش آئے یا اسے باطل قرار دے کر ماننے والوں کو مبطل قرار دے۔ اور اس کے بالمقابل اپنی مسلمہ جانب کی دعوت و تبلیغ کرنے لگے۔ فریقین کو اگر حق پہنچتا ہے تو صرف یہ کہ وہ وجوہ دلائل سے اپنی مسلمہ جانب کو مسلک سنت ثابت کرتے ہوئے اس کی ترجیح واضح کر دیں جس کا منشا صرف یہ ہے کہ وہ اپنے کو تہمت بدعت سے بری ثابت کر کے دائرہ سنت میں محدود کیے ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ مسئلہ کی جس سمت کو انھوں نے اختیار کیا ہے وہ ہوائے نفس سے نہیں بلکہ وجوہ شرعیہ سے ہے۔ اس ترجیحی سلسلہ میں فریق ثانی کا ابطال یا معاذ اللہ تعالیٰ اضلال کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا کہ اس کی طرف التفات کی کوئی وجہ ہو بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان فروعی اختلافات میں سرے سے فریق بندی ہی نہیں ہے کہ فریق اول اور فریق ثانی کی بحث شروع کر کے ہل من مبارز ہے کی زور آزمائیاں دکھلائی جائیں۔ فاتحہ خلف الامام ہو یا آمین بالجہر و بالسر، رفع یدین ہو یا ترجیع اذان وغیرہ ان میں ہر مسئلہ کا مثبت اور منفی پہلو ایک ہی مسئلہ کے دو پہلو ہیں۔ مسئلے دو نہیں ہیں اور وہ پہلو بھی روایتی اور درایتی بحث سے سامنے آتے ہیں۔ شریعت نے بالاستقلال ابتدا ہی سے بیکدم دو متضاد پہلو عمل کے لیے سامنے نہیں رکھے۔ اب یہ دو پہلو خواہ زمانے کے تفاوت سے سامنے آئے کہ ابتدا میں ایک پہلو صاحب شریعت کے زیر عمل آیا اور آخر میں دوسرا جس سے ناسخ و منسوخ کی بحث پیدا ہوئی یا عزیمت و رخصت کے فرق سے سامنے آئے جس سے اولیٰ غیر اولیٰ کی بحث پیدا ہوئی یا تساوی کے ساتھ سامنے لائے گئے جس سے دونوں پہلوؤں میں

تخییر کی بحث پیدا ہوئی، بہرحال کسی بھی معیار سے سامنے آئے ہوں ایک ہی مسئلہ کے دو پہلو رہیں گے۔ جس میں ناسخ منسوخ اولیٰ غیر اولیٰ افضل غیر افضل عزیمت، رخصت تخییر و عدم تخییر کے معیار سے ترجیحات سامنے آتی رہیں گی اور وہ اپنے وقت اور ظرف اور کیف و کم کی ترجیحات کے ساتھ امت کے زیر عمل آتے رہیں گے جس سے پیغمبر صادق و مصدوق کا کوئی ارشاد اور ارشاد کا کوئی پہلو متروک العمل نہ رہے گا بلکہ ہر پہلو امت کے کسی نہ کسی طبقہ میں زیر عمل رہے گا اور اس طرح پوری اُمت نبی کے پورے ارشادات کی حامل اور عامل رہے گی۔ اندریں صورت ایک روایت دوسری روایت کی ایک حدیث دوسری حدیث کی اور ایک آیت دوسری آیت ہی کی خود ہی فریق نہیں ٹھہرتی چہ جائیکہ رجال حدیث یا حاملین آیت و روایت باہم ایک دوسرے کے فریق قرار پائیں اور آپس میں نبرد آزما ہوں۔ اور ہل من مبارز کہہ کر پہلوانوں کی طرح اکھاڑوں میں اتریں اور زور آزمائی کے جوہر دکھلائیں گویا آیات و روایات اسلحہ ہیں۔ حاملینِ آیات و روایات جنگی سپاہی اور شریعت ان کا میدان مبارزہ و مقابلہ، ظاہر ہے کہ حسی طور پر سب سے پہلے اسلحہ ٹکراتے ہیں پھر سپاہی تو اس مبارزت طلبی کا مطلب یہ ہوا کہ خود آیات و روایات میں کوئی حقیقی تعارض اور تصادم ہے جس کی مجبوری سے حاملین آیات و روایات کو بھی باہم ٹکرانا پڑا۔ حالانکہ یہ صورتِ حال خود کتاب و سنت سے مدفوع ہے اگر عیاذاً باللہ تعالیٰ ان مختلف فیہ مسائل کی ذاتی خاصیت ہی یہ نبرد آزمائی اور مبارزت طلبی ہوتی تو حضرات صحابہؓ و تابعینؒ و ائمہ مجتہدینؒ اور علمائے راسخین کو تو اس لڑائی بھڑائی اور چیلنجوں سے ایک لمحہ کی بھی فرصت نہ ملتی۔ کیونکہ وہ تو ان مسائل میں مجتہد اور مدعی کی حیثیت رکھتے تھے اور مدعی کو اپنے دعوے پر بہ نسبت ناقل اور تابع کے زیادہ جمود اور استقلال ہوتا ہے جب ناقل اور تابع محض ہو کر ہمیں ان لڑائیوں سے فرصت نہیں تو مدعیوں کو تو ایک سیکنڈ کے لیے بھی ان ہل من مبارز کے چیلنجوں سے مہلت نہ ملنی چاہیئے تھی۔ اور ان کی لڑائی ہم سے کہیں زیادہ شدید اور مدید ہونی چاہیے تھی۔ لیکن صورتِ واقعہ برعکس ہے کہ قرونِ اولیٰ میں ان عملی اور فروعی مسائل کی جانب وشقوق میں ترجیح و اختلاف کے باوجود ان حضرات کے قلوب میں ہل من مبارز اور چیلنجوں کا تصور تک نہیں ملتا چہ جائیکہ تصادم کا کوئی عمل دستیاب ہو اس لیے بلا جھجک کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہماری مبارز طلبیاں اور شرعی لائنوں میں زور آزمائیاں ان مسائل کی خاصیت نہیں بلکہ محض ہمارے نفوس کی شرارتیں ہیں جن میں جذباتِ نفس

نکالنے کا جب کہیں اور موقع نہیں ملتا تو ہم یہ کار خیر اس شرعی میدان میں انجام دے لیتے ہیں۔ بلیبے کی مار ترازو کی ڈنڈی۔ اس لیے میں تو اس تصور پر ہوں کہ جب صورت تعارض کے باوجود ایک حدیث دوسری حدیث کا فریق نہیں تو ان مسائل کے سلسلے میں مرجحین کا کوئی طبقہ کوئی دوسرے طبقہ کا فریق کیسے قرار پا سکتا ہے؟ میرے خیال میں کوئی شافعی، مالکی، اہل حدیث ان مسائل کی ترجیحات کی حد تک نہ حنفی کا فریق ہے اور نہ حنفی ان میں سے کسی کا ان میں اگر ترجیحاتی بحثیں ہیں تو وہ علمی اور نظری طور پر ایک حق کو دوسرے حق پر راجح قرار دینے کی ہیں۔ نہ کہ حق کو باطل کے مقابلے پر اختیار کرنے کی جن کا لڑائی یا چیلنجوں سے تعلق ہو۔ ہاں اگر ان مرجحین کے مقابلے میں کوئی طبقہ فریق کی حیثیت رکھتا ہے تو وہ طاعنوں تشنیع کنندوں اور ان افراد کا ہے جو کسی بھی اجتہادی شق کی تقبیح اور مذمت کے لیے مذہب و مشرب کے نام پر کھڑے ہوں۔ سو اس قسم کے طاعن اور تبرائی حضرات جس طرح تارکین فاتحہ خلف الامام کے فریق ہیں۔ اسی طرح قارئین فاتحہ خلف الامام کے بھی فریق ہیں۔ کیونکہ فاتحہ اور ترک فاتحہ تو حدیثی مسلک ہے لیکن طعن بر فاتحہ یا بر ترک فاتحہ (بایں طور کہ پڑھنے یا نہ پڑھنے والے کو مطعون کیا جائے) نہ حدیثی مسلک ہے نہ قرآنی نہ فقہی نہ کلامی۔ اس لیے اگر تارکین فاتحہ اور قارئین فاتحہ عامل بالحدیث ہونے کی وجہ سے اہل حق ہیں تو یہ طاعنین فاتحہ و ترک فاتحہ کسی سمت کے بھی ہوں۔ ان اہل حق کے فریق ہیں جن کا تقابل نہ فاتحہ سے ہے نہ ترکِ فاتحہ سے بلکہ حق اور اہلِ حق سے ہے۔ پس ایسے لوگ بلاشبہ تردید کے بھی مستحق ہیں اور تکذیب کے بھی درحالیکہ یہ تردید و تکذیب نہ کسی مسئلہ کی ہوگی نہ مسلک کی کسی اجتہادی شق کی بلکہ صرف ان افراد کی اور ان کے غیر معتدل کلام اور کلام کے اس رویّہ کی جس کا تعلق کسی حق سے نہیں بلکہ صرف ان کے جذبات نفس سے ہے۔

مصنف ممدوح نے اپنی اس متین کتاب میں اگر کہیں رد و قدح سے کام لیا ہے تو وہ درحقیقت اسی طبقہ کے مقابلے پر ہے جو مسائل کو مسائل کی نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ جذبات نفس کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ بقول شخصے کہ وہ نہ آمین بالجہر پر لڑتا ہے۔ نہ آمین بالسّر پر بلکہ صرف آمین بالشّر پر اس لیے وہ دونوں قسم کی آمین والوں کا فریق مقابل ہے۔ کیونکہ آمین کی پہلی دو قسمیں تو روایات میں ملتی ہیں لیکن تیسری سے قرآن و حدیث خالی ہیں۔ اس کا وجود اگر ہے تو صرف ان لوگوں کے نفس میں ہو سکتا ہے اور بس۔ پس مصنف کو یقیناً کسی اجتہادی مسئلہ کی شق کی بھی تردید کا حق نہیں لیکن بالیقین

ایسے طعنہ زن اور ان کی ایسی غلط روشوں اور مطاعن کی تردید بلکہ تکذیب کا حق ضرور پہنچتا ہے۔ جو مسئلہ کے بجائے اپنے نفس کی مصلحت کو آگے رکھتے ہوں اور دلائل سے گزر کر جذبات کو مسئلہ کی کافی دلیل خیال کر رہے ہوں اگر مصنف نے ایسے لوگوں کی تردید کا فرض احسن الکلام کے ساتھ ادا کیا تو بلا شبہ انھیں اس کا حق تھا اور انھوں نے حق ادا کر دیا۔

اگر طعنہ زن حضرات کو حدیث کے نام پر زور آزمائی کا ایسا ہی شوق دامن گیر ہے تو انھیں چاہیے کہ وہ پہلے منکرین حدیث سے نمٹیں اور نفس حدیث کے موقف کو تھامنے میں یہ زور آزمائی دکھلائیں۔ وہ ان سے کیا نمٹنا چاہتے ہیں جو خود ہی حدیث، فن حدیث، فقہ حدیث اور ائمہ حدیث کے متبع اور ایک فانی گرویدہ و معتقد کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے یہاں حدیث رسول ہی نہیں رجال حدیث تک کی بے پناہ عظمت و بزرگی اور مخلصانہ پیروی کے جذبہ کو قائم رکھنا ایمان کا جزو اعظم ہے۔ نیز ان طعنہ زن حضرات کو اگر واقعی تبلیغ حق کا جذبہ بے چین کیے ہوئے ہے تو وہ منکروں کو اصول اسلام اور اصل دین کی تبلیغ فرمائیں جس کی تبلیغ ضروری ہے تو فروعی مسائل کب ہیں کہ ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو اس کے مختارہ کی جانب سے ہٹا کر اپنی مختار جانب پر لانے کی کوشش کرے نیز اگر تردید ضروری ہے تو غیر اسلامی اصول کی ضروری ہے نہ کہ کسی اجتہادی شق کی سمت مخالف کی جس میں ہمہ وقت صواب کا احتمال قائم رہتا ہے اور اس پر چلنے والا ہر وقت اجر و نجات کا مستحق ہوتا ہے۔ پس تبلیغی سرگرمیاں اور بغض فی اللہ کے مجاہدانہ چیلنجوں کو اگر کام میں لانا ہے تو مخربینِ دین، محرفینِ کتاب و سنّت اور مستہزئینِ اسلام کے مقابلہ میں لانا چاہیے نہ کہ فاتحہ وغیرہ جیسے فروعی اور اجتہادی مسائل کی ترجیحی شقوق و جوانب کے نام پر خود معتقدینِ دین و ائمہ دین کے مقابلہ پر میں تو سمجھتا ہوں کہ جو حضرات ان فروعی مسائل کو محض ترجیحی اور عملی مسلک جان کر ان پر سچے دل سے عمل پیرا ہیں خواہ وہ اہل فقہ ہوں یا اہل حدیث۔ انھیں اس دوران میں کسی حنفی غیر حنفی اور اس کی تسلیم کردہ جانب کا تصوّر تک بھی نہ آتا ہوگا۔ چہ جائیکہ وہ اس کے خلاف غم و غصہ سے مغلوب ہو کر چیلنجوں کی عبارتوں سے اپنے ذہنوں کو مشوّش کرتے ہوں اور ہل من مبارز کے دھیان میں غرق ہوں۔ استفسار مسئلہ کے وقت دیانتاً اپنے نزدیک جو پہلو راجح ہو اسے راجح بتلانا اور مرجوح کو مرجوح کہنا اور چیز ہے اور مرجوح کا ابطال اور افساد کرنا یا اس کے ماننے والے کی تضلیل و

تفسیق کرنا اور چیز ہے۔ پہلا کام اہل حق کا ہے اور دوسرا اہل حق کے مقابل فریق کا۔ بہر حال جیسا کہ ایک حنفی کو فاتحہ خلف الامام کے ماننے والے کو مبطل یا باطل پرست کہنے کی جرأت نہ ہونی چاہیے ایسے ہی کسی غیر حنفی کو ترکِ فاتحہ اور اس کے ماننے والوں کو باطل پرست یا مبطل یا ضال یا فاسق کہنے کی جرأت نہ ہونی چاہیے کہ یہ اسم فسوق بعد الایمان اور غیر محتاط تعبیر ہم نالائقوں ہی تک محدود نہیں رہتی دور تک جاتی ہے جس کی زد سے کوئی بڑے سے بڑا بھی نہیں بچ رہتا۔ کیونکہ عیاذاً باللہ اگر ترکِ فاتحہ خلف الامام کوئی ضال یا گمراہی ہے تو یہ ضلالت بہت پرانی اور بہت سوں کی ہے۔ ؎

مرا بر ندی عشق آں فضول عیب کند
کہ اعتراض بر اسرار علم غیب کند

ہاں اس حد تک ہم طعنہ زنوں کے ممنونِ کرم بھی ہیں کہ اگر وہ طعن و تشنیع کی راہ سے اس مسئلہ کو اپنے جذبات اور شکوک کی آماجگاہ نہ بناتے اور ایک فریق کی حیثیت سے سامنے نہ آتے تو مصنف محترم مولانا محمد سرفراز خاں صاحب کے ان دقیق علوم اور اسالیب بیان سے ہم مستفید بھی نہ ہو سکتے جو اس حیلہ سے انھوں نے اپنی کتاب احسن الکلام میں رقم فرمائے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر جہل علم سے نہ ٹکرائے تو علم کے مخفی گوشے واشگاف نہیں ہو سکتے اگر کذب۔ صدق سے ٹکر نہ کھاتے تو صدق کی مخفی قوت نمایاں نہیں ہو سکتی اگر کفر اسلام سے نہ ٹکرائے تو اسلام کے مخفی گوشے دنیا کو اپنا نور نہ دکھلا سکتے بہر حال جب تک اضداد اپنے اصول سے نہ بھڑیں اصول کا وجود و ثبوت نمایاں نہیں ہو سکتا۔ اس لیے حق تعالیٰ نے اس عالم کو عالم اضداد بنایا ہے اور ہر اصول کے پیچھے اس کی ضد لگا دی ہے تاکہ وہ اس سے ٹکراتی رہے اور اس حیلہ سے اصول کی عظمت و قوت لپکتی رہے بایں معنی تکوینی طور پر طاعنوں اور منکروں کا وجود بھی مجموعۂ کائنات کے لیے ایک حسن ہے اور ضروری ہے وہ اگر دلوں میں وسوسے اور شبہات نہ ڈالیں تو اہل عرفان سے ان کے دفعیہ کی علمی تدبیریں بھی نمایاں نہ ہوں مثل مشہور ہے کہ "ادب سیکھا جاتا ہے بے ادبوں سے" یعنی وہ ذریعہ ادب دانی بن جاتے ہیں سو علم بھی بہت حد تک جہل سے ہی سیکھا جاتا ہے۔ یعنی جہل اور اس کے پیدا کردہ شکوک و شبہات

بھی بہت حد تک ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اہل علم کی گرم جوشی آمادگی اور ان کے انقار علم کا جس سے مخلوق خدا علم سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ بس اس حد تک اس طبقہ کا ہم سب ہی کو ممنون ہونا چاہیے کہ علم کے بہت سے مخفی گوشے ان کے سبب سے سامنے آگئے اور اس شر میں سے ایک خیر ہمارے لیے نکل آئی۔ شر اپنی ذات سے شر سہی مگر مجموعۂ عالم اور اہلِ معاملہ کے لیے نسبتاً وہی خیر ہے۔ مگر محض خدا تعالیٰ کے فضل سے نہ کہ شر کے خیر ہونے سے۔ اس لیے تکوینی طور پر تو ہم طعنہ زنوں کے ممنون ہوں گے کہ ان کی بدولت کتنے ہی علم کے مخفی گوشے ہمیں دستیاب ہو گئے مگر حقیقی طور پر ہم مصنف احسن الکلام کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اس جیلہ سے مسئلہ فاتحہ کے تحقیقی اور دفاعی دونوں پہلوؤں کو بہت حد تک صاف کر دیا ہے جو موافق اور مخالف دونوں طبقوں کے لیے علمی حیثیت سے کار آمد ہوں گے۔ اگر خلاف رائے رکھنے والے حضرات کے لیے ان دلائل سے شفا ہو گئی تو ان کے خلاف میں شدت باقی نہ رہے گی خواہ وہ اپنے ہی مسلک پر عمل پیرا رہیں سو یہ کونسا کم نفع ہے اور اگر ان دلائل کے کسی مقدمہ کو کمزور پا کر انھوں نے جواب کے طور پر اسے واضح کیا تو ہم سب کے لیے ایک مزید علم کا اضافہ ہو گا اور یہ کونسا قلیل نفع ہے جو زدنی علما کا مصداق ہو، بہر صورت مولانا محمد سرفراز خاں صاحب اس تالیف لطیف کے لیے سرفراز ہوئے ہیں تو وہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں اور احسن الکلام بحیثیت مجموعی حقیقتاً احسن الکلام ہے۔ حق تعالیٰ اس احسن الکلام کو حسنِ قبول سے سرفراز فرمائے اور اسے یتّبعون احسنہ کا مصداق بنائے۔ آمین

محمد طیب غفرلہٗ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

یکم ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ

سید المناظرین سند العلماء
حضرت مولانا سید مہدی حسن رحمہ اللہ تعالیٰ
سابق مفتی اعظم دار العلوم، دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

وبعد۔ آج دنیا جس دور سے گذر رہی ہے خصوصاً مسلمانانِ عالم جن کٹھن مراحل سے گذر رہے ہیں۔ اس کا وقتی اور ہنگامی اقتضاء یہ تھا کہ وہ امت جس کا خدا ایک۔ رسول ایک، قرآن ایک۔ کعبہ ایک ہے سر جوڑ کر بیٹھتی اور ان امراض کا علاج تلاش کرتی جن امراض میں مسلمان مبتلا ہیں جن کی وجہ سے ان پر زندگی دوبھر اور وبال ہے۔ تحریکات گمراہ کن اور فتن مخرّب دین کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ نہیں، نہیں بلکہ دریا کی موجوں کی طرح پے بہ پے موجیں مار رہے ہیں جن کی لہروں کا اثر ساحلِ دریا سے باہر بھی کافی ہے: ؎

بحزم کوش کہ ایں رہ سپے پُر از خطر است	باحتیاط قدم نہ کہ جائے شور وشر است
ہمیں کہ ابر بہار وچناں تصوّر کن	کہ سیل می رسد وخانۂ تو بر گذر است

بجائے اس کے آج بھی تشتت وافتراق کی صورتیں پیدا کر کے شقاق وخلاف کے راستے کو ہموار کیا جاتا: ع وہ سمجھنے کس طرح بیٹھیں کہ جب بیٹھا نہیں جاتا

اس پر طرہ یہ کہ اس کو دینی خدمت تصوّر کیا جاتا ہے جو مسائل برسہا برس سے ایسے چلے آتے ہیں جن پر ہر زبان میں خامہ فرسائی ہو چکی ہے اور قلموں کی روشنائی خشک ہو چکی ہے۔ انہیں اختلافی مسائل میں سے فاتحہ خلف الامام کا پرانا مسئلہ ہے کوئی نئی اور جدید تحقیق نہیں ہے جس کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور وہ اس سے مستفید ہو۔ لیکن جن حضرات کی طبیعت ثانیہ یہ ہو گئی ہو کہ اختلاف وسیع ہوتا رہے وہ کب گوارا کر سکتے ہیں کہ خاموش رہیں اور اپنی تحقیق کے مطابق عمل کرتے رہیں لیکن ایسا نہیں بلکہ دورِ حاضر کے ہمارے دینی بھائی اہل حدیث حدِ اعتدال سے باہر ہو کر اسی کے درپے ہو گئے کہ جو امام کے پیچھے۔ الحمد نہ پڑھے اس کی نماز باطل ہے اور جب نماز ہی نہیں ہوتی تو تارکین صلوٰۃ ہیں بلکہ قصداً اس جرم کے مرتکب ہیں جو بجائے خود باعث نجات ہونے کے

موجبِ خسرانِ اُخروی ہے۔ یہ اپنی جگہ پر کہاں تک صحیح ہے۔ اس کو انہیں کے تلوب زیادہ محسوس کرتے ہوں گے کہ امت محمدیہ کی ایک بہت بڑی جماعت کی نماز پر بطلان کا حکم لگا کر کیا دین کی خدمت ہے، جن میں حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؒ و تبع تابعینؒ وغیرہم کی کافی تعداد داخل ہے۔ ایسی صورتِ حال پر اس کی ضرورت تھی کہ اس مسئلہ کے ہر پہلو پر از سرِ نو متانت و سنجیدگی، تہذیب و شائستگی کے ساتھ محدثانہ طریق سے روشنی ڈالی جائے جو پہلو اُجاگر نہیں ان کو اُجاگر کر دیا جائے تاکہ انصاف پسند اور علم پرور حضرات کی بصیرت دقیقہ رس اس کو دیکھ کر احسنت کہہ اٹھے: ؎

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید!

اس ضرورت کا احساس اخی محترم فاضل نوجوان مولانا محمد سرفراز خاں صفدر سرحدی خطیب جامع مسجد گکھڑ منڈی نے کیا اور اس مسئلہ پر محققانہ و منصفانہ بحث کر کے کتابی صورت میں اس کو شائع کیا جو احسن الکلام فی ترک القرآۃ خلف الامام کے نام سے موسوم ہے جس کے دو حصے ہیں۔ میں نے جزو اول کا اول سے آخر تک لفظ بہ لفظ اور جزو ثانی کا مختلف مقامات سے مطالعہ کیا ہے۔ خوبیٔ اسلوب و اندازِ بیان، زبان کی صفائی کے ساتھ دلائل و براہین پر منصفانہ نظر ڈالی ہے۔ فاضل موصوف نے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ معترضین کے شبہات کا جواب عالمانہ دیا ہے اور تحقیق کے ساتھ مجادلانہ طریق اختیار نہیں کیا کہ کتاب کی افادیت میں کمی واقع ہو۔ اپنے ہر دعوی کو براہین سے مدلل کیا ہے کہ مخالفین حضرات کو بھی اگر ان کے یہاں علم و انصاف کی قدر و قیمت ہے تو تسلیم کر لینے اور سکوت اختیار کر لینے کے سوا چارۂ کار نہیں ہے اس محنت و عرق ریزی اور تحقیق و تنقید کی جملہ احناف کی طرف سے فاضل موصوف کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور بے انصاف مخالفین کی ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ ان کے علم و عمل میں برکت عطا فرمائے اور مخلوق کے طریق رشد و ہدایت کا رہبر بنائے۔ طلباء و عوام کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ علماء بھی اس کتاب کے مطالعہ سے دریغ نہ فرمائیں کہ براہین و دلائل اور آثار و اقوالِ ائمہ یکجائی طور پر اس کتاب میں ملیں گے۔ بعض مباحث ایسے بھی اس کتاب میں ملیں گے جو بڑی عرق ریزی اور کافی مطالعہ کتب

بمشکل حاصل ہو سکتے ہیں جن کو فاضل مؤلف نے بہت خوبی کے ساتھ اپنے اپنے موقع پر پیش کیا ہے اس لیے ہر اس شخص کو اس کتاب سے استفادہ کرنا چاہیے جو حنفیت سے وابستہ ہو تاکہ اپنے مذہب کی صداقت خصوصاً مسئلہ فاتحہ خلف الامام میں ہویدا اور نمایاں ہو جائے۔ طباعت و کتابت کی کہیں کہیں کوتاہیاں ہیں جو اشاعت آیندہ میں دور ہو جائیں گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

احقر الزمن

السید مہدی حسن غفرلہ خادم دار الافتاء الواقعہ

بدار العلوم دیوبند۔ ۳/۷/۷۵ھ

شیخ العرب والعجم رأس الاتقیا مجاہد ملت

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ

سابق شیخ الحدیث دار العلوم، دیوبند۔

حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحب کی تحریر سے میں حرف بحرف موافقت کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا محمد سرفراز خاں صاحب موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

مدرس دار العلوم، دیوبند

رئیس المحققین قامع البدعت محی السنۃ شیخ الحدیث

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دامت برکاتہم (میئو اعظم گڈھ یوپی)

میئو

۱۲ ذیقعدہ ۷۴ھ

فاضل محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

آپ کا قیمتی ہدیہ (احسن الکلام) مجھے بروقت مل گیا تھا۔ اس عنایت کے لیے میں

آپ کا تہ دل سے شکر گذار ہوں۔ اپنی بے اطمینانی کی وجہ سے میں اب تک آپ کی کتاب پوری نہیں پڑھ سکا پھر بھی متعدد مقامات سے کئی کئی ورق پڑھے، آپ کی محنت وجانکاہی پر دل سے دعا نکلی۔ میں نے آپ کی کتاب کو اس لحاظ سے بہت زیادہ پسند کیا کہ آپ نے انہیں اصول کو سامنے رکھ کر جوابات دیے ہیں جن اصول کی بنا پر معترضین نے اعتراضات کیے ہیں۔ بالخصوص آپ نے تحقیق الکلام کی طرف جو خصوصی توجہ فرمائی اس کے لیے آپ خاص طور پر مستحق مبارکباد ہیں۔ اس لیے کہ ہماری جماعت کے تساہل و تغافل کی وجہ سے اس کو لاجواب سمجھا جا رہا تھا۔ حق تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

چونکہ یہ کتاب مقابلہ پر لکھی گئی ہے اور فریقِ مخالف صرف نکتہ چینی ہی کے خیال سے اس کو دیکھے گا، اس لیے مخالف کی نگاہ پڑنے سے پیشتر بعض ایسی باتیں جو میرے خیال میں صحیح نہیں معلوم ہوتیں۔ ان کی نشاندہی کرتا ہوں۔ آپ بھی غور فرمالیں۔ اگر آپ کو بھی مجھ سے اتفاق ہو تو فبہا ورنہ جانے دیجیے۔

چونکہ میں نے مسلسل پوری کتاب نہیں پڑھی اس لیے کیف ما اتفق جہاں جہاں جو بات مجھے کھٹکی ہے اس کو میں نے نوٹ کر لیا ہے۔

حبیب الرحمٰن الاعظمی

نوٹ: حضرت نے تین صفحات پر مشتمل تحریر میں متعدد اغلاط کی نشاندہی کی تھی جن کی اب بحمد اللہ تعالیٰ تصحیح کر لی گئی ہے۔ صفدر

حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

سابق مفتی اعظم جامعہ رشیدیہ منٹگمری تلمیذ و مرید حضرۃ شیخ الہند

بخدمت جناب مولانا مولوی محمد سرفراز خاں صاحب بارک اللہ تعالیٰ فی عمرہٖ وعلمہٖ وعملہٖ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امابعد گذارش کہ احسن الکلام، تبرید النواظر، گلدستۂ توحید، دل کا سرور میں نے پڑھوا کر سنی ہیں۔ ماشاء اللہ تعالیٰ آپ بہت وسیع النظر ہیں اور ذہین۔ حافظہ و فہم بہت پایا ہے، مگر معلوم نہیں یہ سب کتب جن کے حوالے آپ

نے دیے ہیں۔ کیا یہ سب آپ کے پاس موجود ہیں؟ جب میری بینائی تھی تو آثار السنن وجامع الآثار نیموی وایضاح الادلہ وہدایت المعتدی۔ والفرقان دیوبندی۔ وانوار نعمانیہ وستۃ ضروریہ فیض پوری کا مطالعہ کیا تھا۔ مگر تحقیق الکلام کا جواب مصنفؒ مرحوم کی زندگی میں کسی نے نہ لکھا۔ البتہ ابکار المنن کا جواب مولانا عبدالرشید ابن نیمویؒ نے لکھا تھا۔ جس کا قلمی نسخہ انھوں نے مجھ کو بھی بھیجا تھا۔ جو جالندھر مولوی خیر محمد صاحب کے مکتبہ میں انقلاب کے وقت وہیں رہ گیا۔ ہمارے مدرسہ کی سب کتب اور مولوی خیر محمد صاحب کے مدرسہ کی کتب انقلاب میں سب ضائع ہوگئیں۔ معلوم ہوا کہ یک مجلسی طلقاتِ ثلاثہ کی بابت آپ کتاب شائع کرنے کو ہیں؟ تیار ہونے پر پتہ کرنا۔ مولوی حبیب الرحمٰن اعظمی مدرس مدرسہ مئو بھنجن ناتھ ضلع اعظم گڈھ نے طلقاتِ ثلاثہ کی بابت دو جلد میں کتاب لکھی ہے۔ جس میں علامہ ابن قیمؒ وغیر مقلدین کے جواب دیے ہیں۔ وہ کتاب بھی وطن میں ضائع ہوگئی۔ شاید آپ کی نظر سے گذری ہے یا نہیں۔ ابکار المنن کا جواب ابن نیموی طبع نہیں کرا سکے۔ غریب ہونے کے سبب قلمی تین نسخے تیار کیے تھے۔ ایک نسخہ مجھ کو بھیجا اور ایک مبارک پوری صاحب کو اور ایک اپنے پاس رکھا۔ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے تھے کہ امام بخاریؒ بڑے ذہین تھے۔ تھوڑا سا ذہن اور ہوتا تو امام ابو حنیفہؒ کے برابر ہو جاتے۔ امام نوویؒ کے متعلق فرماتے تھے کہ ان کا ذہن طویل وعریض تو بہت ہے مگر امام اعظمؒ کے عمیق ذہن تک پہنچ نہیں سکتے۔ فقط آپ کے حوالہ جات بقید صفحات لکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ پیر جھنڈا کے مکتبہ میں لکھ رہے ہیں یا مکتبہ مدرسہ دیوبند میں کیا یہ سب کتب آپ کے پاس ہیں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ والسلام فقط

خادم حبیب اللہ خلف حضرت مفتیؒ

خادم طلبہ جامعہ رشیدیہ۔ ۵ شوال ۱۳۷۴ھ

فقیہہ وقت المحقق المدقق

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

مفتیٔ اعظم پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی۔

مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خاں صاحب صفدر کی محققانہ تازہ تصنیف "احسن الکلام فی ترک القرأۃ خلف الامام" دیکھنے کا موقع ملا جو اپنے موضوع میں بے نظیر کتاب ہے۔ طرز بیان نہایت سلیس ہے اور اس مسئلہ میں غلو و تعدی کرنے والوں کا بہترین جواب ہے۔

مسئلہ قرأۃ فاتحہ خلف الامام ان مسائل میں سے ہے جن میں حضرات صحابہؓ و تابعینؒ کے زمانے سے اختلاف اور بحثیں چلی آتی ہیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں مستقل کتابیں اور رسالے اس موضوع پر لکھے گئے ہیں اور ایسے اجتہادی اختلافات میں تمام اہلِ حق کا مسلک یہی ہوتا ہے کہ ان کے جس پہلو کو وہ راجح سمجھتے ہیں اس کو اختیار کر لیتے ہیں اور دوسری جانب پر طعن و تشنیع اور زبان درازی جائز نہیں سمجھتے۔ علمی بحث و تمحیص کا مقام آتا ہے تو اس میں مناظرانہ بحثیں بھی ملتی ہیں مگر اس نظر سے نہیں کہ ان کا حریف باطل پرست یا گمراہ ہے۔ اور اجتہادی اختلافات کا تمام اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک یہی مقام ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آج کل کی فضا میں جہاں کفر و الحاد کے طوفان نئی نئی شکلوں سے اُٹھ رہے ہیں۔ سرے سے حدیث ہی کو ناقابلِ عمل ٹھہرایا جا رہا ہے۔ قرآن میں طرح طرح کی معنوی تحریفات کے لیے ادارے بنائے جا رہے ہیں، کسی خدا ترس ذی علم کے لیے اس کا کوئی موقع نہ تھا کہ ان پرانی بحثوں کو تازہ کر کے ایک نیا فتنہ قرآن و حدیث کے ماننے والوں اہل السنت میں پیدا کرتا۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ بعض ناعاقبت اندیش کم علم لوگ جو اپنے آپ کو فرقۂ اہلِ حدیث سے منسوب کرتے ہیں اور درحقیقت انصاف پسند اہلحدیث بھی ان کے طرزِ عمل سے متنفر ہیں۔ کفر و الحاد کے دنیا میں پھیلنے سے ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان کی فکریں صرف اس میں مبذول رہتی ہیں کہ حنفی مسلمانوں کو گمراہ، بے نماز بلکہ کافر و مشرک قرار دیں۔ اسی قسم کے بعض لوگوں نے حال میں کچھ رسائل شائع کر کے مسلمانوں

میں انتشار و اختلاف کا دروازہ کھولا تو ہمارے محترم مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خاں صاحب نے ضرورت محسوس فرما کر زمانہ حال کے طرز اور سلیس اُردو زبان میں اس موضوع پر دو جلد میں یہ ضخیم کتاب تصنیف فرما کر مسئلہ کے ہر پہلو کو خوب واضح فرما دیا۔ اس سے پہلے جتنی کتابیں اُردو زبان میں بھی اس مسئلہ کے متعلق نظر سے گذری ہیں اوّل تو ان میں پوری مباحث کے لیے جامع کم ہیں۔ پھر خالص قدیم علمی زبان میں ہیں آجکل عوام کیلئے ان سے استفادہ مشکل ہے اس کتاب میں فاضل مؤلف نے ماشاء اللہ تعالیٰ بڑی خوبی سے تمام جوانب کی رعایت رکھ کر اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ عنا وعن جمیع المسلمین خیر الجزاء وتقبل منہ مسعاہ۔

۲۵ شوال ۱۳۷۴ھ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

علامہ عصر امام المناظرین استاذ العلماء

حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

سابق مہتمم مدرسۂ عربیہ خیر المدارس، ملتان، مغربی پاکستان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

بعد حمد و صلوٰۃ۔ مسئلہ قرأۃ خلف الامام سلف و خلف میں ہمیشہ مختلف فیہا رہا ہے۔ مگر اس کا اختلاف اوّلیت و غیر اوّلیت تک محدود رہا۔ مثبتین حضرات نے تارکین قرأۃ پر بطلان صلوٰۃ کا جارحانہ حربہ کبھی استعمال نہیں فرمایا۔ البتہ ہمارے زمانے کے اکثر غیر معتدل اہل حدیث علماء جمہور سلف و خلف کے خلاف بڑی شد و مد سے اپنی تحریر و تقریر میں اس دلآزار حربہ کو استعمال کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ بایں ضرورت جمہور کی طرف سے بھی اصلاحی طور پر تحقیقی و جوابی رسائل کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہوا جو معاندین کے لیے مسکت اور منصفین کے لیے قانع تھا۔ مگر بعض رسائل میں جزوی مباحث پر کلام تھا اور بعض میں قدر ضرورت پر اکتفا تھا۔ اس لیے ہنوز ضرورت تھی کہ اس مسئلہ میں ایسی جامع اور مسکت کتاب شائع ہو جو تمام مباحث پر حاوی ہو۔ سو بحمد اللہ تعالیٰ فاضل نوجوان حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صاحب سرحدی خطیب جامع مسجد گکھڑ منڈی ضلع

گوجرانوالہ نے کتاب احسن الکلام فی ترک القرآۃ خلف الامام ہر دو جلد تصنیف فرما کر احسن طریق سے اس ضرورت کو پورا فرما دیا۔

امام شافعیؒ کے مذہب کی تحقیق انیق اور رواۃ احادیث کے تراجم و وفیات اور ہر ہر مبحث پر محققانہ و منصفانہ تفصیلی دلائل و براہین اس کتاب کی خصوصیات ہیں مجھے سفر و علالت کے دوران میں صرف جلد اوّل کے مطالعہ کا حرفاً حرفاً موقع مل سکا۔ بفضلہ تعالیٰ اس مسئلہ کے متعلق فریقین کے بہت سے رسائل دیکھنے کا موقع مجھے بھی میسر آیا ہے اس لیے بلا تکلف عارض ہوں کہ میرے نزدیک یہ کتاب اس مسئلہ کے تمام مباحث پر حاوی اور جامع ہے۔ کوئی مبحث اس میں تشنہ نہیں چھوڑا گیا۔ فریقین کے لیے اس کا مطالعہ نافع ہوگا۔ خصوصاً حنفی المذہب علماء و طلباء کو خود زیر مطالعہ رکھنا اور اس سے استفادہ کرنا ضروری ہے اور اس کی اشاعت میں سعی کرنا مذہبی فریضہ کے مرادف ہے۔ حق تعالیٰ اس کتاب کو مفید عام اور نافع تام بنادے۔ اور حضرت مؤلف علام دام فیضہٗ کو جزاء احسن عطا فرماتے ہوئے اس قسم کے دیگر مسائل پر محققانہ رسائل تصنیف فرمانے کی توفیق مزید شامل حال رکھے۔ آمین ثم آمین۔

احقر خیر محمد عفا اللہ عنہ

مہتمم مدرسہ عربیہ خیر المدارس، ملتان ۹ ذیقعدہ ۱۳۷۴ھ

شیخِ کامل رئیس المجاہدین مفسّر قرآنِ کریم

حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ

امیرِ انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ امابعد! میں نے احسن الکلام فی ترک القراءۃ خلف الامام مصنفہ مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خاں صاحب دامت معالیہم کی دونوں جلدوں کو متعدد مقامات سے بغور پڑھا ہے، مولانا ممدوح نے جس محنت اور عرق ریزی سے اپنے مجوزہ موضوع کو دلائل و براہین سے مدلل فرمایا ہے۔ اگر اس عنوان

کے مخالفین انصاف اور تقویٰ سے کام لیں تو انھیں سوائے سکوت اور سر تسلیم کرنے کے اور کوئی چارۂ کار نہ ہو۔ بارگاہِ الٰہی میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور مخالفت کرنے والوں کی ہدایت ذریعہ بنائے۔ آمین یا اللہ العالمین۔

العارض احقر الانام احمد علی عفی عنہ لاہوری ۷ ار شوال ۱۳۷۴ھ

امیر الموحدین سید المناظرین الحافظ الحجۃ

حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب دام فیضہم

سابق مدرس دار العلوم دیوبند و حال شیخ الحدیث گوجرانوالہ

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم۔ اما بعد عرض ہے کہ مجھے محترم دوست مولانا محمد سرفراز خاں صاحب کی کتاب لاجواب احسن الکلام فی ترک القرأۃ خلف الامام کے مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا جس کے بعد میں کتاب موصوف کی مندرجہ ذیل خوبیوں اور خصوصیات پر مطلع ہوا:

۱۔ استیعاب اطراف میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ ۲۔ زورِ استدلال میں بے مثال ہے۔
۳۔ جامعیت مضامین میں بحر محیط ہے و معترضین کے اعتراضات کے جوابات میں دیوار فولادی ہے۔
۴۔ مصنف کے تبحر علمی کا زندہ ثبوت ہے۔

وبارک اللہ فی عمرہ وعلمہ وشانہ وصانہٗ عما شان وحفظہ من آفات الزمان وعصمہ من شر الحاسدین واصحاب العدوان۔

العبد ابو عبید اللہ شمس الدین عفی عنہ ۵ شوال ۱۳۷۴ھ

شیخ طریقت حافظ الحدیث العلامہ حضرت مولانا شیخ القرآن و الحدیث محمد عبد اللہ صاحب

درخواستی دام مجدہم مہتمم مدرسہ عربیہ مخزن العلوم خانپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ وحدہٗ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبیّ بعدہٗ وعلیٰ آلہ وصحبہ وجمیع من اقتفیٰ اثرہٗ۔ اما بعد، فقد رأیت رسالۃ احسن الکلام

من تالیف المولوی محمد سرفراز خان صفدر فرأیته موشحا بدلائل وخالیا عن
الجدل فجزی الله تعالیٰ المؤلف احسن الجزاء وارجو من الله تعالیٰ ان ینتفع به العوام
والخواص وان یترک اهل الجدل الجدل قال النبی صلی الله علیه وسلم ما ضل
قوم بعد هدًی کانوا علیه الا اوتوا الجدل الخ بکی شجرة الاسلام من علمائه فنما
اکترثوا لما رأوا من بکائه۔ فاکثرهم مستحسن لخطائه مستقبح لصواب غیرہٗ۔
فایهم المرجو فینا لدینه وایهم الموثوق فینا برأیه هداة الذین ضلوا وقد بانت
خسارتهم فباعوا الدین بالدنیا فما ربحت تجارتهم۔

حررہ افقر الی الله محمد عبد الله درخواستی

مهتمم مدرسة العربیة مخزن العلوم خانپور

اُستاذ الاساتذہ محقق وقت الفقیہ حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد عبد الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

سابق صدر مدرس مظاہر العلوم سہارنپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ اما بعد۔

احقر نے رسالہ احسن الکلام مؤلفہ مولانا محمد سرفراز خاں صاحب بعض بعض مقامات سے
دیکھا۔ اس مختصر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مؤلف سلمہٗ نے استدلال اور تنقید میں تحقیق اور متانت سے
کام لیا ہے۔ طعن وتشنیع سے (جو آج کل کے بعض حضرات نے اختیار کر رکھا ہے) اجتناب کیا ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ ایسے مسائل مختلف فیہا میں طعن وتشنیع ایک امر قبیح کا ارتکاب ہے۔ اللہ
تعالیٰ مسلمانوں کو اور خصوصاً حضرات علما کو اس سے محفوظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف سلمہٗ کی اس
تالیف کو قبول اور مخلوق خدا کو اس سے مستفید ومستفیض فرمائے۔ اللّٰھم وفقنا لما تحب
وترضیٰ من القول والعمل والھدیٰ انک علیٰ کل شیء قدیر۔

العبد الاحقر

عبد الرحمٰن غفرلہ

از بہبودی ملک مالا کیمبل پور ۶ شوال ۱۳۷۴ھ

شیخ المعقول والمنقول علّامۂ دہر فریدِ عصر حضرت مولانا شیخ القرآن والحدیث محمد سلطان محمود صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اما بعد۔ میں کتاب احسن الکلام کو بالاستیعاب تو نہیں دیکھ سکا لیکن اس کی دونوں جلدوں کے بعض بعض مقاموں کو نہایت غور و تدبّر کے ساتھ پڑھا ہے اور پڑھنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ درج ذیل ہے:

۱۔ مسئلہ فاتحہ خلف الامام میں مؤلف کتاب مولانا محمد سرفراز خاں صاحب کے دو فریضے تھے۔ پہلا فریضہ اپنے دعوے کو دلائل سے واضح کرنا۔ دوسرا فریضہ فریق مخالف کے دلائل کا جواب دینا۔ مؤلف صاحب نے ان دونوں فریضوں کے ادا کرنے میں کمال کر دیا ہے۔ اپنے دعوے کو دلائل عقلیہ و نقلیہ سے روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے۔ فریق مقابل کو ان کے دلائل کے جوابات عقلیہ و نقلیہ کا وہ نظارہ دکھایا ہے جو تادم زیست ان کی نظروں سے غائب ہو ہی نہیں سکے گا۔

۲۔ طرز بیان نہایت ہی سلیس و عام فہم ہے صرف اُردو خواں بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

۳۔ اس مسئلہ کے متعلق بہت سے رسائل لکھے گئے ہیں لیکن احسن الکلام جیسا مفصل و جامع دلائل عقلیہ و نقلیہ میری نظر سے کوئی دوسرا رسالہ نہیں گزرا۔

اب میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی اس خدمت کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

خادم العلماء

سلطان محمود عفی عنہ

ناظم مدرسہ خادم علوم نبوّت اکھٹیالہ شیخاں گجرات

سابق صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی

نمونۂ سلف بقیۃ الخلف حضرت مولانا محمد عبدالحق صاحب دامت فیوضہم

مہتمم مدرسہ حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور

حضرت العلامہ زید مجدکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ وصول پایا۔ حسب الحکم احسن الکلام کے بعض مقامات دیکھے گئے۔ افسوس کہ نہایت عدیم الفرصتی کی وجہ سے مکمل کتاب کا مطالعہ نہ ہو سکا۔ تاہم جستہ جستہ مقامات کو بغور دیکھا گیا۔ بزرگوارم ! ایسی جامع اور مسئلہ کے ہر پہلو پر حاوی کتاب پر تقریظی جملے لکھنا میرے خیال میں سورج کے سامنے چراغ دکھانا ہے لیکن محض تعمیل حکم کی غرض سے چند جملے تحریر کیے جا رہے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اَلْحَمْدُ لِمَنْ تَفَرَّدَ بِالْقِدَمِ۔ فَکُلُّ شَیْءٍ مَا سِوَاہُ مَسْبُوْقٌ بِالْعَدَمِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ مَصَابِیْحِ الظُّلَمِ

امابعد، تمام مشاغل میں افضل و بہترین مشغلہ خلوص نیت کے ساتھ علوم دینیہ اور مسائل شرعیہ کی تحقیق ہے جو افضل العبادات میں محسوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلاف نے اسی کو اپنی زندگی کا اہم نصب العین اور اپنی تمام سرگرمیوں کا محور قرار دیا تھا۔ اور قیمتی عمروں کو اسی مبارک مشغلہ میں فنا کیا ہے۔ بالخصوص ایسے مسائل شرعیہ میں علمی تحقیقات کو امت کے سامنے پیش کرنا جن میں امت کے نقطہائے نظر سلفاً و خلفاً مختلف رہے ہوں۔ علوم دینیہ کی بہترین خدمت اور امت کے ساتھ انتہائی درجہ کی خیر خواہی ہے جو ہر طرح قابل قدر اور لائق ستایش ہے کہ اسی میں امت کے مختلف الخیال حضرات کے خیالات کی ایک حد تک اصلاح اور طالب عمل کے لیے ایک واضح شاہراہ متعین ہو جانے کے قوی امکانات پائے جاتے ہیں۔ مسئلہ قرأت خلف الامام بھی چونکہ ان معرکۃ الآراء مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے۔ جس میں ہر زمانے کے اکابرین ملت نے اپنی تحقیقات پیش کی ہیں۔ اور اس پر طبع آزمائی فرمائی ہے۔ جزاہم اللہ تعالیٰ عنا خیر الجزاء لیکن زیادہ تر ہدف ملامت اس مسئلہ میں علماء احناف ہی کو بنایا جا چکا ہے اور بنایا جا رہا ہے کہ صحیح احادیث کے ہوتے ہوئے بھی علماء احناف قرأۃ خلف الامام پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں۔ اور احادیث نبویہ سے کھلی ہوئی مخالفت کر رہے ہیں

حالانکہ مسئلہ کے تحقیقی اور استدلالی پہلو پر اگر انصاف سے نظر ڈالی جائے تو احناف اس مسئلہ میں نہ اپنی رائے میں متفرد ہیں۔ اور نہ شاہراہ اور جادۂ حق سے ان کے قدم ہٹتے ہیں۔ ضرورت تھی کہ اس اہم موضوع پر ایک ایسی علمی تحقیق پیش کی جائے جو نہ صرف توضیح مسئلہ کے لیے مفید ہو۔ بلکہ اظہار حق فی نفس الباب کے لیے برہان ساطع کی حیثیت بھی رکھتی ہو۔ خدا تعالیٰ جزائے خیر دے۔ مُصنّف احسن الکلام حضرت العلّامہ مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خاں صفدر صاحب کو کہ انہوں نے اس ضرورت کو پورا فرمادیا۔ اور اپنی علمی تحقیقات کو اس مسئلہ کے بارے میں ایک ایسی کتاب کی شکل میں علماء اُمت کے سامنے پیش فرمایا جس کے متعلق یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پچھلی تمام ان کتابوں سے یہ کتاب مستغنی کر دینے والی ہے، جو اس مسئلہ کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ کتاب اپنے حُسنِ ترتیب اور مضامین کی شائستگی اور مکمل تشریح مسئلہ کے علاوہ اور بھی بہت سی خصوصیات کی حامل ہے جن کی وجہ سے کتاب اس قابل ہوگئی ہے کہ اہل انصاف عموماً احناف خصوصاً اس کو اپنے لیے بیش بہا تحفہ اور مبارک ہدیہ سمجھیں۔ سب سے زیادہ قابل ستائش اور لائق تحسین خصوصیت یہ ہے کہ ملّت کے بلند پایہ علماء کرام اور ائمہ عظام کے صحیح اقوال پیش کیے گئے ہیں۔ مدعٰی کے اثبات اور تحقیق انتساب کے لیے مستند نقول سے کام لیا گیا ہے۔ نیز مخالفین حضرات کے اعتراضات کے جوابات ایسے تسلّی بخش طریقہ سے دیے گئے ہیں جو انصاف پسند حضرات کے لیے موجب تسکین ہیں۔ امید کہ اہل علم حضرات اس کتاب سے پورا پورا فائدہ اٹھائینگے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف مدظلہ کی اس سعی و کاوش کو قبول فرمائیں اور اس کار خیر کے بدلہ میں ان کو اجر جزیل عطا فرمائیں۔ آمین یارب العٰلمین۔ وصلّی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمّد وّآلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

عبدالحق عفی عنہ دار العلوم حقّانیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور (سرحد) ۱۱ر شوال ۱۳۷۴ھ

پیر کامل عالم بے مثیل حامی سنت ماحیٔ بدعت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

سابق مہتمم مدرسہ عربیہ سراج العلوم سرگودہا

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ۔ اما بعد! مذہبی دنیا میں منقولات

اور تعامل کو دیکھا جاتا ہے۔ قرأۃ خلف الامام کے بارے میں قرن اوّل سے لے کر آج تک اہل اسلام کا عدم فرضیت پر جمہور کا تعامل رہا ہے۔ ائمہ مجتہدین میں سے امام شافعیؒ سرّی نمازوں میں (وجوب قرأۃ فاتحہ کے دعوے میں) منفرد ہیں۔ اسی واسطے محققین شوافع اس کے قائل نہیں۔ منقولات میں سے جہری (بلکہ جملہ) صلوات میں واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا نصِ قطعی ہے۔ اطلاق الفاظ سے قطع نظر خود شانِ نزول بھی آیت کا بتصریح ائمہ کرامؒ حصہ نماز ہے۔ سرّی نمازوں میں آثار مرفوعہ و موقوفہ کے نیادر سے عدم قرأۃ مقتدی ثابت ہوتی ہے بلکہ بعض آثار میں وعیدیں بھی موجود ہیں۔ مجوزین حضرات کی جانب سے (صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب پیش کی جاتی ہے جو حضرت جابرؓ اور امام احمدؒ اور سفیانؒ جیسے جلیل القدر حضرات منفرد کے حق میں فرمار ہے ہیں۔ باقی جتنی حدیثیں قرأۃ خلف الامام کے متعلق بیان کی جاتی ہیں۔ ان میں بعض صحیح نہیں اور جو صحیح ہیں وہ دلالت علی المقصود پر صریح نہیں۔ بایں ہمہ احناف کی طرف سے جب کبھی اس مسئلہ پر کچھ لکھا گیا ان کی اس میں دفاعی حیثیت ہے۔ اقدام ہمیشہ مجوزین حضرات سے ہوتا رہا وہ بھی اس طعن کیساتھ کہ احناف کی نماز مردود اور باطل ہے وغیرہ وغیرہ۔ بقول مرتا کیا نہ کرتا۔ مجبوراً کچھ نہ کچھ لکھنا پڑا۔ حضرت محقق مولانا محمد سرفراز خاں صفدر زید علمہ نے اس بارے میں ایک مبسوط کتاب احسن الکلام لکھی ہے۔ اس میں بلا مبالغہ محقق مصنف نے بغیر تعصب کے سیر حاصل بحثیں فرمائی ہیں اور اس مسئلہ کے مالہ وما علیہ پر کلام مشبع فرمائی ہے؛ ع

آخر آمد بود فخر الاوّلین!

شاید اس کے بعد کسی راد اور مردود کو قلم اٹھانے کا موقع بھی نہ ملے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کے صالحات باقیات میں اس تصنیف لطیف سے اضافہ فرمادے اور عامۃ المسلمین کو متمتع فرمادے آمین ثم آمین۔

احقر ابو سعید محمد شفیع عفی عنہ سرگودہا۔

اسوۂ صالحین شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد نصیر الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ غورغشتی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ میں نے کتاب احسن الکلام کی دونوں جلدوں کا مطالعہ کیا نہایت عمدہ اور مفید کتاب ہے اہل اسلام کو مناسب ہے کہ اس کا

مطالعہ کریں خصوصاً احناف کو (اور ان احناف کو تو علی الخصوص) اس کا مطالعہ ضروری ہے جو کہ اپنے مذہب کے معتبرات سے ناواقف ہیں۔ وصلی اللہ علی رسولہ وخیر خلقہ محمد وعلی آلہ واصحابہ وجمیع امتہ اجمعین۔

مسکین نصیر الدین غورغشوی

اُستاذ العلماء رأس المحققین

حضرت مولانا محمد شمس الحق صاحب افغانی دامت برکاتہم

ترنگ زئی ضلع پشاور

سابق وزیر معارف شرعیہ ریاست ہائے متحدہ بلوچستان۔ شیخ التفسیر دار العلوم دیوبند وشیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، حالاً شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاول پور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد! احسن الکلام فی ترک القرأت خلف الامام تصنیف مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خاں صفدر کو میں نے بغور ملاحظہ کیا۔ اس مسئلہ پر قبل ازیں نفیاً واثباتاً کافی رسائل واجزاء لکھے گئے ہیں لیکن ان سب میں زیر تبصرہ کتاب کی شان نرالی ہے۔ مصنف علام کو حفاظتِ اصول وفروع دین ورد غلو غالین وتحریفات مبتدعین میں ایک ممتاز ملکہ حاصل ہے۔ شکر اللہ تعالیٰ مساعیہ احسن الکلام کے دو حصے ہیں اور بنیادی اجزاء آٹھ ہیں۔ پہلے حصہ میں مذہب حنفی یعنی ممنوعیت فاتحہ خلف الامام کو کتاب اللہ واحادیث رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وآثار صحابہ وتابعین وتبع تابعین اور ادلہ عقلیہ قیاسیہ واجتہادیہ سے ثابت کیا گیا ہے۔ یہ اس حصے کے بنیادی چار اجزاء ہیں۔ دوسرے حصہ میں مخالفین کی دعویٰ رکنیت فاتحہ کے دلائل قرآنیہ، حدیثیہ، اثریہ اور عقلیہ کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ دوسرے حصے کے بنیادی چار اجزاء ہیں۔ گویا پہلے حصے میں مذہب حنفیہ کے مثبت پہلو کا بیان ہے اور دوسرے

حقّے میں منفی پہلو کا۔

بہرحال یہ کتاب بلحاظ کثرتِ موادّ، سلاست بیان و ضبطِ دلائل و ردِّ اشکالات مخالفین اور جامعیت جمیع ابحاث متعلقہ بالموضوع کے لحاظ سے اپنی شان میں بے نظیر ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنّف علام کی اس خدمت کو قبول فرمائیں اور مسلمانوں کو اس کتاب سے نفع اٹھانے کی توفیق بخشے۔ آمین

شمس الحق افغانی عفا اللہ عنہ
جامعہ اسلامیہ بہاولپور

۲۵ محرم ۱۳۶۶ھ
۱۷ مئی ۱۹۶۶ء

محقق جلیل فاضل لبیب حضرت العلامہ مولانا محمد عبد الرشید صاحب نعمانی دامت فیوضہم

باسمہ سبحانہ وبحمدہ امابعد

بگرامی خدمت مخدوم ومکرم حضرت مولانا صفدر صاحب متع اللہ تعالیٰ المسلمین بفیوضہم وبرکاتہم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

بفضلہ تعالیٰ آپ کی گراں قدر تصنیف منیف احسن الکلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا گو مطالعہ سرسری تھا قیلولہ کے وقت تاہم مستفید ہوا۔ دل سے دعا نکلی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی مشکور فرمائے۔ آپ نے بحث کا خوب احاطہ کیا۔ بڑی اچھی کتاب لکھی۔ تحقیق الکلام کے جواب کا قرض جو حنفیوں کے ذمّے چلا آتا تھا مع شے زائد ادا کر دیا۔ جزاک اللہ تعالیٰ عنّا وعن سائر المسلمین خیرًا۔ گو بعض جگہ بحث کا رنگ غیر مقلدوں (نام نہاد اہلحدیث) کی طرح متعنتانہ ہو گیا، مگر اس سلسلہ میں غالباً آپ کا عذر یہ ہو گا کہ خصم نے اس طرز پر مجبور کیا کہ قدیم زمانے سے خصم نے ظلم کا یہی طریق اپنا رکھا ہے۔ والبادی اظلم۔ والسلام

خاکسار نعمانی از کراچی

۲۹ شعبان ۱۳۹۵ھ

نوٹ: حضرت العلام نے چند غلطیوں کی نشاندہی فرمائی جن کی اب اصلاح کر لی گئی ہے۔ (صفدر)

حضرت العلام فقیہ جلیل مولانا مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم

مہتمم اشرف المدارس ناظم آباد، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ احسن الکلام کی تحقیق عمیق اور جامعیت دیکھ کر بہت مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس محنت کو قبول فرمائیں۔ فقط والسلام

رشید احمد

از اشرف المدارس ناظم آباد، کراچی

۱۳ر رمضان ۱۳۹۸ھ

نوٹ: حضرت مفتی صاحب نے بھی چند اغلاط کی اصلاح کا مشورہ دیا۔ جن کی اس طبع میں اصلاح کر دی گئی ہے۔ (صفدر)

دیباچہ طبع سوم

مُبسمِلاً وَّ مُحمدِلاً وَّ مُصلِیاً

امابعد راقم اثیم اللہ تعالیٰ کے بے حد و لاشمار انعامات و احسانات کا شکریہ کس زبان سے ادا کرے کہ اُس نے محض اپنے فضل و کرم سے اس گنہگار کو جہاں اور حسّی اور معنوی انعامات سے نوازا وہاں دین کی خدمت اور تالیفِ کتب کا زرّین موقع بھی مرحمت فرمایا اور بفضلہٖ تعالیٰ راقم اثیم کی ہر ہر کتاب اپنی اپنی جگہ مفید ثابت ہوئی۔ فللہ تعالیٰ الحمد زیرِ نظر کتاب احسن الکلام کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی سے جو شہرت اور قبولیت حاصل ہوئی۔ وہ پاک و ہند کے جیّد اور نامی گرامی علماء کرام کی عمدہ آرا اور بلند پایہ تصدیقات سے بالکل عیاں ہے اور ان حضرات میں سے بعض وہ بزرگ ہستیاں ہیں کہ علمی اور تحقیقی طور پر وہ بین الاقوامی شہرت و حیثیت رکھتی ہیں اور ان کے علم پر عوام تو کیا بلکہ خواص اور مزید براں خواص الخواص کو بھی کلی اعتماد ہے۔ اس دیباچہ میں ہم نہایت ہی اختصار کے ساتھ چند ضروری باتیں عرض کرتے ہیں۔

۱۔ طبع دوم کے دیباچہ میں ہم نے یہ گذارش کی تھی کہ جو حضرات (ان کا نقطۂ نظر خواہ کچھ ہی ہو) ہماری کوتاہیوں پر ہمیں آگاہ کریں گے تو ہم ان کا شکریہ ادا کریں گے۔ الحمد للہ تعالیٰ کہ ہماری یہ آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی۔ بلکہ خاصی مفید رہی ہے۔ چنانچہ فاضلِ جلیل محقق العصر حضرت العلامہ مولانا محمد عبد الرشید صاحب نعمانی دامت برکاتہم اور عالم نحریر نمونۂ سلف فقیہ دوراں

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب دامت فیوضہم کراچی نے بعض اغلاط کی نشاندہی کی جن کی اب تصحیح کر دی گئی ہے اور ہم ان حضرات کے ممنون احسان ہیں۔ اسی طرح ہمارے کرم فرما معترض صاحب نے ترجمان الحدیث میں ایک راوی کی تعیین کے بارے میں غلطی بتائی ہے۔ ہم نے اس کی بھی اصلاح کر دی ہے اور وہ بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں بایں ہمہ اب بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ طبع ہٰذا اغلاط سے بالکل مبرّا ہے۔ بھلا انسان کا کام اور وہ بھی راقم اثیم جیسے بے بضاعت اور پُر تقصیر کا کام غلطی سے کیونکر محفوظ رہ سکتا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ ؎

تم تو پھولوں کے طلب گار نظر آتے ہو

میرے دامن میں تو کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں

مگر اب بھی ہم شرح صدر کے ساتھ کہتے ہیں کہ معقول اغلاط کی نشاندہی پر ہم ہر وقت شکر گزاری کے لیے تیار ہیں۔

۳۔ احسن الکلام کے معرض وجود میں آنے کی وجہ سبب تالیف میں باحوالہ مفصل مذکور ہے کہ فریق ثانی امام کے پیچھے مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا فرض قرار دیتا ہے اور نہ پڑھنے والوں کی نماز کو ناقص کالعدم، بیکار اور باطل قرار دیتا ہے۔ اور حنفیوں کو بے نماز اور مفسدین صلوٰۃ کے خطاب سے نوازتا ہے اور حتیٰ کہ احناف کی عورتوں سے بلا اطلاق غیر مقلدوں کا نکاح جائز قرار دیتا ہے اور امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے والوں کو کافر اور مخلّد فی النّار تک ناروا فتووں سے رگیدتا ہے۔ اور ظاہر امر ہے کہ فرضیت قطعی دلیل کے بغیر تو ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی اور اہل علم جانتے ہیں کہ قطعی دلیل نص قرآنی، خبر متواتر اور اجماع ہی ہے ان کے علاوہ اور کوئی دلیل قطعی نہیں مگر یقین جانیے کہ فریق مخالف اپنے اس باطل اور بے بنیاد دعوے پر ایک بھی حوالہ اور دلیل نہیں پیش کر سکا اور نہ تا قیامت پیش کر سکتا ہے اور جو غیر متعلق اور بے جان دلائل انھوں نے پیش کیے ہیں ان کا حال احسن الکلام سے بفضلہ تعالیٰ بخوبی واضح ہو چکا ہے اور کتاب کو پڑھنے والا ہر منصف مزاج اس کو سمجھ سکتا ہے۔

۴۔ ترجمان الحدیث میں عین اس دور میں جبکہ تحریک ختم نبوت اپنے عروج پر تھی مسلمان تو کیا حتیٰ کہ خود کو مسلمان کہلانے والے طبقے بھی مرزائیوں کو کافر قرار دینے کے سلسلے میں

قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے اور ہمارے کرم فرما ترجمان الحدیث میں قسط وار احسن الکلام پر برسنے میں اور اس میں کیڑے نکالنے میں مصروف تھے اور تحریک ختم نبوت کے قائد اور روح رواں حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوریؒ المتوفی ۱۳۹۷ھ کو ان کے استاذ محترم کی کتاب "نیل الفرقدین" ص ۷۰ کے ایک حوالہ کے پیش نظر بلا وجہ ان الفاظ سے خطاب کیا جا رہا تھا کہ کیا حضرت (مولانا سید محمد انور شاہ صاحب) کاشمیریؒ اور ان کے تلامذہ بالخصوص حضرت بنوری یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اہل مدینہ کا مسلک ترکِ رفع الیدین تھا؟ بلفظہٖ (ترجمان الحدیث بابت ماہ نومبر ۱۹۷۴ء، ص ۳۷)۔ ہر سمجھدار آدمی بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ایک خالص اسلامی اور مذہبی تحریک کے قائد کو تحریک کے دور میں ان کے استاذ محترم کا حوالہ نکال کر کوسنا اور مطعون کرنا اور وہ بھی محض ایک فرعی مسئلہ میں کیا معنی رکھتا ہے؟ لیکن اس متعصبانہ کارروائی سے اُن کی شخصیت اور عظمت میں کیا فرق پڑا؟ آخر انھیں کی مبارک قیادت میں یہ مشکل ترین مسئلہ حل ہوا اور قانونی طور پر مرزائیوں کے ہر دو فرقے (قادیانی اور لاہوری) کافر قرار دیے گئے۔ ولنعم ماقیل ؎

جنھیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

۴۔ جمہور اہلِ اسلام اور ان میں سے علی الخصوص احناف کثر اللہ تعالیٰ جماعتہم اس مسئلہ کو اختلافی مسئلہ سمجھتے ہیں اور صرف یہ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ سمیت کسی بھی قسم کی قرأت ممنوع اور مکروہ ہے۔ نہ تو وہ اس مسئلہ میں کسی کی تکفیر کرتے ہیں اور نہ کسی کی منکوحہ بیوی چھیننے کا فتویٰ دیتے ہیں اور نہ کسی کو اس مسئلہ کی وجہ سے فی النار والسقر تک پہنچاتے ہیں مگر فریق ثانی کو لفظ مکروہ بھی خاصا چبھتا ہے۔ چنانچہ ترجمان الحدیث ص ۱۸ بابت ماہ جولائی ۱۹۷۳ء میں مشہور مؤرخ اسلام اور حنفی عالم کا شکوہ ان الفاظ سے کیا گیا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی سے سبھی اہل علم واقف ہیں کسی دور میں ان کا مشہور قول تھا کہ آدمی عیسائی ہو سکتا ہے، غیر مقلد نہیں ہو سکتا یہ بزرگ فاتحہ خلف الامام کو مکروہ خیال کرتے تھے...... الخ بقول ناقل حضرت مولانا شبلی مرحوم کا مشہور قول آخر بلا وجہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یقیناً اس کی تہ میں کچھ ہوگا اور انھوں نے ضرور کچھ محسوس کیا ہوگا۔ نیز اگر واقعی احناف کی نماز کالعدم، بے کار اور باطل ہے اور وہ بھی محض اس لیے کہ وہ امام کے پیچھے سورۂ

فاتحہ نہیں پڑھتے او نہ اس کے قائل ہیں۔ اور مبتدی طالب علم بھی یہ جانتے ہیں کہ جو حکم امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھنے کا ہے وہی حکم نہ پڑھنے کا حکم دینے کا ہے اور ہر محقق حنفی یہی کچھ کہتا ہے تو غیر مقلدین حضرات اپنے شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین صاحبؒ (المتوفی ۱۳۲۰ھ) کی زندگی بھر کی جمعہ کی نمازوں کے بارے میں کیا فتویٰ صادر فرماتے ہیں کہ آیا ان کی نمازیں ادا ہوئیں یا نہیں؟ کیونکہ لکھنے والوں نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ "بلکہ مدت العمر شاہی مسجد (دہلی) کے حنفی امام کے پیچھے نماز جمعہ ادا فرماتے رہے۔" (مقدمہ معیار الحق صہ) اس سے یہ بات بالکل روشن اور عیاں ہو گئی کہ غیر مقلدین حضرات کے شیخ الکل نہ صرف یہ کہ حنفی امام کو مسلمان سمجھتے بلکہ ان کو اپنے سے بہتر قرار دے کر مدت العمر ان کی اقتدا میں جمعہ کی نماز ادا کرتے رہے۔ لہٰذا غیر مقلدین حضرات کو اس ناروا غلو اور بے بنیاد دعوے سے فوراً رجوع کر لینا چاہیے کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قرأت نہ کرنے والے اور اسی طرح اس کو ضروری نہ قرار دینے والے مسلمان نہیں یا کم از کم بہتر مسلمان نہیں یا بے نماز اور مفسدین صلوٰۃ ہیں کیونکہ اس باطل نظریہ سے احناف کا تو کچھ نہیں بگڑتا۔ البتہ خود ان کے اکابر اس کی زد میں آتے ہیں اور اس باطل دعوے سے خود ان کے بزرگوں کا دامنِ علم و تقویٰ مطعون و مجروح ہوتا ہے۔ غور کرنا خود ان کا کام ہے: ؎

اگر کچھ کم ہے جو کچھ ہو چکا بیدار کرنے کو
تو کل افسانۂ عبرت کے عنواں اور بھی ہوں گے

۵۔ ترجمان الحدیث میں کئی قسطوں میں احسن الکلام پر اکثر وہی اعتراضات قدرے تشریح کے ساتھ بد مزہ سے بد مزہ کر کے پیش کیے گئے ہیں جن کے اصولی طور پر مدلل جوابات باحوالہ احسن الکلام میں مذکور ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت قتادہؒ مدلس ہیں۔ حضرت ابو اسحاقؒ مختلط اور مدلس ہیں۔ محدث ابو الزبیرؒ مدلس ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ ضعیف ہیں۔ محمد بن اسحاقؒ اور نافعؒ اور علاء بن عبد الرحمٰنؒ ثقہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں یہ کہ فلاں راوی کے بارے میں احسن الکلام میں تضعیف یا توثیق کا فلاں جملہ نقل نہیں کیا گیا۔ اور فلاں عبارت کا معنیٰ غلط کیا ہے اور فلاں موقوف حدیث کو مرفوع بنا دیا ہے اور فلاں حوالے میں کتر بیونت کی ہے اور فلاں عبارت کا صحیح مطلب مؤلف احسن الکلام اپنی جہالت

کی وجہ سے نہیں سمجھ سکا اور فلاں جگہ دجل و تلبیس سے کام لیا ہے اور فلاں عبارت کو سیاق و سباق سے الگ کر کے مطلب لیا ہے اور فلاں مقام پر راوی کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن اسی راوی کو متابعت اور شاہد میں پیش کر کے اس سے احتجاج کیا ہے اور ہمارے فلاں ثقہ راوی کو ضعیف کہہ دیا ہے اور فلاں راوی کو اپنے ہاتھ کے کرتب سے ثقہ کر دکھایا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن بحمد اللہ تعالیٰ اہل علم اور سمجھدار حضرات احسن الکلام کے مضبوط اور ٹھوس دلائل اور روشن حوالوں اور اس کی عمدہ ترتیب اور سلاست سے بخوبی واقف ہیں اور ان تمام رکیک شبہات کا رد اس میں مذکور ہے۔ ہمیں مزید کچھ کہنے اور لکھنے کی مطلقاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ محض کیڑے نکالنے اور اعتراضات کرنے سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ پنڈت دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش کے چودھویں باب میں بسم اللہ سے لے کر والناس تک قرآن کریم پر اعتراضات کیے ہیں۔ (معاذ اللہ تعالیٰ) لیکن اس سے کلام اللہ تعالیٰ کی صداقت و عظمت پر کیا زد پڑی یا پڑ سکتی ہے؟ منکرین حدیث مجموعی طور پر کتب حدیث پر برستے رہتے ہیں مگر اس سے دینی کتب کے اس عظیم ذخیرہ میں کیا کمی اور نقص پیدا ہو سکتا ہے؟ خود غیر مقلد حضرات فقہ حنفی کی مشہور اور متداول کتابوں پر اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔ ان کی کتاب حقیقۃ الفقہ اور نتائج التقلید وغیرہ میں اس امر کا واضح اور وافر ثبوت موجود ہے۔ اور فتاویٰ عالمگیری پر ان کی طرف سے جو اعتراضات کیے گئے ہیں وہ تو قریب کے حلقوں میں پان فروشوں اور انڈے فروشوں تک پہنچ چکے ہیں لیکن اس سے ان کو بجز اپنے دل ماؤف کی بھڑاس نکالنے کے اور کیا فائدہ؟ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ تمام کتابیں بھی موجود ہیں اور ان میں مذکور ہزارہا مسائل بھی موجود ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق برابر فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اسی طرح اگر بعض مہربانوں کی طرف سے احسن الکلام پر بھی کچھ لایعنی سوالات ہوئے ہیں یا ہوتے ہیں تو اس سے اس کے صحیح دعاوی اور قوی دلائل اور محکم براہین میں کیا فرق پڑتا ہے۔ اہل خرد جانتے ہیں کہ نری لفاظی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ؎

الفاظ کے پیچوں میں اُلجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

۱۔ ہماری دانست میں ترجمان الحدیث میں احسن الکلام پر کیے گئے جملہ اعتراضات میں

صرف دو باتیں علمی طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ ممکن ہے بعض اہلِ علم کو ان سے مغالطہ پیدا ہو۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہاں نقل کر کے قدرے تفصیل سے ان کے جوابات عرض کر دیے جائیں تاکہ کسی کو غلط فہمی پیدا نہ ہو اور صحیح بات بھی سامنے آجائے۔

اوّل ہم نے احسن الکلام میں اسرائیلؒ عن ابی اسحاقؒ کی ایک سند سے استدلال کیا تھا۔ اس پہ گرفت کرتے ہوئے ترجمان الحدیث ماہ جون ۱۹۷۴ء میں صفحہ ۲۷ تا ۲۸ اس مشہور محدث اور صحیحین کے مرکزی راوی امام ابو اسحٰقؒ کے اختلاط اور ان کی تدلیس پر خاصی لاحاصل بحث کی ہے جس کی چند اہم اور مرکزی باتیں یہ ہیں:

(۱) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ بخاری میں ان سے بجز ان کے اصحاب قدماء کے اور کوئی روایت میں نے نہیں دیکھی۔ (ہدی الساری جلد ۲ ص ۱۹۹)

(۲) ابو اسحاقؒ مدلس تھے اور ان کا عنعنہ صحت حدیث کے منافی ہے اور آخر عمر میں اختلاط اور تغیر کے عارضہ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ (ترجمان مذکور ص ۲۸)

(۳) زہیرؒ کی روایت عن ابی اسحاقؒ امام بخاریؒ اور محدث مبارکپوریؒ کے نزدیک صحیح ہے۔ کیونکہ امام ابوداؤدؒ زہیرؒ عن ابی اسحاقؒ کو اسرائیلؒ عن ابی اسحٰقؒ سے بدرجہا بہتر قرار دیتے ہیں اور بقول امام احمدؒ اسرائیلؒ نے ابو اسحاقؒ سے اختلاط کے بعد بھی سنا ہے۔ (ص ۲۷) لہٰذا ان کو اُن پر کوئی مزیت حاصل نہیں ہے۔

الجواب: یہ جو کچھ کہا گیا ہے دفع الوقتی کے سوا کچھ نہیں ترتیب وار جوابات ملاحظہ کیجیے:

(۱) خود حافظ ابن حجرؒ ہی امام ابو زرعہؒ امام ابو حاتمؒ اور امام احمدؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ زہیرؒ نے ابو اسحاقؒ سے آخر عمر میں ابو اسحاقؒ کے مختلط ہونے کے بعد سماعت کی ہے۔ (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۵۲)

اور زہیرؒ کی ابو اسحٰقؒ سے بخاری ج ۱ ص ۷، ۲ و ج ۱ ص ۱۳۹ و ج ۱ ص ۲۲۷ وغیرہ میں روایتیں موجود ہیں اور حافظ ابن حجرؒ زکریا بن ابی زائدہؒ کے بارے میں امام احمدؒ اور محدث عجلیؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے ابو اسحاقؒ سے آخر عمر میں سماعت کی ہے۔

(دیکھیے تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۳۰)

اور زکریاؒ بن ابی زائدہؒ کی ابو اسحاقؒ سے روایت بخاری ج ۱ ص ۲۲۴ وغیرہ میں موجود ہے۔

اور خود معترض مذکور امام ابوداؤد رح کی تحقیق کے پیش نظر اسرائیل رح کی ابواسحاق رح سے روایت ان کے اختلاط کے بعد بھی تسلیم کرتے ہیں اور بخاری ج ۱ ص ۵۶ ۲ و ۵۰۵ و ۵۱۲ وغیرہ میں اسرائیل رح عن ابی اسحاق رح کی سند سے کئی روایات موجود ہیں پھر یہ کیسے تسلیم کیا جائے کہ بخاری میں ابواسحٰق رح کے ان قدیم شاگردوں کی روایات ہی مذکور ہیں جنھوں نے ان سے اختلاط سے قبل سماعت کی ہے۔ بس یہی کہا جاتے گا کہ ابواسحٰق رح ایسے مختلط ہوئے ہی نہیں کہ ثقاہت سے گر جائیں اور اسرائیل رح کی روایت ابواسحاق رح سے اثبت اور ارجح ہے۔ ہاں بعض کے نزدیک اگر آخر عمر میں ان کے حافظہ میں کچھ تغیر ہوا ہے تو اس دور میں زہیر رح نے ان سے سماعت کی ہے۔

(۲) اگرچہ امام بخاری رح اور مبارک پوری صاحب رح کے نزدیک زہیر عن ابی اسحٰق رح کی روایت راجح ہے مگر امام ابوزرعہ رح، امام ابوحاتم رح، امام احمد رح اور امام ترمذی رح وغیرہم حضرات کی تحقیق کے لحاظ سے زہیر کی ابواسحاق رح سے روایت کمزور ہے اور ابوداؤد رح کے علاوہ باقی تقریباً تمام حضرات اسرائیل رح عن ابی اسحاق رح کو اصح اور ارجح قرار دیتے ہیں اور اس کے متعلق احسن الکلام میں واضح حوالے موجود ہیں وہیں ملاحظہ کرلیں۔ یہاں ان کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

(۳) اسرائیل رح کے بارے میں امام احمد رح کی یہ رائے کہ انھوں نے ابواسحاق رح سے آخر عمر میں سماعت کی منفرد رائے ہے اور باقی حضرات اسرائیل رح عن ابی اسحاق رح کو اثبت کہتے ہیں لہٰذا جمہور کے نزدیک اسرائیل عن ابی اسحٰق رح کی سند بلاشبہ صحیح اور راجح ہے۔

دوم۔ احسن الکلام میں ابوالزبیر رح عن جابر رض کی ایک سند سے احتجاج کیا گیا تھا اس پر کلام کرتے ہوئے ترجمان الحدیث ماہ فروری ۱۹۷۴ء ص ۷ تا ۹ و ماہ مارچ ۱۹۷۴ء ص ۳۸ تا ۴۸ میں مشہور محدث ابوالزبیر رح (محمد بن مسلم رح بن تدرس رح) کے عنعنہ پر طویل اور ناکام بحث کی ہے جس کے مرکزی نکات یہ ہیں:

(۱) ابوالزبیر مدلس تھے اور محدثین کرام رح کی خاصی جماعت نے ان کے مدلس ہونے کا ذکر کیا ہے اور بعض محدثین رح کے حوالے بھی انھوں نے ذکر کیے ہیں۔

(۲) ابوالزبیر رح کی لیث رح کے طریق اور سند سے عنعنہ والی روایت تو صحیح اور قابل قبول ہے مگر اس کے علاوہ ابوالزبیر رح کی کوئی روایت جو عنعنہ سے ہو قابل قبول نہیں ہے اس پر

بھی چند حوالے انھوں نے نقل کیے ہیں۔

(۴) ابو الزبیرؒ کی جن روایات میں تحدیث ہے وہ تو قابل قبول ہیں اور جن روایات میں ان کا عنعنہ ہے اور وہ لیثؒ کے طریق سے بھی نہیں تو چونکہ دیگر حضرات صحابہ کرام رضؓ سے بھی وہ روایات مروی ہیں۔ بنا بریں اگر ابو الزبیر رحؒ کے سماع کی تصریح ان مخصوص الفاظ سے نہ بھی ملے تب بھی صحت حدیث پر کوئی حرف نہیں آتا۔ (محصلہ)

الجواب۔ معترض صاحب نے یہ جو کچھ بھی کہا ہے ان کو سود مند نہیں ہے۔

اوّل تو اس لیے کہ بلا شبہ ابو الزبیرؒ کا نام مدلسین کی فہرست میں موجود ہے۔ اس کا کسی کو انکار نہیں جتنے حوالے اس سلسلہ میں معترض صاحب نے نقل کیے ہیں اگر ہم چاہیں تو بحمد اللہ تعالیٰ ان سے دو گنے حوالے مزید نقل کر سکتے ہیں لیکن ابو الزبیر رحؒ اُن مدلسین میں شامل ہیں جن کی تدلیس مضر نہیں اور احسن الکلام میں توجیہ النظر کے حوالہ سے اس کی بحث موجود ہے جس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ علامہ جزائریؒ نے حافظ ابن حزمؒ کے حوالہ سے مدلسین کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ پہلی قسم ان مدلسین کی ہے جو حافظ و عادل ہوں اور ان کے بارے میں وہ تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

وسواء قال اخبرنا فلان او قال عن فلان او قال فلان عن فلان کل ذلك واجب قبولہ مالم یتیقن انہ اورد حدیثاً بعینہ ایراداً غیر مسند فان ایقنا ذلك ترکنا ذلك الحدیث وحدہ فقط و اخذنا سائر روایاتہ .... وھذا النوع منھم کان جلة اصحاب الحدیث وائمة المسلمین کالحسن البصری وابی اسحاق السبیعی وقتادہ بن دعامة وعمرو بن دینار وسلیمٰن الاعمش وابی

اور برابر ہے کہ وہ مدلس اخبرنا فلاں کہے یا عن فلاں کہے یا قال فلاں عن فلاں کہے ان سب صورتوں میں اس کی روایت واجب القبول ہے جب تک کہ یہ یقین نہ کر لیا جائے کہ اس نے کوئی حدیث غیر مسند پیش کی ہے اور جب ہمیں اس کا یقین ہو جائے کہ اس نے فلاں حدیث مسند بیان نہیں کی تو ہم صرف وہی روایت اس کی ترک کریں گے اور باقی اس کی تمام روایات لیں گے .... اور اس قسم میں بڑے بڑے محدثین اور ائمۃ المسلین شامل ہیں جیسے حسن بصریؒ ابو اسحاق السبیعیؒ قتادہؒ بن دعامہ، عمرو بن دینارؒ، سلیمانؒ الاعمش،

الزبیر وسفیان الثوری وسفیان بن عیینة اھ (کتاب الاحکام فی اصول الاحکام ج ۲ ص ۱۴۱ لابن حزمؒ وتوجیه النظر ص ۲۵۱ للجزائریؒ)

ابوالزبیرؒ سفیان ثوریؒ اور سفیان بن عیینہؒ .... الخ

(کتاب الاحکام فی اصول الاحکام جلد ۲ لابن حزمؒ و توجیہ النظر ص ۲۵۱ للجزائریؒ)

۱ اہل علم جانتے ہیں کہ بیشتر صحیح احادیث کے روات یہی حضرات ہیں اس عبارت سے یہ ضابطہ معلوم ہوا کہ ان مذکور حضرات کی جن میں ابوالزبیر رحؒ بھی شامل ہیں معنعن احادیث مطلقاً قابل قبول ہیں اور ان کی صحت میں کوئی کلام نہیں اور امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ وغیرہ چوٹی کے محدثین نے ان حضرات کی معنعن روایات سے استدلال کیا ہے چنانچہ حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ

وفی الصحیح قطعة من الاحتجاج بعنعنة المدلس کابی الزبیر عن جابرؓ وسفیانؒ عن عمرو بن دینار ونظائر کثیرة لذالك۔ (تہذیب سنن ابی داؤد، جلد ۷ ص ۹۸)

صحیح (یعنی بخاری ومسلم) میں مدلس کے عنعنہ والی روایتوں سے احتجاج کا ایک کافی حصہ موجود ہے جیسے ابوالزبیرؒ عن جابرؓ اور سفیانؒ عن عمرو بن دینارؒ اور اس جیسی بکثرت نظیریں۔

(تہذیب سنن ابی داؤد۔ جلد ۷ ص ۹۸)

امام بخاریؒ نے ابوالزبیرؒ کی مقرون بعطاؒ کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ جلد ا ص ۲۹۱ اور جلد ا ص ۹۸ و جلد ا ص ۲۲۳ میں ابوالزبیرؒ عن جابرؓ کو متابعات میں پیش کیا ہے اور اسی طرح جلد ا ص ۱۷۶ میں بھی لیکن کتابت کی غلطی سے ابوالزبیرؒ کی جگہ ابوزید لکھا گیا ہے۔

(دیکھیے مصری نسخہ بخاری مع شرح فتح الباری جلد ۳ ص ۱۳۴ و عمدة القاری جلد ۸ ص ۱۲)

بلکہ امام بخاری رحؒ نے ابوالزبیر رحؒ عن جابرؓ کی سند سے احتجاج بھی کیا ہے۔ اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ امام بخاری رحؒ فقہی مسائل بیان کرنے کے لیے باب ترجمہ اور عنوان قائم کرتے ہیں اور علماء کا مشہور مقولہ ہے فقہ البخاری فی الابواب والتراجم۔ پھر اس دعوے کے اثبات کے لیے کبھی تو وہ مسند اور مرفوع روایت پیش کرتے ہیں اور کبھی معلق روایت اور کوئی اثر نقل کرتے ہیں اور اس طریقے سے وہ اپنے دعوے کو مدلل اور مبرہن کرتے ہیں۔ امام بخاریؒ

نے جلد ۱ ص ۲۲۴ میں یہ عنوان قائم کیا ہے۔ باب الاھلال من البطحاء وغیرھا للمکی..... الخ یعنی مکہ مکرمہ میں رہنے والے کا البطحاء وغیرہا سے احرام باندھنے کا باب۔ (منی کے قریب ایک جگہ ہے جس میں بکثرت سنگریزے ہیں اس کو بطحاء، ابطح، محصب، حصبہ اور خیف بنی کنانہ بھی کہتے ہیں۔ اس وقت اس کے قریب کلیہ عبدالعزیز یعنی عبدالعزیز کالج ہے) اور امام بخاری رح نے اس دعوے کے اثبات کے لئے وقال ابوالزبیر عن جابر رض اھللنا من البطحاء کے اثر سے احتجاج کیا ہے باب میں پیش کردہ اس دعوی کے اثبات کے لیے اور کوئی دلیل انھوں نے پیش نہیں کی انصاف شرط ہے کہ احتجاج اور استدلال اور کیا ہوتا ہے؟ اگر امام بخاری رح نے اس دعوے کے اثبات کے لیے کوئی اور مسند اور مرفوع حدیث پیش کی ہوتی اور ساتھ یہ اثر بھی پیش کیا ہوتا تو ہم سمجھتے کہ ابوالزبیر رح عن جابر رض کا اثر صرف متابعت میں پیش ہوا ہے مگر ایسا نہیں ہے اور حافظ ابن حجر رح فرماتے ہیں کہ

واحتج الجمھور بحدیث ابی الزبیر عن جابر رض وھو الذی علقہ المصنف فی ھذا الباب....... الخ

جمہور نے ابوالزبیر رح عن جابر رض کی روایت سے احتجاج کیا ہے اور وہ یہی حدیث ہے جس کو امام بخاری رح نے اس باب میں معلق بیان کیا ہے۔

(فتح الباری جلد ۴ ص ۲۵۲)

الغرض جمہور محدثین کرام رح ابوالزبیر عن جابر رض کی سند سے احتجاج کرتے اور اس کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں۔

دوم اس لیے کہ اگر صرف لیث رح عن ابی الزبیر رح کی سند سے ہی ابوالزبیر کی معنعن حدیثیں صحیح ہیں اور باقی نہیں تو پھر مسلم شریف کی ان تمام روایات کی صحت کا انکار کردیا جائے، جو ابوالزبیر رح سے من غیر طریق لیث رح معنعن مروی ہیں۔ مثلاً جلد ۱ ص ۲۲۴ و ص ۲۴۰ و ص ۲۶۲ و ص ۲۶۵ و جلد ۲ ص ۲ و ص ۷ و ص ۱۱ و ۲۷ و ۳۲ و ۳۸ و ۶۵ و ۱۶۶ و ۱۹۷ و ۲۰۲ وغیرہ وغیرہ۔ پھر صحیح مسلم کو صحیح کہنے کی رٹ ترک کردی جائے اور اگر یہ روایات صحیح ہیں اور یقیناً جمہور امت کے نزدیک صحیح ہیں تو ہماری پیش کردہ روایت عن ابی الزبیر رح عن جابر رض بھی یقیناً صحیح ہے۔

سوم اس لیے کہ امام مسلم رح نے صحیح مسلم میں ابوالزبیر رح عن جابر رض کی جن روایات سے

احتجاج کیا ہے کیا ان میں سے ہر ہر روایت کسی اور صحابی سے بھی امام مسلمؒ نے روایت کی ہے تاکہ ان کی معنعن روایات پر حرف نہ آئے ؟ اگر معترض صاحب صحیح مسلم میں سے انھیں مضامین کی روایات جو ابو الزبیرؒ عن جابر رضؓ کے طریق سے مروی ہیں دیگر حضرات صحابہ کرام رضؓ کی روایات سے باحوالہ بتادیں تو ہم علمی اور تحقیقی طور پر ان کے احسان مند ہوں گے۔ دو چار روایتوں میں ایسا کر دکھانا کوئی کمال نہ ہوگا۔ ہر ہر روایت اور مضمون میں یہ مطلوب ہے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے اور یقین جانیے کہ وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکیں گے تو اس سے لازماً یہی سمجھا جائے گا کہ مسلم شریف کی بے شمار حدیثیں ان کے اس غلط نظریہ سے غیر صحیح قرار پائیں گی اور صحیحین کی صحت کے بارے میں ان حضرات کا دعوٰی محض زبانی جمع خرچ تصور ہوگا جیسا کہ مخفی نہیں۔

اس کے علاوہ اور بھی سطحی قسم کے اعتراضات اور بزعم خود جوابات ترجمان الحدیث میں موجود اور مذکور ہیں لیکن ہمارا دیانتاً یہ نظریہ ہے کہ ان سے کسی اہل علم اور صاحب بصیرت آدمی کو کوئی شبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ہم ان کو نقل کر کے قارئین کرام کے اذہان کو بلاوجہ اور بے ضرورت پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وّعلیٰ اٰلہ واصحابہ واتباعہ الیٰ یوم الدین وبارك وسلم۔

احقر النّاس

ابو الزاہد محمد سرفراز

۱۶ صفر ۱۴۰۰ھ
۵ جنوری ۱۹۸۰ء

دیباچہ طبع دوم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

(۱) بعض غیر مقلدین حضرات نے یہ بے جان دعویٰ کیا تھا کہ جس شخص نے ہر رکعت میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز بے کار، باطل اور کالعدم ہے اور اس پر تمام دنیا کے احناف کو کھلا چیلنج بھی کیا تھا۔ راقم اثیم نے ان کے اس غلو کے رد میں ٹھوس دلائل کے ساتھ دو جلدوں میں بلسوط کتاب احسن الکلام لکھی جس کو نہ صرف یہ کہ عام تعلیم یافتہ حضرات ہی نے پسند کیا بلکہ ہند و پاک کے متبحر اور نامور علماء کرام نے اس کی بیحد تعریف کی اور اپنی زریں اور قیمتی آرا اور تصدیقات سے راقم کی عزت افزائی کی اور کتاب کی اغلاط کی طرف بھی توجہ دلائی جو بمقتضائے بشریت کچھ تو راقم سے اور کچھ کتابت کی وجہ سے اور بعض کاپیوں اور پروفوں کی کماحقہٗ تصحیح نہ ہو سکنے کی وجہ سے باقی رہ گئی تھیں جن حضرات نے نمایاں غلطیوں کی نشاندہی کی ان میں علی الخصوص سند العلماء رئیس المحققین حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دامت برکاتہم اور حضرت مولانا ابو عبد اللہ غلام سرور صاحب دام مجدہم (چنن ضلع گجرات) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور راقم تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

(۲) جہاں ان حضرات نے اس کتاب کے مضبوط دلائل اور براہین اور حسن ترتیب کی شاندار تحسین کی وہاں غیر مقلدین حضرات نے اس پر ضرورت سے زیادہ غم و غصہ کا اظہار فرمایا چنانچہ

ان کی جماعت کے چوٹی کے مدرس عالم اور سابق شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ فیصل آباد نے ایک مستقل کتاب خیر الکلام تحریر فرمائی جس میں جوابات کا بیشتر حصہ محض سینہ زاد جوابات اور صدری نسخوں پر مشتمل ہے۔ اس کا یہ احتمال ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یوں لینا چاہیے۔ اور اس کا مطلب یوں بھی لیا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر بات ہے کہ احسن الکلام کے ٹھوس اور معنی خیز حوالوں کا جواب محض احتمالات اور سینہ زاد باتوں سے نہیں ہو سکتا یہاں ٹھوس حوالہ جات درکار تھے اور یہی ان کے بس کا روگ نہ تھا اور روایات کے بارے میں وہ ساری کتاب میں ایک ہی ضابطہ سے کام لیتے رہے ہیں وہ یہ کہ جرح مفسر کو بھی جرح مبہم گردان کر اور ایک دو حوالے راوی کی توثیق کے نقل کر کے یہ فیصلہ صادر فرماتے رہے ہیں کہ لہٰذا جو جرح مؤلف احسن الکلام نے کی ہے وہ مبہم ہے اور توثیق کے بعد اس کا کوئی اعتبار نہیں اور کہیں تعدد طرق کا سہارا لیکر حدیث کو حسن بنا ڈالا ہے۔ خیر ہم نے بقدر وسعت طبع ثانی میں اس کا خوب جائزہ لیا ہے۔ مؤلف خیر الکلام نے احسن الکلام کو لوگوں کی نظروں سے گرانے کیلئے اور اپنی جماعت کے جذباتی حضرات کے جذبات کو ابھانے کیلئے آخر میں سترہ عدد مناقشے بھی درج فرمائے ہیں جن کا ذکر کتاب میں پہلے بھی وہ اپنے خیال میں مناسب مقامات پر کر چکے ہیں اور یہ چیز ان کے پیش نظر رہی ہے کہ احسن الکلام کی اغلاط ان کے حواریوں کے ذہن میں النقش فی الحجر ہو جائیں اور اس کتاب سے اور اس کے مصنف سے بدظنی پیدا ہو جائے۔ مثلاً ایک جگہ یہ تھا کہ حضرت امام عبد اللہ بن المبارکؒ حضرت امام بخاریؒ کے استاد الاستاد تھے۔ الاستاد کا لفظ کتابت سے چھوٹ گیا تو اس پر مناقشہ کھڑا کر لیا گیا کہ اس مؤلف کو یہ بھی معلوم نہیں کہ امام ابن مبارکؒ، امام بخاریؒ کے استاذ نہیں ہیں۔ اور ایک مقام پر فقرأ اِمامُہٗ کا جملہ غلطی سے رہ گیا تو اس پر بھی خوب مصالحہ لگا کر مناقشہ کی عمارت کھڑی کر دی گئی اور ایک جگہ قتادہؒ کا نام سند سے چھوٹ گیا تو اس کو کئی مقامات پر انھوں نے اُجاگر کیا اور یہ لکھا کہ چونکہ یہ تیسرے درجہ کے مدلس تھے۔ تب ان کو گرا دیا گیا ہے، حالانکہ راقم نے خود احسن الکلام میں باحوالہ یہ لکھا ہے کہ قتادہؓ کی تدلیس سرے سے مضر ہی نہیں تو پھر اس کو حذف کرنے کا راقم کو کیا فائدہ تھا؟ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ اکثر مناقشے اسی نہج کے ہیں اور جہاں بعض عبارتیں مجمل اور مختصر تھیں۔

اب ان کی تشریح کر دی گئی ہے اور جہاں اغلاط معقول نظر آئیں۔ ان کی اصلاح کر لی گئی ہے۔ ہم نے جب ان کی کتاب میں اسی نہج کے بلکہ ان سے سنگین تر مناقشات کا تتبع کیا تو تقریباً ساٹھ سے زیادہ نظر آئے۔ اگر ضرورت پڑی اور ہم مجبور کر دیئے گئے تو الگ ان کو شایع کر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ ورنہ علمی اور تحقیقی میدان میں ہم اس طعنہ بازی کو پسند نہیں کرتے اور نہ اس کا اثر اچھا رہتا ہے۔ ان مناقشات کو انھوں نے فہرست کتاب میں غلط بیانیاں، تحریفات اور مغالطات وغیرہ سے تعبیر کر کے اپنے دل کی خُوب بھڑاس نکالی ہے۔ سچ ہے کُلُّ اِنَاءٍ یَتَرَشَّحُ بِمَا فِیْہِ۔

(۳) غیر مقلدین حضرات نے جب بخوبی یہ محسوس کر لیا کہ خیر الکلام تو احسن الکلام کا معقول جواب نہیں اور علماء تو کیا جذباتی مزاج جماعتی کارکن بھی اس سے مطمئن نہیں ہو سکتے تو ایک صاحب نے الاعتصام میں قسط وار احسن الکلام کی تردید شروع کر دی جس میں انھوں نے علمی اور تحقیقی سطح سے بہت ہی نیچے اتر کر محض تعصبِ مذہبی کا مظاہرہ کیا ہے اور اس میں بیشتر وہی باتیں دہرائی ہیں جو پہلے حضرات مسئلہ خلف الامام کے سلسلہ میں لکھ اور کہہ چکے ہیں۔ ہاں البتہ یہ سب کچھ انھوں نے صرف جذبات اور تعلّی کی صورت میں ادا کیا ہے ان کی قابل جواب باتوں کا ذکر ہم نے کتاب میں کر دیا ہے۔ باقی لایعنی باتوں کی طرف مطلقاً توجہ نہیں کی۔ البتہ انھوں نے الاعتصام اور مغالطات احسن الکلام میں جو باتیں خوب کھل کر چیلنج بازی کی شکل میں کہی ہیں وہ اصولاً و اختصاراً یہ ہیں:

(۱) مؤلف احسن الکلام نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی عبارت سے دھوکا دیا ہے ...... الخ

اس کا جواب اور حضرت شاہ صاحبؒ کی پوری عبارت ہم نے طبع دوم میں ذکر کر دی ہے اور واضح کیا ہے کہ غلطی کس کی ہے؟

(۲) کہ مؤلف احسن الکلام نے محمد بن خازمؒ کی امام ابن حبانؒ سے یہ توثیق تو نقل کر دی ہے کہ وہ ثقہ اور متقن تھا مگر آخر کا یہ قول نقل نہیں کیا کہ وہ خبیث مرجئی تھا اور یہ بد دیانتی ہے۔ (محصلہ)

مگر یہ بیچارے اصول حدیث سے بالکل کورے ہیں۔ محمد بن خازمؒ بخاری اور مسلم کے مرکزی راوی ہیں اور اصول حدیث کے رو سے ثقہ راوی کا خارجی یا جہمی معتزلی یا مرجئی وغیرہ ہونا اس کی ثقاہت پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتا اور صحیحین میں ایسے راوی بکثرت موجود ہیں۔ تدریب الراوی اور ہدایت السائل میں ان کی کچھ نشاندہی کی گئی ہے اور خود مؤلف خیر الکلام ص ۲۹۰ میں لکھتے ہیں: "کہ ارجاء وغیرہ بدعات کے اعتراضات سے ثقہ ہونے میں خلل پیدا نہیں ہوتا ...... الخ"

یہ قاعدہ ہمارے پیش نظر تھا اور اس لیے ہم نے یہ جملہ نقل نہیں کیا اور خود جناب قاضی مقبول احمد صاحب کا یہ عالم ہے (اور حیرت ہے کہ الاعتصام کے ذمہ داروں نے بھی اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کی) کہ عبدالرحمنؒ بن محمد بن زیادؒ جو صحاح ستہ کے راوی ہیں ان سے متعلق لکھا ہے کہ انتہا درجہ کے ضعیف ہیں۔ (الاعتصام ۲۸ ستمبر ۱۹۶۲ء ص ۸ کالم ۳)۔

(۳) کہ مؤلف احسن الکلام نے راویوں کے بارے میں توثیق و تضعیف نقل کرنے میں خیانت اور بد دیانتی سے کام لیا ہے۔ مثلاً فلاں ضعیف راوی کے بارے میں فلاں امام نے کہا ہے کہ وہ ثقہ ہے مگر اس قول کو وہ نقل نہیں کرتا اور فلاں ثقہ راوی کو فلاں امام نے ضعیف یا وہمی وغیرہ کہا ہے۔ اس کو بھی وہ پی گیا ہے۔ (محصلہ)

اور الاعتصام میں ان صاحب کا بیشتر مضمون اسی عبارت پر کھڑا ہے اور خوب جذباتی رنگ میں صفحہ صفحہ پر اس کو نمایاں کیا گیا ہے مگر صد افسوس ہے کہ احسن الکلام کی اس عبارت کا ذکر تک نہیں کیا۔ حالانکہ ان کا اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ اس کا حوالہ دیتے۔ چنانچہ عبارت یوں ہے: "ہم نے بعض مقامات پر ثقہ راویوں سے متعلق ثقاہت اور عدالت کے اقوال تو نقل کر دیے ہیں، لیکن اگر بعض ائمہؒ کا کوئی جرحی کلمہ ملا ہے تو وہ نظر انداز کر دیا ہے۔ اسی طرح اگر کسی ضعیف اور کمزور راوی کے بارے میں کسی امام کا کوئی توثیق کا جملہ ملا ہے تو اس کو بھی درخور اعتناء نہیں سمجھا کیونکہ فن رجال سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والے حضرات بھی بخوبی اس امر سے واقف ہیں کہ ایسا کوئی بھی ثقہ جس پر جرح کا کوئی کلمہ منقول نہ ہو یا ایسا ضعیف جس کو کسی ایک شخص نے بھی ثقہ نہ کہا ہو کبریت احمر کے مترادف ہے۔ حضرات

صحابہ کرام رضؓ کا رتبہ کس سے مخفی ہے ؟ اور الصحابۃ کلّھم عدول کے جملہ سے کون اہل علم ناواقف ہے ؟ مگر خوارج و روافض کا نظریہ بھی ان کے بارے میں پوشیدہ نہیں ہے۔ بایں ہمہ، ہم نے توثیق و تضعیف میں جمہور ائمہ جرح و تعدیل اور اکثر ائمہ حدیث کا ساتھ اور دامن نہیں چھوڑا مشہور ہے کہ : ع زبان خلق کو نقّارہ خدا سمجھو انتہی بلفظہ

(احسن الکلام جلد اول، طبع اول ص)

یہ عبارت بار بار پڑھیے اور داد دیجیے قاضی مقبول احمد صاحب کے واویلا کی کہ مؤلف احسن الکلام نے رواۃ کے بارے میں بد دیانتی کی ہے فلاں راوی کے بارے میں فلاں کا قول ترک کر دیا ہے اور فلاں راوی کے بارے میں فلاں امام کا حوالہ چھوڑ دیا ہے اور الاعتصام میں قاضی صاحب کا زیادہ زور اسی پر صرف ہوا ہے۔ ان کو یہ توحق تھا کہ اس قاعدہ کو دلائل سے غلط ثابت کرتے۔ لیکن اس واضح عبارت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مؤلف احسن الکلام کو بد دیانت ثابت کرنا خالص تعصب کا مظاہرہ یا اپنے ناخواندہ حواریوں کو خوش کرنے کا ایک مذموم ڈھنگ ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ مؤلف احسن الکلام کو کاملین سے خوشہ چینی کا موقع ملا ہے اور اصول و ضوابط کو سمجھنے کی اللہ تعالیٰ نے اس کو اہلیت مرحمت فرمائی ہے۔

(۴) عبداللہ بن نافع بن عمیار کے متعلق جو توثیق کے الفاظ مؤلف احسن الکلام نے نقل کیے ہیں اس میں دھوکہ اور بد دیانتی سے کام لیا ہے۔ (محصلہ)

الجواب۔ اصل بات یہ ہے کہ تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۵۰ اور ۵۱ میں (نمبر ۹۷ اور ۹۸) دو راوی ہیں۔ ایک کا نام عبداللہ بن نافع بن عمیارؒ ہے اور دوسرے کا نام عبداللہ بن نافع بن ابی نافع الصائغ المخزومیؒ ہے۔ غلطی سے ثانی کا ترجمہ پہلے کے ترجمہ میں نقل ہوگیا ہے۔ اور اب طبع دوم میں اس کو بالکل کاٹ دیا گیا ہے۔ ایسے ہم نام راویوں کے بارے میں بڑے بڑے اکابر محدثینؒ سے غلطیاں چلی آرہی ہیں۔ نہ تو ان کو کسی نے دعوت مبارزت دی اور نہ بد دیانت کہا ہے اوروں کی بات ہی چھوڑیے خود مؤلف خیر الکلام بعض مقامات میں اس غلطی کا شکار ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ خیر الکلام ص ۴۷، ۴۸ میں لکھتے ہیں" : کہ دوسرا راوی اس میں علی بن احمد الحامی مقری ہے۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں ابن ابی الفوارسؒ کہتے

ہیں۔ضعیف جداً سخت ضعیف ہے۔"

(میزان جلد ۲، ص ۲۱۷، لسان المیزان جلد ۴، ص ۱۹۴)

لیکن یہ مؤلف خیر الکلام کی غلطی اور نرا وہم ہے۔کیونکہ ابن ابی الفوارسؒ نے جس کی تضعیف کی ہے وہ علی بن احمد بن ابی القیس المقرئی الرفاعیؒ ہے جس کی وفات ۳۵۲ھ میں ہوتی ہے۔ دیکھیے:(لسان المیزان جلد ۴، ص ۱۹۴) اور ہماری پیش کردہ سند میں علی بن احمد بن عمر بن حفص ابوالحسن المقرئی المعروف بابن الحمامیؒ ہیں جن کی وفات ۴۱۷ھ میں ہوئی ہے۔

(ملاحظہ ہو۔ بغدادی جلد ۱۱، ص ۳۳۰)

الغرض ہم نام راویوں کے بارے میں ایسے اوہام کا پیش آجانا کوئی مستبعد بات نہیں ہے اور نہ کسی دیانت دار عالم نے آج تک ایسے امور میں کسی کو چیلنج کیا ہے۔

(۵) بایں ہمہ ہم نے الاعتصام میں پیش کیے گئے اعتراضات میں سے جو قابل جواب تھے ان کی قدرے وضاحت کردی ہے اور ہم ان غیر مقلدین حضرات کے ممنون ہیں کہ انھوں نے احسن الکلام پر ناقدانہ نگاہ ڈالی گو ان کا نظریہ ان کا مذہبی تعصب ہے تاہم وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔

(۶) مؤلف خیر الکلام سے ہم بجا توقع رکھ سکتے تھے کہ وہ اپنی جماعت کے مدرس عالم اور شیخ الحدیث ہیں کہ وہ اپنی جماعت کے ان غالی لوگوں کو ناصحانہ طور پر ترک غلو کا کوئی مفید مشورہ دے دیتے اور چند سطریں اس پر بھی تحریر فرما دیتے کہ جو لوگ ترک قرأۃ خلف الامام کی صورت میں لوگوں کی نمازوں کو باطل، بے کار اور کالعدم کہتے ہیں وہ اعتدال کی راہ اختیار کریں۔ اختلافی مسائل میں یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے لیکن یقین جانیے کہ انھوں نے صحیح طور پر آج کل کی عدالتی وکالت کا حق ادا کر دیا ہے کہ ہر طرح سے اپنے مؤکل کو خواہ وہ جھوٹا ہی کیوں نہ ہو سچا ثابت کیا جائے یہ الگ بات ہے کہ عدالت اس کی رائے سے متفق نہ ہو اور اس کو مجرم گردان کر قرار واقعی سزا دے۔ اپنی جماعت کے تمام عیبوں پر پردہ ڈال کر اس کو برحق قرار دینے پر بلاوجہ ایڑی چوٹی کا زور لگانا کوئی مستحسن امر نہیں ہے۔ ان سے تو خیر الکلام کے صاحب مقدمہ ہی قدرے اچھے رہے کہ انھوں نے صدہ میں کچھ اشارہ

کیا ہے اگرچہ اپنی جماعت کے چیلنج کو مدافعت کہ کر حق پوشی کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "مجھے اعتراف ہے کہ اس سلسلے میں ہمارے بھائیوں کے حملوں کی مدافعت میں رد کے طور پر جماعت اہل حدیث کے ایک قلیل طبقے کا ایسا رویہ ضرور رہا کیا جو غیر معتدل ہونے کے علاوہ مسلک اہل حدیث کے شایان شان نہ تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غلو کے مقابلہ میں غلو ایک نفسیاتی حقیقت ہے۔" اھ

اگر تو کسی حنفی نے تمام روئے زمین کے غیر مقلدین حضرات کو ایسا کوئی چیلنج کیا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے۔ اس کی نماز باطل ہے، بیکار ہے، کالعدم ہے۔ تو وہ بلاشک اس کو مدافعت سے تعبیر کر سکتے ہیں اور اگر ایسا نہیں کیا تو یہ خالص جماعتی ملی بھگت ہی ہے کہ سیدھی سادھی بات میں تاویل کا پیوند لگا کر اس کو حق ثابت کیا جائے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔

(۷) اگرچہ اپنی دانست کے مطابق ہم نے اب کتاب کو اغلاط سے پاک کر دیا ہے۔ تاہم ان حضرات کا (خواہ ان کا نقطۂ نظر کچھ ہی ہو) شکریہ ادا کریں گے جو ہمیں ہماری کوتاہیوں سے آگاہ کریں گے۔ اور ہمیں معقول اغلاط کی درستی میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ انشاء اللہ العزیز۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ط

ابو الزاہد
۲۶ شوال ۱۳۸۴ھ
۲۸ فروری ۱۹۶۵ء

دیباچہ طبع اوّل

کتاب احسن الکلام جلد اوّل و دوم کی تالیف و ترتیب میں گو بڑی محنت اور کوشش سے کام لیا گیا تھا مگر اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اس کو صفِ اول کے محقق اور جید علماءِ کرام بھی بے حد پسند فرمائیں گے جیسا کہ تصدیقات اور تقاریظ سے بھی ظاہر ہے۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اُس نے اس حقیر سے یہ خدمت لی ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔

میں اپنی اس کتاب کا حضرت الاستاذ المحقق، المدقق، الفقیہ، المحدث، شیخ المعقول، والمنقول مولانا عبدالقدیر صاحب کیمبل پوری دامت برکاتہم (حال او کاڑہ) کے نام گرامی سے انتساب کرتا ہوں کیونکہ اس حقیر کا دینی کتب کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق حضرت موصوف کی خالص توجہ اور نوازش کا رہین منت ہے اور اکثر بڑی اور دقیق کتابیں راقم نے حضرت سے ہی پڑھی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت کو تا دیر سلامت رکھے اور دین کی خدمت کا مزید موقع دے۔ ع "وَيَرْحَمُ اللّٰهُ عَبْدًا قَالَ آمِيْنًا"

احقر

ابوالزاہد

۱۸؍ذوالقعدہ ۱۳۷۴ھ

۹؍جولائی ۱۹۵۵ء

سخن ہائے گفتنی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ط

عالمِ انسانی میں ہر چیز کا وجود اسباب وعلل اور محرکات و دواعی کے وجود پر موقوف ہے۔ جب تک علتِ وجود اپنے تمام لوازم کے ساتھ معرض وجود میں نہ آجائے کسی چیز کا عالم وجود میں آنا ممکن نہیں یہ ایک عقلی اور فطری قاعدہ ہے۔ اور انسانی افعال و اغراض کا ناگزیر محور جس کے گرد انسان کے سب افعال چکر لگاتے اور گھومتے رہتے ہیں۔

سببِ تالیف

علمی اور عملی، فنی اور تحقیقی لحاظ سے قرأۃ الفاتحہ خلف الامام کا مسئلہ اپنے مثبت اور منفی پہلو کے اعتبار سے قرنِ اوّل سے تا ہنوز بحث وتمحیص اور تطبیق وترجیح کا محتاج رہا ہے۔ حضرات ائمہ دین ومحققین علماء نے مختلف زمانوں اور متعدد زبانوں میں اس مسئلہ پر خامہ فرسائی کی ہے۔ محرم اور ملبیح پہلو اور راجح ومرجوح گوشہ کی تلاش اور جستجو میں انھوں نے انتہائی کوشش اور کاوش کی ہے۔ اور سینکڑوں کتابیں اور رسالے اس پر لکھے گئے ہیں۔ مگر اس خاص شکل وصورت

اور ترتیب کے ساتھ نہایت سہل اور آسان طریقہ پر اس کتاب کو پیش کرنے کا بڑا سبب فریقِ ثانی کی حد سے زیادہ تجاوز اور گرم گفتاری ہے۔ اس کا یہ دعویٰ ہے۔ کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتا۔ اس کی نماز بالکل نہیں ہوتی۔ اور بعض نے تو یہاں تک غلو سے کام لیا کہ جملہ احناف[1] کو بے نماز اور مفسدین صلوٰۃ کے خطاب سے نوازا ہے۔ اور بعض نے قسم اور حلف[2] اٹھا کر کہا، کہ حنفیوں کی نماز نہیں ہوتی۔ اور ہم نے ان میں سے بعض کو سلسلۂ تقریر و درس حدیث اور نجی مجلسوں میں منطقِ یونان سے بھی استعانت کرتے دیکھا ہے اور یوں صغریٰ و کبریٰ جوڑ کر نتیجہ[3] نکالتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتا۔ قرأت سورۃ فاتحہ نہیں کرتا۔ اس کی نماز نہیں ہوتی اور من ترك الصّلوة متعمّدًا فقد کفر کہ جس شخص نے دیدہ و دانستہ نماز ترک کی وہ کافر ہو گیا۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ ترک کرنے والا کافر ہے۔ (گو بعض بڑے محتاط اور منصف مزاج حضرات کے نزدیک عملی طور پر ہی وہ کافر ہو گیا۔ مگر ہے ضرور) اور ہمارے زمانے کے ایک صاحب نے جو اپنی جماعت

---

[1] حضرۃ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں بعض مدعیانِ عمل بالحدیث نے یہ غوغا مچایا کہ حنفیہ مفسدین صلوٰۃ اور بے نماز ہیں۔" (ہدایت المهتدی ص ۲)

[2] حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ (المتوفی ۱۳۷۱ھ) لکھتے ہیں: "کہ بالخصوص قسم کھا کر کہے کہ حنفیوں کی نماز نہیں ہوتی۔ ان کی بیبیوں سے غیر مقلدین کو بلا طلاق نکاح جائز ہے۔"... الخ (تنقیح التنقید ص ۳۵)

[3] ایک غیر مقلد مگر منصف مزاج عالم ایسے ہی ایک غالی اور بے باک مفتی کا حوالہ دیتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں: "اول تحریر ایک، ہمارے ہی علماء اہل حدیث کی پرچہ تنظیم میں طبع ہوئی تھی جس میں مولانا موصوف نے مدرک رکوع کے اعتداد والوں کو مخلد فی النار تک کا حکم صادر فرما دیا تھا۔ نتیجہ اس طرح نکالا تھا کہ مدرک رکوع سے فاتحہ مفقود ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی نماز نہیں۔ جس کی نماز نہیں وہ بے نماز ہے۔ بے نماز کافر ہے اور وہ مخلد فی النار ہے۔" (بلفظہ، اتمام الرکوع فی ادراک الرکوع ص ا، طبع کردہ منیجر رسالہ صحیفہ اہلحدیث صدر دہلی) مؤلف خیر الکلام نے بزعم خود چند دلائل پیش کیے ہیں پھر لکھتے ہیں: "لہٰذا فاتحہ ہر نمازی پر خواہ امام ہو یا منفرد یا مقتدی فرض ہوگی۔" (ص ۵۱۲) — مگر یہ نہیں بتایا کہ اس فرض کے منکر اور تارک پر فتویٰ کیا صادر ہوگا؟ آیا وہ مسلمان رہے گا یا نا مسلم؟ (العیاذ باللہ) کیونکہ اصول کے لحاظ سے فرض کا منکر مسلمان نہیں ہونا چاہیے۔ دیکھیے کیا فتویٰ صادر ہوتا ہے؟

کے روحِ رواں اور چوٹی کے مناظر و مبلغ سمجھے جاتے ہیں۔ پنجاب کے ایک مشہور قصبہ میں دورانِ تقریر یہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز ہرگز نہیں ہوتی۔ آؤ ہمارے ساتھ اس مسئلہ پر مباہلہ کر لو۔"

آپ اس کتاب میں پوری تفصیل سے پڑھیں گے کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ ترک کرنے کے قائل کون کون ہیں؟ نہ معلوم مُباہلہ کس کس سے ہوگا؟ اور تاسف بالائے تاسف یہ کہ مُباہلہ بھی فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ ۔ کے الفاظ کے ساتھ اور لطف یہ ہے کہ وہ صاحب نہ بیوی رکھتے ہیں اور نہ بچے۔ گویا آیت مُباہلہ میں نَدْعُ اَبْنَاءَنَا وَ اَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَ نِسَاءَكُمْ کا ان کے نزدیک کوئی مفہوم ہی نہیں —— اور اب کراچی سے ایک کتابچہ کو شائع ہوا ہے جس کا نام ہے "فصل الخطاب فی قرأۃ فاتحۃ الکتاب" جو کتب خانہ اہلحدیث، ۱۹۔ ۱۱ نیو کلاتھ مارکیٹ، کراچی (پاکستان) کی طرف سے شائع ہوا ہے، جس میں انھوں نے انتہائی فراخ دلی کے ساتھ تمام روئے زمین کے احناف کو انعامی چیلنج کیا ہے۔ اور روئے زمین کی چیدہ چیدہ ہستیوں کو نام بنام للکارا ہے۔ اصل الفاظ میں ان کا اعلان یہ ہے:

انعامی چیلنج: تمام دنیا کے حنفی حضرات کو کھلا اور انعامی چیلنج دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم اہلِ حدیث امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کا خاص لفظ حدیث مرفوع صریح صحیح حسن سے (بحوالہ کتب صحاح ستہ وما وافق بہا) دکھاتے ہیں۔ ایسا ہی وہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے نہ پڑھنے کا خاص لفظ حدیث مرفوع صریح صحیح حسن سے (بحوالہ کتب صحاح ستہ وما وافق بہا) میدانِ مناظرہ میں دکھا دیں تو ہم ان کو اس حقِ محنت، داد ہمت، تمغۂ صداقت کے صلہ میں فاتحہ کے ہر حرف کے بدلے میں مبلغ ایک سو روپے دینے کو تیار ہیں۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

کیا ہے روئے زمین پر کوئی زندہ دل حنفی جو میدانِ مناظرہ میں کھڑے اور امام کے پیچھے خاص لفظ فاتحہ کے نہ پڑھنے کا دکھا کر مبلغ پانچ سو روپیہ انعام حاصل کرے (دیدہ باید) اس انعامی چیلنج کو شائع کیے ہوئے آج تیرہ سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے اور تقریباً یہ چیلنج بارہ ہزار کی تعداد میں طبع کرا کر علماء اور جہلا کے ہاتھوں میں پہنچا چکے ہیں۔ دیوبند، ڈابھیل، ہندوستان پاکستان کے احناف کے بڑے بڑے مدارس میں بھی پہنچ چکا ہے۔ احناف کے مقتدر علماء

مفتی کفایت اللہ صاحبؒ (المتوفی ۱۴ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ مطابق یکم جنوری ۱۹۵۳ء) مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ (المتوفی ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ) اور مولانا شبیر احمد عثمانی رح (المتوفی ۱۲ صفر ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۴ دسمبر ۱۹۴۹ء) کی خدمت میں پیش ہو چکا ہے۔ لیکن اس وقت تک کسی حنفی کو یہ جرأت نہ ہوئی اور نہ ہی آیندہ ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ کہ وہ دنیا کی کسی کتاب سے ایک حدیث ہی بموجب شرائط مندرجہ در چیلنج پیش کر کے انعام حاصل کرنے کے علاوہ مذہب حنفی پر احسان کرتا۔ لیکن کرتا کہاں سے۔ جب کہ اس طرح کی ایک حدیث کسی دنیا کی اسلامی کتب میں موجود نہ ہو اور یقیناً نہ ہو۔ (انتہیٰ بلفظہٖ فصل الخطاب ص ۲/۳)

اس شاہی اور رفراخدلانہ انعامی چیلنج کے بعد اسی کتابچہ کے آخری صفحہ پر یہ اعلان ان الفاظ سے دہرایا گیا ہے۔

تمام دُنیا کے عُلماءِ اَحناف کو کُھلا چیلنج

ہم تمام علماء احناف ہند، سندھ، پنجاب، بنگال، خراسان، عربستان، چین، جاپان، افریقہ، امریکہ، آسٹریلیا، یورپ، مصر، عراق وغیرہ کو بذریعہ چیلنج و اشتہار ہذا کے دعوت دیتے ہیں کہ ان مسائل مندرجہ ذیل کو کسی آیت یا حدیث صحیح مرفوع متصل سے اور وہ حدیث جس مسئلہ کے ثبوت میں پیش کریں۔ نص صریح ہو صحاح و ماوافق بہا سے ثابت فرمادیں تو ہم ان کو اس حق محنت، داد ہمت، تمغہ صداقت کے صلہ میں ہر آیت اور حدیث کے بدلہ میں پچیس روپے انعام دیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

(۱) آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقتدیوں کو سورۂ فاتحہ کے پڑھنے سے منع کرنا۔

(پھر نو عدد مسائل اور لکھ کر اور تلك عشرة كاملة تحریر فرما کر بحث کو اس اعلان پر ختم کیا ہے)

هَلْ مِنْ مُّبَارِزٍ یُّبَارِزُنِیْ۔ یعنی کیا ہے روئے زمین پر کوئی زندہ دل اور خوش نصیب حنفی بھائی جو میدان میں کود ے اور ہم سے سینکڑوں روپے کا انعام حاصل کرے۔ (دیدہ باید)

(انتہیٰ بلفظہٖ فصل الخطاب ص۸)

اور اب فصل الخطاب ص ۲ کے جدید ایڈیشن میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ (بلفظہٖ)

اِن تمام اقتباسات کو پیشِ نظر رکھ کر پڑھے لکھے آدمی کو ضرور یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید امام کے پیچھے سُورۂ فاتحہ نہ پڑھنے والے کافر اور گمراہ ہیں اور نماز پڑھتے ہوئے بھی وہ بے نماز اور اقل درجہ یہ ہے کہ وہ بلا دلیل ہیں حتیٰ کہ ان کے ساتھ لعنۃ اللہ علی الکاذبین کے الفاظ سے مُباہلہ کرنا بھی کارِ ثواب اور جائز ہے اور عوام پر اشتہاری رُعب ڈالنے کے لیے انعامی چیلنج بھی دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ راقم الحروف کو بھی خالی الذہن ہو کر محض اپنی قلبی تسکین اور سنتِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیروی کرنے کی خاطر سینکڑوں کتابوں کے ہزاروں اوراق الٹنے پڑے ہیں اور صدہا رسائل اور کتابچوں کی ورق گردانی کرنا پڑی ہے تاکہ دلائل کی صحت اور سقم کا موازنہ کر کے نجاتِ اخروی کی فکر کی جاتی۔ لیکن میں نے فریقِ ثانی کے جملہ دعووں کو بالکل بے حقیقت یا مبالغہ آمیز اور انتہائی غلو پر مبنی پایا ہے۔ گو مسئلہ زیرِ بحث میں ائمہ دین کا اختلاف رہا ہے مگر جو بے اصل دعاوی فریقِ ثانی کے اہلِ علم حضرات نے کیے ہیں وہ بالکل بے اصل ہیں اور ان حضرات کی ان کارستانیوں پر مطلع ہونے کے بعد قرینِ انصاف تو یہ تھا کہ ہم بھی اپنی لن ترانیوں پر آجاتے اور ان کی سرابی حقیقت کو الم نشرح کرتے ہوئے کہہ دیتے ؎

محتسب خم شکست و من سرِ او
اَلسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ

لیکن قرآنِ کریم کی تعلیم اور حدیثِ نبوی کے صریح ارشادات اور جن اکابر سے ہمیں لگاؤ اور تعلق ہے ان سے ربط و نسبت ہمیں ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اس قسم کی لچر پوچ اور فتنہ انگیز باتیں کہتے پھریں۔ ہمیں تو اصلیت اور حقیقت کو بے نقاب اور آشکارا کرنا ہے اور بس۔ اور اس کتاب کی تالیف و ترتیب سے جو ناراضگی فریقِ ثانی کو پیدا ہو گی اس کے متعلق صرف اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ؏ :

"اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تُست"

یہ بات تو پوری تفصیل کے ساتھ اپنے موقع پر بیان ہو گی کہ امام کے پیچھے سُورۂ فاتحہ ترک کرنے والے صرف ہم احناف ہی نہیں، بلکہ جمہور صحابہ کرام رض و تابعین رح و اتباعِ تابعین رح رہے ہیں اور اکثر سلف و خلف کی معیت سے ہمارا دامن تحقیق وابستہ ہے۔ اور جمہور اپنے اس محقق نظریہ پر نص

قرآنی اور بے شمار حدیثیں پیش کرتے ہیں۔ اور ایسے اختلافی مسائل میں (خصوصاً جن میں بعض صحابہ کرام رضؓ اور ائمہ دینؒ کا اختلاف ہو) ہمارا یہ منصفانہ عندیہ ہے کہ جو بات ظاہر قرآن کریم و حدیث اور جمہور کے عمل کے مطابق ہوتی ہے۔ ہم نہ صرف یہ کہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں بلکہ اس کو اپنا دینی سرمایہ اور باعثِ صد افتخار سمجھتے ہیں اور جن مسائل میں طرفین کے پاس قرآن و حدیث کے دلائل ہوں۔ ہم اس پہلو کو جو قرآن و سنت کے قریب تر ہوتا ہے۔ اختیار کرتے ہیں۔ اور اپنے مسلک کی تائید میں تطبیق اور ترجیح کے ٹھوس دلائل پیش کرتے ہیں اور فریق ثانی کے حق میں غلط موشگافی اور غیر محتاط لفظ زبان سے نکالنا ہر گز جائز نہیں سمجھتے اور تمام مسائل اختلافیہ اور اجتہادیہ میں ہمارا یہی نظریہ ہے جس کی مزید تحقیق آپ کو راقم الحروف کی کتاب الکلام المفید فی اثبات التقلید میں ملے گی۔ مع ہٰذا معصوم ہونے کا دعویٰ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ والعصمۃ بیدِ اللہ تعالیٰ وحدہٗ۔

ہم حیران ہیں کہ مسئلہ زیر بحث میں تکفیر اور تضلیل کس کی ہو گی؟ اور تجہیل و تحمیق کس کی؟ بے سند اور بے دلیل ہونے کا الزام کس پر عائد ہو گا؟ اور لعنۃ اللہ علی الکاذبین کے الفاظ سے مباہلہ کس سے ہو گا؟ کیونکہ مسئلہ کے اختلافی ہونے میں فریقِ ثانی کا بھی اتفاق ہے۔ چنانچہ حضرت امام بیہقی رح (المتوفی ۴۵۸ھ) نے اس مسئلہ پر ایک مستقل کتاب (کتاب القرآۃ) لکھی ہے۔ اس میں تحریر کرتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضؓ کے عہد سے اس وقت تک باقاعدہ اس مسئلہ میں اختلاف چلا آتا ہے۔

(کتاب القرآۃ ص ۱۴۶)

اور مولانا مبارک پوری صاحبؒ المتوفی ۱۳۵۲ھ جن کی کتاب تحقیق الکلام پر فریقِ ثانی کے مسئلہ زیر بحث پر مناظرہ کا دارو مدار ہے امام خطابیؒ رح المتوفی ۳۸۸ھ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

۱؎ ولفظہ: فی مسئلۃ معروفۃ مشہورۃ بما فیہا من الاختلاف منذ عصر الصحابۃ رضؓ الیٰ یومنا ھٰذا۔ یعنی یہ مسئلہ معروف و مشہور ہے۔ اس میں اختلاف حضرات صحابہ کرام رضؓ کے زمانہ سے تاہنوز چلا آتا ہے۔ (کتاب القرآۃ ص ۱۴۶)

۲؎ یہ بحث امام خطابی رحؒ نے "معالم السنن" میں کی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ علماء نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے صحابہ کرام رضؓ کی ایک جماعت سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے امام کے پیچھے قرأۃ کرنے کو واجب کہا ہے اور دوسرے صحابہ کرام رضؓ سے مروی ہے کہ وہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے تھے اور فقہاء کے تین قول ہیں:

(باقی ص پر)

"کہ اس مسئلہ میں صحابہ کرامؓ کا اختلاف تھا۔ ایک گروہ وجوب قرأۃ خلف الامام کا قائل تھا تو دوسرا منکر۔ اس لیے فقہاؒ اور ائمہؒ کا بھی اس میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ مطلقاً وجوب کا قائل ہے اور دوسرا مطلقاً ممانعت کا۔ تیسرا گروہ سرّی نمازوں میں قائل ہے اور جہری نمازوں میں قائل نہیں ہے۔

(تحفۃ الاحوذی جلد ا ص ۲۵۷)

اندریں حالات انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ فریق ثانی جس پہلو کو حق اور صحیح سمجھتا۔ شدت کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہوتا۔ لیکن تکفیر اور تفسیق وغیرہ اور تعدّی وتجاوز کے الفاظ سے گریز کرتا نہ تو مباہلہ کا چیلنج دیتا اور نہ حلفیہ طور پر دوسرے فریق کو بے نماز اور مفسدین صلوٰۃ کا خطاب دیتا اور ایسے اختلافی مسئلہ میں سنجیدگی اور متانت سے کام لیتے ہوئے تعصب، عناد غلو اور زبان درازی سے اجتناب کرتا، مگر کاش کہ اس نے ایسا نہ کیا۔

ہمارا مدعا چونکہ عامۃ المسلمین کو مسئلہ زیر بحث سے شناسا کرنا ہے۔ اس لیے ہم نے عوام کی رعایت کرتے ہوئے نہایت سہل اور حتی الوسع سلیس زبان استعمال کی ہے۔ اسی وجہ سے اکثر عربی عبارات پیش نہیں کی گئیں بلکہ ان کے حوالہ درج کر دینے پر اکتفا کی گئی ہے۔ ہاں البتہ جہاں کسی خاص مصلحت سے اصل عربی عبارت پیش کرنا ضروری معلوم ہوا ہے تو وہاں اصل عبارت نقل کر کے اس کا ترجمہ بھی ساتھ ہی لکھ دیا ہے تاکہ خواص اور عوام دونوں برابر استفادہ کر سکیں۔

ہم نے بعض مقامات پر حتی الوسع متانت اور سنجیدگی کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض علمی چوٹیں بھی کی ہیں جن سے ان اکابر کے طرز استدلال کی خامی اور اس کا نقص واضح کرنا مقصود ہے اور جن سے بڑے بڑے اکابر کے خیالات اور نفسی میلانات کی پردہ دری ضرور ہو گی لیکن پردہ دری کے بغیر درون پردہ کا نظارہ کس نے کیا ہے؟ ورنہ حاشا وکلا ہمارے اس علمی اور تحقیقی طنز سے نہ سلف صالحین سے بدظنی ہے اور نہ تمسخر اور نہ زمانۂ حال کے حضرات کی دل آزاری۔ واللہ علی ما نقول شہید۔

(بقیہ صفحہ) "امام مکحولؒ، اوزاعیؒ، شافعیؒ اور ابو ثورؒ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے جہری اور سرّی سب نمازوں میں قرأۃ کرنا ضروری ہے اور امام زہریؒ، مالکؒ، عبداللہ بن المبارکؒ، احمد بن حنبلؒ اور اسحاق بن راہویہؒ فرماتے ہیں کہ مقتدی سرّی نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کرے لیکن جہری نمازوں میں قرأۃ نہ کرے۔ اور امام سفیان ثوریؒ اور اصحاب الرأی یہ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے کوئی شخص قرأۃ نہ کرے۔ امام جہر سے قرأۃ کر رہا ہو یا آہستہ۔" اھ

(معالم السنن جلد ۲ ص ۳۹۴ طبع مصر)

ہم نے اپنے استدلال میں جملہ پیش کردہ احادیث اور آثار کی اسانید نقل کر کے ہر روایت اور اثر کے جملہ راویوں کی کتب اسماء الرجال سے توثیق نقل کر دی ہے تاکہ پڑھنے والوں کو ہر قسم کی سہولت رہے اور دشواری پیش نہ آئے۔ البتہ متابعات اور شواہد میں نیز ضمنی اور استطرادی ابحاث میں رواۃ کی توثیق کا التزام نہیں کیا گیا اور فریق ثانی کی طرف سے جملہ نقل کردہ روایات و آثار میں جو ضعف و کمزور اور مجروح و متکلم فیہ راوی ہیں۔ ان پر کتب رجال سے جرحی کلام نقل کر دیا ہے تاکہ بلند و بالا دعاوی کرنے والوں کو اپنے دلائل کا معیار بھی معلوم ہو جائے اور جن حضرات صحابہ کرام رضؓ و تابعینؒ اور ائمہ دینؒ کی مسئلہ زیر بحث میں معیت جمہور کو حاصل ہے۔ ان کی ثقاہت اور بعض صفاتِ عالیہ کا تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے تاکہ عوام کو بھی یہ بات بخوبی معلوم ہو جائے کہ ان اکابر کا اسلام اور مسلمانوں میں کیا رتبہ ہے؟

ہم نے بعض مقامات پر ائمہ جرح و تعدیل اور جمہور محدثین کرامؒ کے مسلمہ اور طے شدہ اصول و ضوابط کے عین مطابق ثقہ راویوں سے متعلق ثقاہت اور عدالت کے اقوال تو نقل کر دیئے ہیں لیکن اگر بعض ائمہ کا کوئی جرحی کلمہ ملا ہے تو وہ نظر انداز کر دیا ہے۔ اسی طرح اگر کسی ضعیف اور کمزور راوی کے بارے میں کسی امام کا کوئی توثیق کا جملہ ملا ہے تو اس کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ کیونکہ فن رجال سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والے حضرات بھی بخوبی اس امر سے واقف ہیں کہ کوئی بھی ایسا ثقہ جس پر جرح کا کوئی کلمہ منقول نہ ہو یا ایسا ضعیف جس کو کسی ایک نے بھی ثقہ نہ کہا ہو کبریتِ احمر کے مترادف ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ کا رتبہ کس سے مخفی ہے؟ اور الصحابة کلهم عدول کے جملہ سے کون اہل علم ناواقف ہے؟ مگر خوارج اور روافض کا نظریہ بھی ان کے بارے میں پوشیدہ نہیں ہے۔ بایں ہمہ ہم نے توثیق و تضعیف میں جمہور ائمہ جرح و تعدیل اور اکثر ائمہ حدیث کا ساتھ اور دامن نہیں چھوڑا مشہور ہے کہ

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

تا حدِ ممکن اسانید کو پورا پورا نقل کیا گیا ہے اور ترجمہ میں اخبرنا، اخبرنی، حدثنا، حدثنی، قال فلاں عن فلاں، رَوَی فلاں اور رُوِی عن فلاں وغیرہ اصطلاحات کی پوری رعایت رکھی گئی ہے تاکہ ایک طرف نقل سند کے سلسلہ میں کسی قسم کی خیانت واقع نہ ہو۔ اور دوسری طرف سندات کو دیکھ کر صحیح و ضعیف، متصل اور منقطع وغیرہ کا فرق سمجھنے کی اہلیت رکھنے

والوں کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اکثر مقامات پر جتنی کتابیں دستیاب ہو سکی ہیں۔ ان کے حوالے درج کر دیے گئے ہیں۔ بعض متن میں اور بعض حاشیہ میں (تاکہ اصل عبارت کی ترتیب اور تسلسل میں گنجلک اور اضطراب پیدا نہ ہو) اور یہ حوالے اس لیے درج کیے گئے ہیں تاکہ جو کتاب بھی آسانی کے ساتھ کسی صاحب کو میسر اور دستیاب ہو سکے۔ اس کی طرف مراجعت کر کے اصل عبارت یا اس کا ترجمہ بنظر انصاف دیکھ لیا جائے اور اکثر تاریخی واقعات اور ضمنی ابحاث کو حاشیہ پر درج کر دیا گیا ہے تاکہ پڑھنے والے حضرات اصل مضمون کو مرتب اور مربوط طور پر یکبارگی پڑھ لیں۔ اور مزید تفصیل اور تشریح کے لیے حاشیہ دیکھ لیں۔ بنا بریں توضیحِ بیان، دفعِ شبہ، رفعِ ابہام، توثیقِ رجال، جرحِ رواۃ اور دیگر نہایت ضروری امور کے لیے بہت سے تشریحی حواشی بڑھا دیے گئے ہیں تاکہ خواص کے علاوہ عوام کے لیے بھی یہ کتاب چراغِ راہ کا کام دے۔

حضرات سلف صالحین کی عبارات کے پہلو بہ پہلو ہم نے فریقِ ثانی کی عبارات اور تحریرات سے بھی استفادہ کیا ہے اور ان کی عبارتیں اپنی تائید میں نقل کی ہیں۔ مگر ان کی عبارات سے احتجاج کرنے میں سینہ زوری سے کام نہیں لیا گیا بلکہ ان سے جو منطوق اور مفہوم کے لحاظ سے ہماری سمجھ میں آیا ہے وہ لکھ دیا ہے۔ ہاں اگر کسی موقع پر مناظرانہ رنگ میں ان کی عبارت کی تشریح میں طنز اور ظرافت کے طور پر کچھ لکھا گیا ہے تو اس کا انکار نہیں، لیکن بحمداللہ تعالیٰ انصاف کا دامن حتی الوسع ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ والعصمۃ بید اللہ تعالیٰ وحدہٗ۔

ع: یہ اپنی حد نظر ہے کسی کی دید کہاں

جہاں تک انسانی اور امکانی کوشش کا تعلق ہے۔ حوالہ جات کی تصحیح کا پورا التزام کیا گیا ہے۔ معہذا اگر جلد اور صفحہ کا نمبر اور ہندسہ کسی وجہ سے بدل جائے تو غوغا آرائی کے بجائے اس کی تصحیح کر لی جائے۔ دل میں پورا احترام موجود ہے اور ارادہ بھی تھا کہ محدثین کرامؒ، فقہائے عظامؒ اور اربابِ جرح و تعدیل کے ناموں سے پہلے امام علامہ حافظ اور شیخ و حضرت وغیرہ کے توصیفی الفاظ لکھے جائیں، مگر ان کے ناموں کے بار بار آنے سے ہر جگہ ایسا لکھنا ایک دشوار امر ہے۔ لہٰذا اس فعل کو گستاخی پر حمل نہ کیا جائے، بلکہ ایک مجبوری امر سمجھا جائے اور جہاں ہم نے راویوں

کے ناموں میں تصحیف اور غلطی کو درست کیا ہے اور اس پر تاریخی اور ٹھوس واقعات اور شہادتیں نقل کی ہیں۔ ان کو بنظرِ انصاف دیکھا جائے اور جلد بازی سے ہرگز کام نہ لیا جائے۔ اور اگر کسی مقام پر طرزِ استدلال میں کوئی خامی یا کمزوری نظر آئے تو قصور اور لغزش کو مجھ سے منسوب کریں نہ کہ جمہور سلف و خلف سے۔ کیونکہ ؎

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

اس کے علاوہ کہیں کہیں میرے اپنے استنباطات اور اجتہادات بھی ہوں گے۔ ان میں غلطی کا واقع ہونا بہت اغلب ہے۔ اور ان کو یوں سمجھنا چاہیے کہ ع :

"چراغِ راہ ہیں منزل نہیں ہیں"

مسئلہ زیرِ بحث کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کے کسی گوشہ کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا میرے لیے اپنی تہی مائیگی اور بے بضاعتی کے باعث چھوٹا منہ بڑی بات کا مصداق ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس مسئلہ پر ایسے حضرات خامہ فرسائی کرتے جو خود بھی کچھ ہوتے۔ یہاں اپنا حال یہ ہے کہ اس پر کچھ لکھنا ہی اس بڑے اہم اور مُبارک کام کی توہین ہے لیکن جب میں نے اس مسئلہ کے جمع و ترتیب اور تحقیق و تمحیص کے لیے قدم اٹھایا تو صورتِ حال کا یہ نقشہ دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ کوئی اور طاقت ہے جو بے اختیار یہ کام لے رہی ہے ؎

مری طلب بھی اسی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

ضروری التماس : حتی الوسع میں نے اس مسئلہ کے ہر پہلو کو مکمل اور واضح کرنے میں انتہائی کوشش کی ہے لیکن باوجود اس کے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کتاب اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے آخری کتاب ہے۔ یا باوجود اتنی محنت اور کاوش اٹھانے کے یہ کتاب غلطیوں سے بالکل مبرّا ہے کیونکہ اوّل تو انسان کا کوئی کام لغزش اور خطا سے یوں بھی خالی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ خطا اور نسیان انسان کا خمیر ہے۔ اور پھر کام بھی اس بندۂ عاجز کا جو سراپا تقصیر و خطا ہو۔ اس کی نسبت بالکل صحت کا دعویٰ کس طرح ہو سکتا ہے؟ لہٰذا التماس ہے کہ

مجھ کو ہدف ملامت بنانے کے بجائے منصفانہ تنقید کے اصول پر میری راہنمائی کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو غلط بات کی تلافی کرنے اور حق کے تسلیم کرنے میں مجھے کوئی تامل نہ ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ الغرض کتاب کی معنوی صورت ہو یا صوری، بہر حال نگاہ مقصود پر رکھیے اور میری کوتاہیوں پر مجھے مطلع کیجیے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ؎

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ قلب میں اپنی محبت، ارادہ میں قوت، جسم میں صحت اور عمر میں درازی عطا فرمائے اور کتاب و سنت کی پیروی اور حضرات سلف صالحین کی اتباع اور اطاعت کا صحیح جذبہ مرحمت فرمائے اور ہر نیک عمل میں اخلاص و احسان کی توفیق دے۔ اگر یہ مقصد حاصل ہو جائے تو کتاب کا ہر عیب حسن ہے اور اگر یہ نہ ہو تو تمام خوبیاں بے معنی ہیں اور اس فقیر بے زاد اور ماہیِ بے آب اور تہی دستِ علم و عمل کی خدائے برتر و بزرگ سے نہایت اخلاص سے یہ دعا ہے کہ جب تک دنیا میں زندہ رکھنا ہے تو اپنی رضا اور خوشنودی کی توفیق دے۔ اور جب دنیا سے اٹھانا منظور ہو تو خاتمہ بالخیر ہو۔ ؎

خدا سے مانگ جو کچھ مانگنا ہو اے اکبر
یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ط

۲۰ رجب ۱۳۷۴ھ
۱۵ مارچ ۱۹۵۵ء

ابو الزاہد محمد سرفراز خاں صفدر
خطیب جامع گکھڑ ضلع گوجرانوالہ

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہِ الْمُھْتَدِیْنَ وَعَلٰی جَمِیْعِ اُمَّتِہٖ وَالْاَئِمَّۃِ الْمُقَرَّبِیْنَ الَّذِیْنَ بَلَّغُوْا کَلَامَ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَاَحَادِیْثَ رَحْمَۃٍ لِّلْعٰلَمِیْنَ اِلَی النَّاسِ کَافَّۃً لِیَدْخُلُوْا بِھَا جَنّٰتِ الْخُلْدِ وَالْبَسَاتِیْنَ

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصول موضوعہ کے طور پر محل نزاع کو اور اس کے اہم اجزائے بحث کو متعین کر لیا جائے۔ تاکہ مسئلہ زیر بحث کی تہ تک پہنچنے میں دقت پیش نہ آئے۔ سو ہماری تحقیق یہ ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے نہ جہری نمازوں میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کی گنجائش ہے۔ اور نہ سری نمازوں میں۔ مقتدی کا وظیفہ تمام نمازوں میں یہ ہے کہ پوری دلجمعی اور نہایت خاموشی کے ساتھ امام کی قرأۃ کی طرف توجہ کرے، سنے یا نہ سنے، ہمارے اس دعوٰی پر نص قرآنی موجود ہے جس کا معنیٰ اجماع اور اتفاق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرأۃ سے منع کیا گیا ہے۔ اور صحیح وصریح اور مرفوع قولی اور فعلی حدیثیں بھی اس پر موجود ہیں اور حضرات خلفائے راشدین رضؓ اور ان کے علاوہ جمہور صحابہ کرام رضؓ و تابعین رحؒ و اتباع تابعین رحؒ اور محدثین رحؒ و فقہاء رحؒ کی اکثریت بھی ہمارے ساتھ ہے۔ خصوصاً جہری نمازوں میں۔ ان میں ہر ایک امر کی پوری تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

حضرات صحابۂ کرام رضؓ

وہ حضرات صحابۂ کرام رضؓ جو امام کے پیچھے تمام نمازوں میں قرأۃ کے قائل نہ تھے :

حضرات خلفائے راشدین رضؓ، حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ، حضرت جابر بن عبداللہ رضؓ، حضرت زید بن ثابت رضؓ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ، حضرت ابوالدرداء رضؓ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ وغیرہ۔

اور وہ حضرات جو جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل نہ تھے۔ ان میں :

حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت ابوہریرہ رضؓ وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ غرضیکہ امام کے ساتھ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا حضرات صحابہ کرام رضؓ میں شایع نہ تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحؒ لکھتے ہیں کہ

زیراکہ خواندن فاتحہ با امام در صحابہ رضؓ شایع نبود۔ (مصفّٰی جلد ۱ ص ۱۳۱ طبع رحیمیہ دہلی)	چنانچہ امام کے ساتھ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا حضرات صحابہ کرام رضؓ میں شایع نہ تھا۔

حضرات تابعین رحؒ

جو تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل نہ تھے۔ ان میں سے حضرت سوید رحؒ بن غفلہ رضؓ، سعید بن جبیر رحؒ، سعید بن المسیب رحؒ، محمد بن سیرین رحؒ، اسود بن یزید رحؒ، علقمہ بن قیس رحؒ اور حضرت ابراہیم نخعی رحؒ وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔

اور جو اکابر جہری نمازوں میں قائل نہ تھے۔ ان میں حضرت عروۃؒ بن زبیر رضؓ، قاسمؒ بن محمد رضؓ، امام زہری رحؒ، نافع رحؒ بن جبیر رضؓ، حسن بصری رحؒ، مجاہد بن جبر رحؒ، محمد بن کعب القرظی رحؒ، ابوعالیہ ریاحی رحؒ اور امام شعبی رحؒ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

حضرات اتباعِ تابعین رحؒ

جو حضرات مطلقاً امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل نہ تھے۔ ان میں حضرت سفیان بن عیینہ رحؒ، سفیان ثوری رحؒ اور امام اوزاعی رحؒ وغیرہ مشہور و معروف ہیں۔ و علیٰ ہٰذا القیاس۔ امام لیث بن سعد رحؒ اور عبداللہ بن وہب رحؒ مشہور ائمہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اور قرأت خلف الامام کے قائل نہیں ہیں۔ اور امام بخاریؒ کے استاد الاستاد حضرت عبداللہ بن مبارکؒ

جہری نمازوں میں قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ ان کے علاوہ بے شمار اتباع تابعین ہیں، جن کا احصار اور احاطہ اگر محال نہیں تو آسانی کے ساتھ ممکن بھی نہیں ہے۔ ان تمام اکابر کے اقوال و مسالک پورے حوالہ جات کے ساتھ اور ایک ایک سند مع توثیق رواۃ اور دفع شبہات و تصحیح کے ساتھ اپنے موقع پر پوری بسط کے ساتھ بیان ہوں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

حضرات ائمہ اربعہ رح

چونکہ ائمہ اربعہؒ کے پیروکار ہر دور میں اکثریت کے ساتھ رہے ہیں اور آج بھی اکثریت مقلدین حضرات ائمہ اربعہ رح کی ہے۔ اس لیے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم ان حضرات کا مسلک بھی عرض کر دیں۔ اور ان کے بعد ان جلیل القدر ہستیوں کا نظریہ بھی تحریر کر دیں جن کے بارے میں فریق ثانی کو خاص طور پر غلط فہمی ہوئی ہے اور ان ائمہ کرام رح میں سے علی الخصوص حضرت امام ابو حنیفہ رح کا ذکر پہلے مناسب ہے، جو علم، عمر، تقویٰ ورع اور شرفِ تابعیت کے حاصل کرنے میں دوسرے جملہ ائمہؒ سے خاص درجہ اور فضیلت کے مالک تھے۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحؒ (المتوفی ۱۵۰ھ)

امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے مطلقاً قائل نہ تھے۔ نہ جہری نمازوں میں اور نہ سری میں۔ چنانچہ مولانا عبد الرحمٰن صاحب مبارکپوری رح تحریر فرماتے ہیں کہ امام محمد رح موطا میں لکھتے ہیں:

"کہ امام کے پیچھے قرأۃ نہ کرنی چاہیے خواہ امام جہر سے قرأۃ کرتا ہو یا آہستہ، اسی پر عام آثار دلالت کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہ رح[ا] کا مسلک اور مذہب بھی یہی ہے۔"[ا]

[ا] تحفۃ الاحوذی جلد ا ص: ۲۵۸۔ یہ عبارت موطا امام محمدؒ ص ۹۴۔ جامع المسانید جلد ا ص ۴۳۶۔ فتح القدیر جلد ۲، ص ۲۴۱۔ اور روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵ وغیرہ میں بھی نقل کی گئی ہے۔

[۲] امام موصوف سے متعلق بھی نہ جاننے والوں اور متعصب لوگوں نے کیا کیا الزام نہیں لگائے؟ کسی نے ان کو ضعیف کہا اور کسی نے یتیم فی الحدیث کے خطاب سے نوازا۔ لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ علامہ ذہبیؒ (المتوفی ۷۴۸ھ) ان کے بارے میں لکھتے ہیں: کہ وہ الامام الاعظمؒ،

(باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) فقیہ العراق، امام متورع، عالم، عامل، متقی اور کبیرالشان تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد۱ص ۱۵۸)۔ حافظ ابن عبدالبر رح (المتوفی ۴۶۳ھ) فرماتے ہیں کہ امام وکیع رح نے ان سے بہت سی حدیثیں سُنی ہیں۔ (کتاب الانتقاء ۲ صفحہ ۱۵۰) اور لکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے امام موصوف سے روایتیں کیں اور ان کی توثیق وتعریف کی۔ وہ ان سے بہت زیادہ ہیں جنھوں نے (بلاوجہ) ان میں کلام کیا ہے۔ (مختصر کتاب العلم صفحہ ۱۹۴) امام ابن معین رح (المتوفی ۲۳۳ھ) فرماتے ہیں کہ امام موصوف ثقہ تھے۔ وہ صرف اسی حدیث کو بیان کرتے تھے جو ان کو اچھی طرح یاد ہوتی تھی۔ امام عبداللہ بن المبارک رح فرماتے ہیں کہ ہم نے فقہ میں امام ابوحنیفہ رح جیسا کوئی اور نہیں دیکھا۔ امام الجرح والتعدیل یحیٰی بن سعید القطان المتوفی ۱۹۸ھ) فرماتے ہیں ہم خدائے قدوس کی تکذیب نہیں کرتے، ہم نے امام موصوف سے بہتر رائے اور بات کسی کی نہیں سنی۔ (تہذیب التہذیب جلد۱۰ص ۴۴۹)۔ امام شافعی رح فرماتے ہیں کہ تمام لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہ رح کے عیال اور خوشہ چیں ہیں۔ (بغدادی جلد۱۳ ص ۳۴۶ و تہذیب جلد۱۰ ص ۴۴۹)۔ علامہ تاج الدین سبکی رح (المتوفی ۷۷۱ھ) لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کی فقہ بڑی مشکل اور دقیق ہے (طبقات کبریٰ جلد۲ ص ۱۷۴)۔ شاید اسی وجہ سے جاہل اور سطحی قسم کے لوگ ان کی فقہ سے نفرت کرتے ہیں۔ علامہ خطیب بغدادی رح المتوفی ۴۶۳ھ) باوجود امام موصوف پر انتہائی جرح نقل کرنے کے ان کی ذاتی خوبیوں اور علمی قابلیتوں کا انکار نہیں کرسکے اور صاف لکھتے ہیں کہ علم عقائد اور کلام میں لوگ ابوحنیفہ رح کے عیال اور خوشہ چیں ہیں۔ (بغدادی جلد۱۳ ص ۱۶۱)۔ مشہور محدث اسرائیل (المتوفی ۱۶۲ھ) کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہ رح کیا ہی خوب مرد تھے جنھوں نے ہر ایسی حدیث کو اچھی طرح سے یاد کیا جس سے کوئی فقہی مسئلہ مستنبط ہوسکتا ہے۔ اور وہ بڑی احتیاط کرنے والے اور فقہی مسائل پر عبور رکھنے والے تھے (بغدادی جلد۱۳ ص ۳۳۹) امام ابن معین رح فرماتے تھے کہ علماء تو صرف چار ہیں۔ سفیان ثوری رح، ابوحنیفہ رح، مالک رح اور اوزاعی رح (البدایہ والنہایہ، جلد۱۰ ص ۱۱۶) حافظ ابن کثیر رح (المتوفی ۷۷۴ھ)۔ امام موصوف کی ان الفاظ سے تعریف کرتے ہیں۔ الامام، فقیہ العراق، احد ائمۃ الاسلام والسادۃ الاعلام، احد ارکان العلماء، احد الائمۃ الاربعۃ اصحاب المذاہب المتبوعۃ، امام عبداللہ بن داؤد الخریبی رح (المتوفی ۲۱۳ھ) کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں کے لیے مناسب ہے کہ امام ابوحنیفہ رح کے لیے نمازوں میں دعا کیا کریں کیونکہ انھوں نے فقہ اور سنت کو محفوظ رکھا جو لوگوں تک پہنچی۔ امام سفیان ثوری رح اور عبداللہ بن المبارک فرماتے ہیں کہ اپنے زمانہ میں

فائدہ: اس عبارت سے امام محمدؒ (المتوفی ۱۸۹ھ) کا مسلک بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ

(بقیہ حاشیہ) سب روئے زمین پر بسنے والوں سے بڑھ کر فقہ جاننے والے امام ابو حنیفہؒ تھے۔ امام مکی بن ابراہیم رحؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحؒ اعلم اہل الارض تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ صـ ۱۰۷) علامہ ابن خلدونؒ (المتوفی ۸۰۸ھ) لکھتے ہیں کہ امام موصوف علم حدیث کے بڑے مجتہدین میں سے تھے۔ (مقدمہ صـ ۴۴۵) اور لکھتے ہیں کہ فقہ میں ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ کوئی دوسرا ان کی نظیر نہیں ہو سکتا۔ اور ان کے تمام ہم عصر علماء نے ان کی اس فضیلت کا اقرار کیا ہے۔ خاص طور پر امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے۔ (مقدمہ صـ ۴۴۸) علامہ محمد طاہر رحؒ (المتوفی ۹۸۶ھ) لکھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک امام موصوف کی مقبولیت کا کوئی خاص راز اور بھید نہ ہوتا۔ تو امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ) کا ایک نصف حصہ کبھی ان کی تقلید پر مجتمع نہ ہوتا (تکملہ مجمع البحار جلد ۳ ص ۵۴۷) مولانا مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن معین رحؒ، امام شعبہؒ اور سفیان ثوری رحؒ سب ان کی توثیق کرتے ہیں۔ (تحقیق الکلام صـ ۱۴۰) نیز تحریر فرماتے ہیں کہ حدیث (کی قیود اور شرائط) کے بارے میں جتنی تشدد پابندی اور احتیاط امام ابو حنیفہ رحؒ نے کی ہے اور کسی نے اس کا ثبوت نہیں دیا۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۲ صـ ۱۵) ہم نے اپنی کتاب مقام ابی حنیفہ رحؒ میں امام صاحبؒ کے امام حدیث و فقہ ہونے پر باحوالہ سیر حاصل بحث کی ہے اور عناد و تعصب کی وجہ سے جن لوگوں نے ان پر اعتراضات کیے ہیں ان کے ٹھوس جوابات بھی ہم نے اسی کتاب میں عرض کر دیے ہیں۔

نواب صدیق حسن خان صاحبؒ (المتوفی ۱۳۰۷ھ) رقم طراز ہیں:

امام اعظم ابو حنیفہ رحؒ کوفی وی چنانکہ در علم دین منصب امامت دارد۔ ہم چناں در زہد و عبادت امام سالکان است۔ (تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار صـ ۹۳)۔

حضرات اگر امام موصوف میں کوئی خوبی نہ ہوتی۔ تو امت کی اکثریت کے علاوہ امام یحییٰ بن سعید القطانؒ، امام وکیعؒ بن الجراح رحؒ امام ابن معین یحییٰ بن زکریاؒ وغیرہ ایسے امام حدیث کبھی ان کی تقلید نہ کرتے۔ (دیکھیے طائفہ منصورہ) شاید نواب صاحبؒ نے بھی امام اعظم کا خطاب متعصب لوگوں کے توحش کو کم کرنے کے لیے اختیار فرمایا ہے اور علامہ ذہبیؒ بھی ان کی تعریف الامام الاعظم سے شروع کرتے ہیں۔ ع وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ۔

[۱] بعض قاصر اور غیر بالغ نظروں نے امام محمدؒ کی شخصیت کو بھی پہچانا نہیں۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ میرے

(باقی اگلے صفحہ پر)

بھی کسی نماز میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے قائل نہ تھے۔ اور یہی مضمون ان کی کتاب الآثار صلا۲ میں بھی منقول ہے جن لوگوں نے امام محمدؒ کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ وہ سرّی نماز میں مقتدی کے لیے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کو مستحسن سمجھتے تھے۔ وہ غلطی پر ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن ہمام رحؒ (المتوفی ۸۶۱ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ جو لوگ امام محمد رحؒ کا یہ مذہب نقل کرتے ہیں کہ وہ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کو جائز اور مستحسن سمجھتے ہیں وہ لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں۔[له]

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) والد نے تیس ہزار درہم چھوڑے تھے، پندرہ ہزار میں نے نحو، شعر اور ادب کی تعلیم پر صرف کیے اور پندرہ ہزار حدیث اور فقہ کی تعلیم پر (بغدادی جلد ۲ ص ۱۷۳) امام شافعی رحؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امام محمدؒ سے ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر علم حاصل کیا ہے۔ اور اگر وہ نہ ہوتے تو مجھ پر علم کی اتنی راہیں نہ کھلتیں جتنی اب کھلی ہیں۔ اور میں نے امام محمدؒ سے بڑا کوئی شخص کتاب اللہ کا عالم نہیں دیکھا۔ (شذرات الذہب جلد ا ص ۳۲۳) امام ابو عبیدؒ کا بیان ہے کہ میں نے امام محمدؒ سے بڑا کوئی کتاب اللہ کا عالم نہیں دیکھا (بغدادی جلد ۲ صـ۱۷۵) امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جس سے کوئی مشکل مسئلہ پوچھا جائے اور اس کے تیوروں پر بل نہ پڑے ہوں۔ البتہ ہاں محمدؒ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (ابن خلکان جلد ۲ صـ۴۵۴) امام شافعیؒ سے پوچھا گیا کہ آپ نے امام مالکؒ اور امام محمدؒ...... دونوں کی رفاقت کی ہے۔ ان دونوں میں بڑا فقیہ کون ہے؟ فرمایا امام محمدؒ باعتبار نفس کے امام مالکؒ سے بڑے فقیہ ہیں۔ (شذرات الذہب جلد ا صـ۳۲۲) اس سے ملتے جلتے الفاظ یحییٰ بن صالح رحؒ سے بھی منقول ہیں (بغدادی جلد ۲ صـ۱۷۵) امام دارقطنیؒ (المتوفی ۳۸۵ھ) باوجود متعصب ہونے کے امام محمدؒ کو ثقات اور حفاظِ حدیث میں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ یہ حدیث بیس عدد ثقات اور حفاظِ حدیث نے بیان کی ہے جن میں امام محمدؒ بن الحسن الشیبانیؒ، یحییٰ بن سعید القطانؒ، عبد اللہ بن المبارکؒ، عبد الرحمٰن بن مہدیؒ، اور ابن وہبؒ وغیرہ شامل ہیں (بحوالہ نصب الرایہ جلد ا صـ۴۰۹) امام دارقطنیؒ ان کو ثقات اور حفاظ میں پہلے نمبر پر بیان کرتے ہیں۔ ؎

میری انتہائے نگارش یہی ہے
تیرے نام سے ابتدا کر رہا ہوں

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امام محمدؒ سے زیادہ عقلمند کوئی نہیں دیکھا (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ صـ۲۰۴) امام ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ بن الحسنؒ فقیہ اور عالم تھے۔ انھوں نے امام مالکؒ سے بہت حدیثیں لکھی ہیں اور اسی طرح ثوریؒ وغیرہ سے بھی۔ (الانتقاء صـ۱۷۴)

له صاحب در مختار نے لکھا ہے کہ امام محمدؒ کی طرف یہ نسبت کہ وہ امام کے پیچھے (باقی اگلے صفحہ پر)

ان کا قول حضرت امام ابوحنیفہ رحؒ اور امام ابویوسف رحؒ کی طرح ممانعت کا ہے۔ (بحوالہ فتح الملہم جلد ۲ صفحہ ۲۰)
امام ابویوسفؒ (المتوفی ۱۸۳ھ) کا مسلک بھی اس سے واشگاف اور آشکارا ہوگیا ہے کہ وہ بھی جملہ نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) قرأۃ کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ضعیف ہے اور علامہ شامیؒ لکھتے ہیں کہ امام محمدؒ نے کتاب الآثار میں تصریح کی ہے کہ ہم جہری اور سری .... کسی نماز میں امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل نہیں ہیں۔

ودعوی الاحتیاط ممنوعة بل الاحتیاط ترك القرأة لأنه العمل باقوی الدلیلین اھ۔ (رد المختار جلد ۱ ص ۳۶۶)

اور یہ دعوےٰ کہ امام کے پیچھے قرأۃ کرنے میں احتیاط ہے تو یہ دعویٰ ممنوع ہے بلکہ احتیاط ترک قرأۃ میں ہے کیونکہ یہاں دو دلیلوں میں سے قوی تر دلیل پر عمل ہو رہا ہے۔

ؒ امام ابویوسفؒ کے بارے میں فریق ثانی بعض محدثین کا ترکوہ کا جملہ لیے پھرتا ہے۔ حالانکہ بات یہ نہیں ہے۔ امام نسائی رحؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (ضعفاء صغیر ص ۵۷)۔ امام بیہقیؒ کہتے ہیں: وہ ثقہ تھے (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۳۴۷) حافظ عبدالقادر القرشی الحنفی رحؒ (المتوفی ۷۷۵ھ) فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ اور امام ابن معینؒ اور امام علی بن المدینی رحؒ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ ہیں۔ (الجواھر المضیۃ جلد ۲ ص ۲۲۱) علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن معین رحؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اور علی بن مدینیؒ سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امام ابویوسفؒ ثقہ تھے۔ (بغدادی جلد ۱۴ ص ۲۴۳) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام العلامہ اور فقیہ العراقیین لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۶۹) امام مزنی رحؒ کا بیان ہے۔ کہ فقہاء اور اصحاب الرائے میں وہ سب سے زیادہ حدیث کی اتباع کرنے والے تھے (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۸۰) امام ابن قتیبہؒ (المتوفی ۲۷۶ھ)۔ ان کو صاحب سنت اور حافظ لکھتے ہیں۔ (معارف ابن قتیبہؒ ص ۱۷۱) امام ابن معینؒ ان کو صاحب حدیث اور صاحب سنت کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۷) اور ان سے یہ بھی منقول ہے کہ اصحاب رائے میں وہ سب سے زیادہ حدیثیں روایت کرنے والے اور اثبت فی الحدیث تھے۔ (ایضاً) علامہ ابن خلکانؒ (المتوفی ۶۸۱ھ) لکھتے ہیں کہ امام ابویوسفؒ حافظ اور کثیر الحدیث تھے (ابن خلکان جلد ۲ ص ۳۰۳) علامہ عبدالقادرؒ (المتوفی ۶۹۶ھ) لکھتے کہ مشرق سے مغرب تک قضاۃ کی تقرری ان کے سپرد تھی (الجواہر المضیہ جلد ۲ ص ۲۲) امام ابن جریرؒ ابن جوزیؒ اور ابن حبانؒ ان کو عالم حافظ اور فقیہ کہتے ہیں (مقدمہ زیلعی ص ۴۱) اور امام یحییٰؒ بن معینؒ سے امام ابویوسفؒ کے

حضرت امام مالکؒ (المتوفی ۱۷۹ھ) بھی امام کے پیچھے جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے سُورۂ فاتحہ پڑھنے کے حق میں[1] نہ تھے۔ اور سرّی نمازوں میں گو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کی مقتدی کو اجازت دیتے ہیں۔ لیکن مع ہٰذا وجوب کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ[2] سرّی نمازوں میں وجوب قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے۔

(تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷)

(بقیہ حاشیہ) بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا ثقہ صدوق (مناقب کردری جلد ۱ صفحہ ۲۲۰ و مناقب موفق ۱۹۷) امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ مجھے جب طلبِ حدیث کا شوق حاصل ہوا تو سب سے پہلے میں قاضی ابو یوسف کی خدمت میں حاضر ہوا (بغدادی جلد ۱۴ صفحہ ۲۵۵) امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ وہ شیخ اور متقن تھے۔ (لسان المیزان جلد ۶ صفحہ ۳۰۱) علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ وہ حسن الحدیث ہیں (تلخیص المستدرک جلد ۱ صفحہ ۳۷۷) امام ابن عبدالبرؒ امام طبریؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ فقیہ عالم اور حافظ تھے پچاس اور ساٹھ تک حدیثیں وہ ایک مجلس میں یاد کر لیا کرتے تھے اور وہ کثیر الحدیث تھے۔

(الانتقاء صفحہ ۱۷۲)

[1] امام مالکؒ کا یہ مذہب و مسلک ان کی مشہور کتاب موطا صفحہ ۲۹ اور تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۵۰۱ و معالم التنزیل جلد ۳ ص ۶۲۴ و روح المعانی جلد ۹ صفحہ ۱۳۵ و فتح الملہم جلد ۲ صفحہ ۲۷ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ صفحہ ۲۵۵ وغیرہ میں منقول ہے۔

[2] علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، فقیہ الامت، شیخ الاسلام اور امام دار ہجرت تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۱۹۳) امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ اگر امام مالکؒ اور ابن عُیینہؒ نہ ہوتے تو حجاز کا علم ختم ہو جاتا امام ابن وہبؒ فرماتے ہیں اگر امام مالکؒ اور امام لیثؒ نہ ہوتے تو ہم گمراہ ہو جاتے۔ (تذکرہ: ۱ ص ۱۹۴)

امام احمد بن الخلیلؒ فرماتے ہیں۔ میں نے امام اسحاقؒ بن ابراہیم کو کہتے سنا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر امام مالکؒ، امام ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ کسی مسئلہ پر متفق ہو جائیں تو وہی مسئلہ حق اور سنت ہو گا۔ اگرچہ اس میں نص موجود نہ بھی ہو۔ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۱۹۵)

راقم السطور کہتا ہے کہ امام ثوریؒ اور اوزاعیؒ سب نمازوں میں اور امام مالکؒ جہری نمازوں میں ہمارے ساتھ ہیں اور سرّی نمازوں میں بھی وجوب کے قائل نہیں ہیں۔ لہٰذا اس مسئلہ میں یہی مسئلہ حق اور سنت ہے اور نص قرآنی اور احادیث صحیحہ کے صریح حوالے اس کا مستزاد ہیں جو سونے پر سہاگہ ہے۔

حضرت امام شافعیؒ (المتوفی ۲۰۴ھ) امام موصوف کا مسئلہ زیر بحث میں صحیح مسلک کیا تھا؟ اس کے سمجھنے اور نقل کرنے میں بڑے بڑے ائمہ فن نے پیچ در پیچ غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے اور اس کو ایک معمہ اور عقدہ لاینحل بنا دیا ہے۔ کسی نے یہ کہہ دیا کہ امام موصوف سب نمازوں میں قرأۃ الفاتحہ خلف الامام کے وجوبؒ کے قائل تھے۔ اور کسی نے کہہ دیا کہ ان کا قدیم قول یہ ہے کہ جہری

(بقیہ حاشیہ) امام عبدالرحمٰن بن مہدیؒ، امام مالکؒ پر کسی کو ترجیح نہ دیتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صفحہ ۸)

علامہ ابن سعدؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ ثقہ، مامون، ثبت، متورع، فقیہ، عالم اور حجت تھے۔

(تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صفحہ ۸)

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ احد الائمۃ الاربعۃ، اصحاب المذاہب المتبعۃ تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ صفحہ ۱۷۴)

امام ابن عبدالبرؒ نے کتاب الانتقاء میں کم و بیش ۴۶ صفحات میں ان کے فضائل بیان کیے ہیں۔

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ فرماتے ہیں۔ امام دار ہجرت و امامے از ائمہ مذاہب (اتقصار صفحہ ۹۲)

ے علامہ ذہبیؒ ان کی ان الفاظ سے تعریف کرتے ہیں۔ الامام العلم۔ حبر الامت اور ناصر السنۃ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۳۲۹) امام اسحاقؒ بن راہویہؒ فرماتے ہیں۔ مجھ سے امام احمدؒ نے فرمایا۔ آؤ تمہیں ایسا شخص بتاؤں جس کا نظیر اور مثیل تم نے نہیں دیکھا ہوگا۔ پھر مجھے امام موصوف کے پاس لے گئے۔ (بغدادی جلد ۲ صفحہ ۶۹) امام ابو ثورؒ فرماتے ہیں میں نے ان کا نظیر نہیں دیکھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ خود انھوں نے بھی اپنا نظیر نہیں دیکھا ہوگا۔ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۳۲۹)۔ امام ابن عبد الحکم کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ ہر بات میں حجت ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۹ صفحہ ۳۰)

امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ احد العلماء، ثقہ اور مامون تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ صفحہ ۳۱) حافظ ابن کثیرؒ نے ان کی ایسے شاندار الفاظ اور عبارات سے تعریف کی اور عقیدت کے پھول برسائے ہیں جن کے واقعی امام موصوف اہل اور مستحق ہیں۔ (دیکھیے البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ صفحہ ۲۵۱) علامہ ابن عبدالبرؒ نے ابن عبدالحکمؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ صاحب سنت وافر اہل فضل و فصاحت اور مضبوط عقل کے مالک تھے۔

(الانتقاء صفحہ ۷۳)

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں۔ امام شافعیؒ ہم افضل وقت وہم اعلم عہد وہم حجۃ الائمہ وہم مقدم الامۃ۔ (اتقصار صفحہ ۹۳) ے یہ قول علامہ بدر الدین عینیؒ نے عمدۃ القاری جلد ۳ صفحہ ۶۴ میں اور اسی طرح دوسرے ائمہ نے بھی نقل کیا ہے۔

نمازوں میں امام کے پیچھے قرآت نہ کی جائے۔ اور قولِ جدید یہ ہے کہ جہری ہوں یا سرّی، تمام نمازوں میں قرأۃ واجب[1] ہے۔ اور کسی نے یہ کہہ دیا کہ امام موصوف کے دو قول ہیں۔ ایک جہری نمازوں میں ممانعت کا اور دوسرا اجازت[2] کا۔ لیکن حقیقت ان تمام باتوں کے بالکل برعکس ہے۔

امام موفق الدین[3] ابنِ قدامہ الحنبلیؒ (المتوفی ۶۲۰ھ) تحریر فرماتے ہیں:

وجملة ذٰلك ان القرأة غير واجبة على المأموم فيما جهر به الامام ولا فيما اسر به نص عليه احمد في رواية الجماعة وبذلك قال الزهريؒ والثوريؒ وابن عيينهؒ ومالكؒ وابو حنيفةؒ واسحٰقؒ

اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مقتدی پر قرآت واجب نہیں نہ جہری نمازوں میں اور نہ سرّی میں امام احمدؒ بن حنبلؒ نے صراحت کے ساتھ یہ بیان کیا ہے جیسا کہ علماء کی ایک جماعت نے ان سے نقل کیا ہے اور امام زہریؒ، ثوریؒ، سفیان بن عیینہؒ، مالکؒ، ابو حنیفہؒ اور

---

[1] یہ قول امام بیہقیؒ نے (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۴) میں اور دوسرے اکابر نے بھی نقل کیا ہے جن میں حافظ ابن کثیر بھی ہیں۔ (تفسیر جلد ۴ ص ۲۸۳)

[2] یہ قول امام مزنیؒ (المتوفی ۲۶۴ھ) نے مختصر مزنی جلد ۱ ص ۶ میں امام بیہقیؒ نے (کتاب القرأۃ ص ۱۶) میں اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے (تنوع العبادات ص ۳۵) میں نقل کیا ہے۔

[3] آپ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک پر تھے اور سیدنا شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے تلامذہ میں تھے۔ حدیث، فقہ، تفسیر اور طبقاتِ رواۃ کے متبحر اور بے مثل عالم تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب یوں ہے۔ عبد اللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ الدمشقی جو الفقیہ، الزاہد، الامام، شیخ الاسلام اور احد الاعلام تھے۔ علامہ ابن نجارؒ کا بیان ہے کہ وہ امام الحنابلہ، ثقہ، حجت، نبیل، غزیر الفضل، کامل العقل اور شدید التثبت تھے۔ امام ابو شامہؒ کہتے ہیں کہ وہ شیخ الحنابلہ، امام من ائمۃ المسلمین، علم من اعلام الدین فی العلم والعمل تھے۔ محدث ضیاءؒ لکھتے ہیں کہ وہ علوم قرآن و حدیث، فقہ و علم خلاف کے امام اور یکتائے روزگار تھے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ کے بعد ملک شام میں ان سے بڑا کوئی امام داخل نہیں ہوا۔ علامہ ذہبیؒ نے ان کے اوصاف حمیدہ پر دو مستقل جلدیں لکھی ہیں۔ (ترجمۃ الشیخ فی بدء المغنی ص ۲، ۳، ۴) علامہ عز الدین بن عبد السلامؒ (المتوفی ۶۶۰ھ) فرماتے ہیں۔ میں نے اسلام میں دو کتابوں کی مثال نہیں دیکھی۔ ایک محلّٰی (علامہ ابن حزمؒ (المتوفی ۴۵۶ھ)

وقال الشافعیؒ وداؤدؒ لعموم قوله علیه السلام لا صلوٰۃ لمن لا یقرأ بفاتحۃ الکتاب غیر انه نخص فی حال الجهر بالامر بالانصات ففیما عداه یبقٰی علی العموم۔ (انتہی بلفظہ) (مغنی ابن قدامہ جلد اول صفحہ)

اسحاقؒ اسی کے قائل ہیں۔ امام شافعیؒ اور داؤدؒ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث کہ جس شخص نے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہ ہوگی۔ عام ہے مگر جہری نمازیں اس حدیث سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان میں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے اور جہری نمازوں کے علاوہ یہ حدیث اپنے عموم پر باقی رہے گی۔

اس عبارت سے یہ امر بالکل عیاں ہو جاتا ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کا پڑھنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ نص قرآنی اور حدیث صحیح اَنْصِتُوا کے خلاف ہے۔

فائدہ۔ اس عبارت سے جس طرح امام شافعیؒ کا مسلک واضح طور پہ معلوم ہو جاتا ہے اسی طرح امام داؤد ظاہری کا مسلک بھی نمایاں ہو جاتا ہے کہ وہ بھی جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قراۃ کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے فاتحۃ الکتاب کا پڑھنا انصات مامور بہ کے منافی ہے۔ ممکن ہے کسی صاحب کو یہ شبہ پیدا ہو کہ ہو سکتا ہے امام ابن قدامہؒ ہی کو امام شافعیؒ کے مسلک کے سمجھنے اور نقل کرنے میں غلطی واقع ہوئی ہو۔ اس لیے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود امام شافعی کی تحریروں سے اس مسئلہ کو حل

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) اور دوسری مغنی ابن قدامہ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ صفحہ ۳۲۵ ولسان المیزان جلد ۴ صفحہ ۲۰۱) حافظ تقی الدین علی بن عبد الکافیؒ (المتوفی ۷۵۶ھ) لکھتے ہیں کہ مغنی ابن قدامہ فقہ حنبلی کی بلند پایہ اور معتمد کتاب ہے (شفاء السقام ۴ صفحہ ۲۹) اور حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ وہ شیخ الاسلام تھے۔ جہمیہ اور معطلہ کے بغیر باقی تمام فرقے ان کی مقبولیت، تعظیم اور امامت پر متفق ہیں (اجتماع الجیوش الاسلامیۃ ص ۶۹ طبع امرتسر)

لہ امام داؤدؒ بن علیؒ (المتوفی ۲۷۰ھ) علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ اصحاب ظاہر کے امام، متورع، عابد اور زاہد تھے (بغدادی جلد ۸ ص ۳۶۹)

علامہ ذہبی رحمہ اللہ تعالیٰ ان کی ان الفاظ سے تعریف کرتے ہیں۔ الحافظ، الفقیہ، المجتہد اور فقیہہ اہل الظاہر۔

(تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ صفحہ ۱۳۶)

کردیں۔ امام موصوف تحریر فرماتے ہیں :

والعمد فی ترک القرأة بام القرآن والخطأ سواء فی ان لا تجزئ رکعة الا بها او بشئ معها الا ما یذکر من المأموم انشاء اللہ تعالیٰ۔
(کتاب الام جلد ۱ ص ۹۰)

سورۂ فاتحہ کا دیدہ دانستہ ترک کرنا اور بھول کر ترک کرنا دونوں کا حکم ایک ہے کہ کوئی رکعت سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی پڑھنے کے بغیر جائز نہیں ہو سکتی۔ ہاں مگر مقتدی کا حکم آگے ذکر کیا جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔

امام موصوف کی اس عبارت کو بار بار پڑھئے اور ملاحظہ کیجئے کہ مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کو کیوں مستثنیٰ قرار دیتے ہیں ؟ اگر مقتدی کے لیے بھی سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ویسا ہی ضروری ہے جیسا کہ امام اور منفرد کے لیے تو ان کی اس تفریق کا کیا مطلب ہے ؟ پھر آگے تحریر فرماتے ہیں :

فواجب علی من صلی منفردا او اماما ان یقرأ بام القرآن فی کل رکعة لا یجزئه غیرها واحب ان یقرأ معها شیئا آیة او اکثر وساذکر المأموم انشاء اللہ تعالیٰ۔
(کتاب الام جلد ۱ ص ۹۳)

سو منفرد اور امام پر واجب ہے کہ وہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھیں اس کے علاوہ کوئی اور سورۃ کفایت نہیں کر سکتی اور میں اس کو بھی زیادہ پسند کرتا ہوں کہ سورۂ فاتحہ کے علاوہ کچھ اور بھی پڑھیں ایک آیت ہو یا اس سے زیادہ۔ اور ہاں مقتدی کا حکم آگے بیان کروں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس عبارت میں بھی امام موصوف، امام اور منفرد کی تصریح کرتے ہوئے ان کا یہ فریضہ اور وظیفہ بتلاتے ہیں کہ ان کو نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنی ضروری ہے۔ مگر یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ مقتدی کا وظیفہ اور ڈیوٹی کچھ اور ہی ہے۔ جس پر ہر نماز اور ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ میں انشاء اللہ العزیز خود اس کا حکم بیان کروں گا۔ وہ کونسا حکم ہے جس کا دو مرتبہ وعدہ کیا ہے ؟ تحریر فرماتے ہیں۔

ونحن نقول کل صلوٰة صلیت خلف الامام والامام یقرأ قرأة لا

اور ہم کہتے ہیں کہ ہر وہ نماز جو امام کے پیچھے پڑھی جائے اور امام ایسی قرأة کرتا ہو جو سنی نہ جاتی ہو

يسمع فيها قراءة فيها۔ | تو مقتدی ایسی نماز میں قراۃ کرلے۔

(کتاب الام جلد ۷، ص ۱۵۳)

امام شافعیؒ کی یہ عبارت اس بات کو واشگاف کرتی ہے کہ مقتدی کو جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا درست نہیں ہے اور نہ واجب ہے۔ بلکہ مقتدی صرف ان نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھ سکتا ہے جن میں امام کی قراۃ نہ سنی جاسکتی ہو اور وہ سری نماز ہے۔ اسی لیے انھوں نے قراۃ لا یسمع ارشاد فرماکر جہری اور سری نمازوں میں مقتدی کا وظیفہ متعین کردیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص اس کا دعوٰی کرے کہ حضرت امام شافعیؒ تمام نمازوں میں مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کے وجوب کے قائل ہیں تو وہ نہ صرف یہ کہ خوش فہمی اور غلطی کا شکار ہے بلکہ اس کو تعدیل مزاج کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔

فائدہ: راقم الحروف کہتا ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کی تعیین میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے اور قول قدیم وجدید کا جو جھگڑا چل نکلا ہے۔ اس کی اصل وجہ ہی کچھ اور ہے۔ وہ یہ کہ امام الحرمینؒ[1] (المتوفی ۴۷۸ھ) وغیرہ نے غلطی سے کتاب الام کو امام شافعیؒ کی کتب قدیمہ میں شامل سمجھ لیا ہے۔ اور دوسرے ائمہ نے بھی اس امام عالی مقام کی جلالتِ شان کی وجہ سے اس بات پر بھروسہ اور اعتماد کر لیا ہے۔ حالانکہ یہ ان کی غلطی ہے اور یہ سارا جھگڑا ہی اس مفروض پر مبنی ہے۔ ہم اختصار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کی اس تاریخی غلطی پر دو تاریخی شہادتیں نقل کرتے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

ثم انتقل منها الى مصر فاقام بها الى ان مات فى هذه السنة (سنة ۲۰۴ھ) وصنف كتاب الام وهو من كتبه الجديدة لانها من رواية الربيع بن سليمانؒ وهو مصرى	پھر حضرت امام شافعیؒ بغداد سے مصر کی طرف روانہ ہوئے اور وہیں اقامت پذیر ہوئے حتی کہ ۲۰۴ھ میں اسی جگہ ان کی وفات ہوئی اور مصر میں ہی انھوں نے کتاب الام تصنیف کی ہے اور وہ ان کی جدید کتابوں میں ہے۔

---

[1] ان کا نام عبدالملک، ابوالمعالی کنیت، اور الجوینی (ان کے والد ابو محمد عبداللہ الجوینیؒ کی طرف) نسبت ہے۔ یہ امام غزالیؒ (المتوفی ۵۰۵ھ) کے استاد تھے۔ حدیث، فقہ اور اصول اور دیگر علوم اور فنون میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اپنے زمانہ میں علماء شوافع کے سربراہ تھے۔ حرم مکہ اور حرم مدینہ میں ۶ عرصہ دراز تک علوم اسلامیہ کی تعلیم دیتے رہے۔ اس لیے امام الحرمین کے لقب سے مشہور ہوئے۔ (الجواہر المضیہ جلد ۲ ص ۴۳۷-۴۳۶ و فوائد البہیہ ص ۲۴۶ طبع مصر)

وقد زعم امام الحرمین وغیرہ انھا من القدیم وھذا بعید وعجیب من مثلہ ۔ (البدایہ والنھایۃ جلد ۱۰ ص ۲۵۲)

کیونکہ اس کے راوی ربیع بن سلیمانؒ (المتوفی ۲۷۰ھ) ہیں جو مصری تھے اور امام الحرمینؒ وغیرہ نے یہ خیال کیا ہے کہ کتاب الام کتب قدیمہ میں ہے ۔ لیکن یہ امام الحرمینؒ ایسے امام سے بڑی ہی بعید اور نرالی بات ہے ۔

حافظ موصوف کی یہ عبارت بڑی واضح اور صاف ہے کہ امام الحرمینؒ وغیرہ کا یہ دعوٰی کرنا کہ یہ کتاب یعنی کتاب الام ، امام شافعیؒ کی قدیم کتابوں میں شامل ہے نہ صرف تاریخی لحاظ سے باطل اور مردود ہے بلکہ اس کے مدعی صواب سے بڑے دور اور بڑی عجیب بات کے مرتکب ہوئے ہیں ۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں بنا بر اس مفروض کے اجازت کا قول امام شافعیؒ کا قول جدید قرار دیا ہے لیکن چونکہ البدایہ والنہایہ تفسیر کے بعد کی تصنیف ہے جیسا کہ خود انہوں نے البدایہ میں اس کی تصریح کی ہے ۔ اس لیے ان کی اس جدید تاریخی تحقیق کے بعد تفسیر کا حوالہ قابل التفات نہیں ہے ۔

دوسری شہادت امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ (المتوفی ۹۱۱ھ) کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

ثم خرج الی مصر وصنف بھا کتبہ الجدیدۃ کالام الخ (حسن المحاضرہ جلد ۱ ص ۱۲۲)

پھر حضرت امام شافعیؒ مصر کی طرف روانہ ہوئے ۔ اور وہاں کتب جدیدہ تصنیف کیں جن میں کتاب الام بھی ہے

اِن تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوگیا کہ کتاب الام حضرت امام شافعی رح کی کتب جدیدۃ میں ہے ۔ اور امام کے پیچھے مقتدی کا سورۃ فاتحہ کو جہری نمازوں میں ترک کرنا ان کا قول جدید ہے نہ کہ قول قدیم ۔

مصنف خیر الکلام نے ان ٹھوس حوالہ جات سے اپنے جواب کے سلسلہ میں جو مخلص تلاش کیا وہ یہ ہے :

(۱) کہ امام شافعیؒ مصر میں پانچ سال رہے ۔ ہو سکتا ہے کہ آپ نے مصر جا کر پہلے یہی فتوٰی دیا ہو مگر بعد میں اس سے رجوع کیا ہو جیسا کہ ہم نے انور شاہ صاحبؒ کی عبارت میں نقل کیا ہے کہ امام شافعیؒ نے وفات سے دو سال قبل مقتدی کو جہری نمازیں قرأۃ کے روکنے سے رجوع کیا ہے بس محض اس عبارت کا مصری کتاب میں ہونا آخری قول ہونے کی کیسے دلیل بن سکتا ہے بلکہ اس جگہ تصریح کی ضرورت ہے ۔ اھ (خیر الکلام ص ۲۴)

(۲) مختصر مزنی امام شافعیؒ کے ان مسائل کا مجموعہ ہے جو مصر میں بیان فرمائے اور اختیار کیے ہیں ۔

(ضحی الاسلام جلد ۲ صہ۹۱) بلکہ مزنی رح امام شافعی رح کے مصری شاگردوں سے ہے۔ (ضحی الاسلام جلد ۲ صہ۲۲۲)

(خیر الکلام صہ۲۰)

(۳) امام بیہقی رح فرماتے ہیں کہ امام شافعی رح کا صحیح قول یہی ہے کہ قرأت واجب ہے امام جہر کرے یا نہ کرے۔ (خیر الکلام صہ۲۱)

(۴) امام ترمذی رح نے لکھا ہے کہ اگر فاتحہ نہ پڑھی جائے تو نماز کسی کام کی نہیں رہتی اکیلا ہو یا امام کے پیچھے ہو امام شافعی رح اور امام اسحاق رح اور ان کے علاوہ اور علماء کا یہی مسلک ہے۔ (خیر الکلام صہ۲۲)

(۵) امام ابن عبدالبر رح فرماتے ہیں کہ فاتحہ خلف الامام کے واجب ہونے کے مندرجہ ذیل ائمہ قائل ہیں امام اوزاعی رح، امام لیث رح بن سعد رح امام شافعی رح جب مصر میں گئے اور یہی ان کے اکثر شاگردوں کا مذہب ہے۔ ان سے امام مزنی رح اور امام بویطی رح ہیں امام ابوثور رح کا بھی یہی مذہب ہے۔

(تمہید ابن عبدالبر رح۔ تحقیق) خیر الکلام صہ۲۳

(۶) کتاب الام کی پہلی اور دوسری عبارت میں تصریح نہیں کہ مقتدی پر جہری نمازوں میں فاتحہ واجب نہیں منفرد اور امام کے متعلق دو احتمال ہیں ایک یہ کہ ان پر صرف فاتحہ واجب ہو۔ دوسرا یہ کہ ان پر فاتحہ اور مازاد دونوں واجب ہوں مگر مقتدی کے بارے میں دو احتمال نہیں صرف ایک ہی احتمال ہے۔ (محصلہ خیر الکلام ۲۴، ۲۵)

(۷) کتاب الام کی تیسری عبارت میں فاتحہ کا ذکر نہیں مطلق قرأۃ کا ذکر ہے۔ (محصلہ خیر الکلام صہ۲۶)

(۸) البدایہ والنہایہ تفسیر سے پہلے کی کتاب ہے۔ کیونکہ تفسیر میں دو جگہ اس کا حوالہ دیا ہے۔

(محصلہ خیر الکلام صہ۲۶، ۲۷)

(۹) حافظ ابن کثیر رح لکھتے ہیں کہ امام شافعی رح کا دوسرا قول یہ ہے کہ مقتدی جہری نماز میں بھی پڑھے اسی طرح امام لیث رح، امام اوزاعی رح، امام ابن عون رح امام مکحول رح اور امام ابوثور رح سے بھی مروی ہے۔

(جلد ۱ صہ۶) (خیر الکلام صہ۲۷)

(۱۰) معالم التنزیل میں ہے کہ ایک جماعت کے نزدیک قرأۃ واجب ہے خواہ امام قرأۃ بلند آواز سے پڑھ رہا ہو یا آہستہ یہ قول حضرت عمر رض، حضرت عثمان رض، حضرت علی رض، حضرت ابن عباس رض اور معاذ رض سے مروی ہے۔ امام اوزاعی رح اور امام شافعی رح کا بھی یہی قول ہے۔ (خیر الکلام صہ۲۷، ۲۸)

(۱۱) علامہ ابن قدامہ رح ایک جگہ یہ نقل فرماتے ہیں کہ امام کے لیے فاتحہ کے بعد سکتہ کرنا مستحب ہے تاکہ اس

میں آرام کرے اور مقتدی فاتحہ پڑھ لے تاکہ مقتدی کی طرف سے امام کے ساتھ ساتھ پڑھنے سے منازعت واقع نہ ہو۔ امام اوزاعی رح، امام شافعی رح، امام اسحٰق کا یہی مذہب ہے۔ (خیر الکلام ص ۲۸)

الجواب: ہم بفضلہٖ تعالیٰ خیر الکلام کے ترتیب وار جوابات عرض کرتے ہیں غور فرمائیں۔

(۱) ٹھوس تاریخی حوالوں اور شہادتوں کو رد کرنے کے لیے صرف ہو سکتا ہے۔۔۔۔ الخ

کوئی جواب نہیں۔ مصنف خیر الکلام پر اخلاقی طور پر لازم تھا کہ وہ صراحت کے ساتھ دو تاریخی اور ٹھوس حوالوں کے ساتھ یہ نقل فرماتے کہ فلاں کتاب حضرت امام شافعیؒ نے کتاب الام کے بعد لکھی ہے اور اس میں یہ لکھا ہے کہ مقتدی پر سورہ فاتحہ یا قرأۃ کا پڑھنا واجب ہے اور عبارت یہ ہے۔ جب وہ ایسا نہیں کر سکے تو یقین کامل رکھیں کہ کتاب الام کی صریح عبارتوں کا جواب تاہنوز کوئی نہیں ہوا۔ رہا حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کا حوالہ تو وہ مؤلف خیر الکلام کو چنداں مفید نہیں ہے کیونکہ اس میں صرف اس قدر ہے کہ امام شافعیؒ نے وفات سے دو سال پہلے مقتدی کے لیے جہری نمازوں میں ترکِ قرأۃ سے رجوع کیا ہے۔ اس سے وجوب کیسے ثابت ہوا؟ چنانچہ خود مؤلف خیر الکلام حضرت شاہ صاحبؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ پھر مجھے علم نہیں کہ امام شافعی رح نے جہری میں وجوب پسند کیا جیسے کہ شافعیہ رح کا مسلک ہے یا صرف استحباب کو۔ (فیض الباری جلد ۲ ص ۲۷۱) اور فصل الخطاب میں فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں امام شافعیؒ بھی جہری نمازوں میں صرف پڑھنے کو پسند کرتے ہیں فرض نہیں سمجھتے۔ (خیر الکلام ص ۲۰) باقی رہا فیض الباری جلد ۱ ص ۳۵۳ کا حوالہ جس میں لکھا ہے کہ امام شافعیؒ وفات سے دو سال پہلے مقتدی پر قرأۃ کے وجوب کے قائل ہو گئے تھے۔ (محصلہ) تو ظن غالب یہ ہے کہ یہ مترجم صاحب کی غلطی ہے جنھوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کی املائی تقریر ول کو اپنی صوابدید کے مطابق عربی کا جامہ پہنایا ہے ورنہ یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ جلد اول میں وجوب کا حکم بیان فرمائیں اور جلد ثانی میں فرمائیں کہ مجھے کوئی علم نہیں کہ آیا وہ وجوب کے قائل تھے یا استحباب کے؟ اور فصل الخطاب میں یہ فیصلہ صادر فرمائیں کہ امام شافعیؒ جہری نمازوں میں صرف پڑھنے کو پسند کرتے تھے فرض نہیں سمجھتے تھے۔ غور فرمائیے کہ تحقیقی طور پر اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ اور خود مولانا سید انور شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

ونقل ابن تیمیہؒ الاجماع عنہ یدل علیٰ ان وجوب القرأۃ فی الجھریۃ خلاف الاجماع او لم یذھب الیہ احد من اھل الاسلام۔ اھ

کہ حافظ ابن تیمیہؒ نے امام احمد بن حنبلؒ سے اجماع نقل کیا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جہری نمازوں میں وجوب قرأۃ خلاف اجماع ہے یا اہلِ اسلام میں سے اس کا ایک شخص بھی قائل نہیں ہے۔ (فیض الباری جلد ۲ ص ۲۷۲)

پھر کیونکر سمجھ لیا جائے کہ ان کے نزدیک امام شافعیؒ جہری نمازوں میں وجوب قرأۃ کے قائل ہیں اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ واقعی امام شافعیؒ وفات سے دو سال پہلے مقتدی کے لیے وجوب قرأۃ کے قائل ہو گئے تھے تب بھی ایک بات نہایت ہی قابلِ توجہ ہے وہ یہ کہ تقریباً پچاس سال تک جو نمازیں حضرت امام شافعیؒ نے پڑھی ہیں جن میں وہ جہری نمازوں میں قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے کیا ان کی وہ نمازیں درست اور صحیح ہیں یا نہیں؟ اور کیا صرف دوسرے حضرات کی نمازیں ہی جن میں قرأۃ فاتحہ نہ کی گئی ہو باطل کالعدم اور بیکار ہیں یا حضرت امام شافعیؒ کی ان نمازوں کا بھی یہی حشر ہے؟ اگر کسی اور کی تحقیق بھی دیانتاً یہی ہو جو وفات سے دو سال قبل تک حضرت امام شافعیؒ کی تھی تو فرمائیے کہ اس کی نماز کیوں کالعدم، بیکار اور باطل ہو گی؟ یا یہ چورن اور امرت دھارا صرف حنفیوں کے لیے ریزرو اور وقف ہے۔ کیا خوب؟:

ابھی کیا ہے ابھی تو ابتدا ہے دیکھتے جاؤ
ہمارے حال پر یاروں کے احسان اور بھی ہونگے

(۲) چونکہ باقرار صاحبِ خیر الکلام حضرت امام شافعیؒ مصر میں پانچ سال رہے تھے اس لیے اگر مختصر مزنی ان کے مصری مسائل کا مجموعہ بھی ہو اور مزنیؒ ان کے مصری شاگرد بھی ہوں تب بھی اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ یہ مجموعہ کتاب الام سے بھی بعد کا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ یہ پہلے کا ہو اور کتاب الام ان کی صحیح طور سے کتب جدیدہ میں ہو اور امام مزنیؒ نے باوجود مصری ہونے کے مختصر مزنی کی تدوین کتاب الام سے پہلے کی ہو۔ یہ جواب صحیح ہونے کے علاوہ مصنف خیر الکلام کی اپنی پسند کا بھی ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے۔ وہ یہ کہ اگرچہ امام مزنیؒ اور امام بویطیؒ اصحاب شافعیؒ اور بڑے پائے کے محدث اور فقیہ تھے۔

لیکن ربیع بن سلیمان المرادی رح (المتوفی ۲۷۰ھ) کو ان دونوں پر ترجیح ہے۔ چنانچہ امام خلیلی رح فرماتے ہیں کہ

ثقہ متفق علیہ والمزنی مع جلالتہ استعان علی ما فاتہ عن الشافعی بکتاب الربیع وقال مسلمۃ من کبار اصحاب الشافعی رح۔ (۱ھ)

(تہذیب التہذیب جلد ۳، ص ۲۴۶)

ربیع بن سلیمان ثقہ اور متفق علیہ ہیں اور امام مزنی رحمتہ باوجود جلالت شان کے جو مسائل امام شافعی رح کے ان سے چھوٹ گئے تھے ان میں ربیع کی کتاب سے استعانت کی ہے اور مسلمہ فرماتے ہیں کہ ربیع امام شافعی رح کے بڑے اصحاب میں شمار ہوتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام مزنی کو حضرت امام شافعی رح کے تمام مسائل معلوم نہ تھے بلکہ ان سے کچھ چھوٹ بھی گئے تھے اور امام شافعی رح کے مسائل میں وہ ربیع بن سلیمان رح کے خوشہ چیں تھے۔ پھر کیوں نہ ہو کہ حضرت امام شافعی رح کے مسائل میں امام ربیع بن سلیمان رح پر اعتماد کیا جاتے جن پر خود امام مزنی رح نے اعتماد کیا ہے۔ اور مولیٰ احمد بن مصطفیٰ المعروف بطاش کبریٰ زادہ رح (المتوفی ۹۶۲ھ) لکھتے ہیں کہ

الربیع بن سلیمان — الثقۃ الثبت فیما یرویہ حتی رجحوا روایتہ عند تعارض المزنی مع علو قدر المزنی علماً ودیناً وجلالۃ۔ ۱ھ

(مفتاح السعادۃ ومصباح السیادۃ جلد ۲ ص ۱۶۲ طبع حیدرآباد دکن)

ربیع بن سلیمان رح — جو کچھ بھی روایت کرتے ہیں اس میں وہ ثقہ اور ثبت ہیں حتی کہ محدثین رح نے ان کی روایت کو مزنی کی روایت پر جب کہ دونوں کی روایت کا تعارض ہو ترجیح دی ہے۔ حالانکہ امام مزنی علم اور دین اور جلالت میں بلند مرتبہ تھے۔

اس سے بھی ثابت ہوا کہ جب امام ربیع اور امام مزنی رح کی روایت میں تعارض ہو تو محدثین کرام کے نزدیک امام ربیع بن سلیمان رح کی روایت کو ترجیح ہوتی ہے۔ اور امام ابوالحسین رح فرماتے ہیں کہ

البویطی کان یقول الربیع اثبت فی

امام بویطی فرماتے تھے کہ امام شافعی رح سے روایت

الشافعی رحمہ منی اھ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۲۴۶) کرنے میں ربیعؒ مجھ سے بھی زیادہ اثبت ہیں۔

قطع نظر کتاب الام اور مختصر مزنی اور مختصر بویطی کے تقدم و تاخر کے خود امام بویطیؒ اور محدثینؒ کے فیصلے کی رو سے امام ربیع بن سلیمانؒ کی روایت کو تاریخی اور صریح حوالوں کے پیش نظر ترجیح ہے۔ اس لیے اگر بالفرض تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کتاب الام پہلے کی ہے اور مختصر مزنیؒ اور مختصر بویطیؒ بعد کی ہیں تب بھی ترجیح امام ربیعؒ بن سلیمان ہی کی روایت کو ہوگی جو کتاب الامؒ کے اور امام شافعیؒ کے مسائل کے راوی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بقول حافظ ابن تیمیہؒ حذاق اصحاب الشافعیؒ مثلاً امام رازیؒ اور ابن عبد السلامؒ وغیرہ نے اسی پر عمل کیا ہے کہ جہری نمازوں میں قرآۃ خلف الامام درست نہیں۔ (عبارت آگے آرہی ہے)

(۳و۴و۵) کا جواب یہ ہے کہ یہ سب حوالے اس امر پر مبنی ہیں کہ مختصر مزنی اور مختصر بویطیؒ (جو امام یوسف بن یحییٰ البویطی (المتوفی ۲۳۱ھ) کی تالیف ہے) کے حوالوں کو غلطی سے ربیع بن سلیمانؒ کی روایت پر ترجیح دی گئی ہے اور اسی غلطی کے نتیجہ میں حضرت امام شافعیؒ کو وجوب قرآۃ خلف الامام کا قائل گردانا گیا ہے اور مصنف خیر الکلام نے تحقیق الکلام کے حوالہ سے بحوالہ تمہید ابن عبد البرؒ امام شافعیؒ سے وجوب کا جو قول نقل کیا ہے اس میں خصوصیت سے یہ درج ہے کہ امام شافعی رحمہ کے اکثر شاگردوں کا یہی مذہب ہے جن میں امام مزنی رحمہ اور بویطیؒ بھی ہیں۔ بس یہیں سے اس غلطی کی بنیاد قائم ہوتی ہے کہ امام مزنیؒ اور امام بویطیؒ کے آئینہ میں حضرت امام شافعیؒ کا مذہب اور مسلک متعین کرنے کی شدید غلطی کی گئی ہے۔

اور اسی پیچ در پیچ غلطیاں مرتب ہوتی ہیں؛ ؎

سخن شناس نہ دلبرا خطا ایں جا است

(۶) حضرت امام شافعیؒ تو صاف طور پر یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ کا جان بوجھ کر ترک کرنا یا خطاءً ترک کرنا دونوں اس حکم میں برابر ہیں کہ کوئی رکعت سورہ فاتحہ یا سورہ فاتحہ اور کچھ دیگر حصۂ قرآن کے بغیر جائز نہیں۔ ہاں مگر مقتدی کا حکم الگ ہے جو آگے بیان ہوگا اور دوسری عبارت میں تصریح کرتے ہیں کہ امام و منفرد دونوں پر ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ

واجب ہے اس کے بغیر کوئی اور سورت جائز نہیں اور اس سے زیادہ ایک آیت یا اکثر پڑھیں تو مجھے پسند ہے۔ ہاں مگر مقتدی کا حکم کچھ اور ہے اور میں خود اس کو بیان کروں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ ان عبارتوں میں تو وہ صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ امام اور منفرد دونوں پر واجب ہے۔ اور اس سے مازاد واجب نہیں بلکہ بہتر ہے جب سورۂ فاتحہ اور مازاد کا الگ الگ حکم بیان فرما رہے ہیں کہ ایک واجب ہے اور دوسرا مستحب (واجبتہ) تو پھر یہ احتمال حضرت امام شافعیؒ کی عبارت میں کہاں سے پیدا ہوا۔ دوسرا یہ کہ ان پر فاتحہ اور مازاد دونوں واجب ہوں۔ اھ۔ (خیر الکلام: ص ۲۵) اسی کو کہتے ہیں توجیہ القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہ۔ اور پھر مصنف خیر الکلام کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ کتاب الام سے حضرت امام شافعیؒ کا وہ حوالہ جس کا دو دفعہ انھوں نے وعدہ فرمایا ہے نکال کر بقید حروف بتاتے کہ یہ لو امام شافعیؒ کی معہود عبارت یہ ہے جس میں ہماری خانہ ساز توجیہ کی تصدیق ہو رہی ہے۔ مصنف خیر الکلام کو معلوم ہونا چاہیے کہ خوامخواہ کچھ لکھ دینے سے جواب نہیں ہو جایا کرتا۔ حضرت امام شافعیؒ کی یہ دونوں عبارتیں سورۂ فاتحہ اور ہر رکعت اور امام و منفرد کے واضح الفاظ کے ساتھ بالکل صریح ہیں اور مقتدی اور ماموم کی استثنار اور وعدہ بھی ان میں صاف طور پر موجود ہے جس کا ایک ایک حرف پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ صاحب خیر الکلام کی تاویل بالکل سینہ زوری پر محمول ہے اور قطعاً باطل اور مردود ہے۔ علمی دنیا میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

(۷) بلاشک کتاب الام کی تیسری عبارت میں مطلق قرأۃ کا ذکر ہے لیکن حضرت امام شافعیؒ نے جن پہلی دو عبارتوں میں وعدہ فرمایا ہے۔ ان میں اُم القرآن کی تصریح موجود ہے اور وہ نحن نقول سے اسی وعدہ کو انھوں نے پورا کیا ہے۔ مصنف خیر الکلام اور ان کی جماعت کا اخلاقی فرض ہے کہ اگر یہ عبارت ان کے دو مرتبہ وعدہ کے ایفا کے لیے نہیں تو بتلائیں کہ کتاب الام میں وہ کونسی عبارت ہے جس کے ساتھ حضرت امام شافعیؒ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا ہے؟ (دیدہ باید)

(۸) البدایہ والنہایہ اور تفسیر ابن کثیرؒ کی ان عبارات سے قدر مشترک یہ ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو کلیتہً البدایہ تفسیر ابن کثیر سے مقدم ہے اور نہ مکمل طور پر تفسیر اس سے پہلے کی ہے۔ کچھ

اجزا اس کے پہلے لکھے گئے اور کچھ حصص اس کے پہلے تصنیف ہوئے اور مناسب مواقع پر ایک کے حوالے دوسری کتاب میں ذکر کر دیے گئے لیکن بایں ہمہ اس سے کتاب الام کے صریح حوالوں اور امام ربیع بن سلیمانؒ کی راجح روایت پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ جیسا کہ پہلے عرض کر دیا گیا ہے کہ کتاب الام ٹھوس تاریخی شہادتوں کی بنا پر امام موصوفؒ کی کتب جدیدہ میں سے ہے اور امام ربیعؒ کی روایت کو ترجیح ہوتی ہے۔

(۹، ۱۰) کا جواب یہ ہے کہ یہ ساری تحقیق اس بات پر مبنی ہے کہ امام مزنیؒ اور امام بویطیؒ کی روایت کو ترجیح دی گئی ہے اور ہم باحوالہ عرض کر چکے ہیں کہ اصل غلطی کا سبب ہی یہ غلط نظریہ ہے۔ سچ ہے کہ ؎

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا میرود دیوار کج

(۱۱) کا جواب یہ ہے کہ اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حضرت امام شافعیؒ جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے قرأۃ کے قائل نہ تھے بلکہ امام کے سورۃ فاتحہ ختم کر چکنے کے بعد سکتہ میں سورۃ فاتحہ کے قائل تھے کیونکہ بحالت جہر امام مقتدی کی قرأۃ خلاف اجماع اور شاذ ہے۔ یہ عبارت تو مؤلف خیر الکلام کے مدعٰی کے مطابق نہیں۔ وہ تو جہر میں بھی قرأۃ فرض قرار دیتے ہیں۔ اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ وقال فی الجدید یقرأ الفاتحۃ فقط فی سکتات الامام[۱] امام شافعیؒ کا قول جدید یہ ہے کہ مقتدی سورۃ فاتحہ پڑھے لیکن سکتات امام میں۔

(تفسیر جلد ۲، ص ۲۸۰)

اس سے معلوم ہوا کہ بحالت جہر امام شافعیؒ بھی مقتدی کے لیے قرأۃ کے قائل نہ تھے اور ہم نے اسی کتاب میں باحوالہ مبسوط بحث کر دی ہے کہ سکتات امام کا (جن میں مقتدی قرأۃ کر سکیں) شریعت سے کوئی ثبوت نہیں جس کا کوئی معقول جواب مؤلف مذکور نے نہیں دیا۔ الغرض امام شافعی رح کی کتاب الام کی احسن الکلام میں پیش کردہ عبارات اپنے مدلول پر بالکل نص صریح ہیں اور تاویلات باردہ کو بالکل قریب نہیں آنے دیتیں۔ یوں تعصب وعناد اور انکار وجحود کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے جب تک نگاہ تعصب نہ بدلے گی نظریات میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہو سکتی: ؎

نہ تم بدلے نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی !
میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسماں کرلوں !

امام احمدؒ بن حنبلؒ[1] : (المتوفی ۲۴۱ھ) کا مسلک یہ ہے کہ وہ بھی جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قرأۃ کے قائل[2] نہ تھے۔ بلکہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کرنے کو شاذ اور خلاف اجماع فرماتے[3] تھے۔ اور سری نمازوں میں وجوب کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ مولانا مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ تمام نمازوں میں مقتدی کے لیے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قرأۃ کو واجب نہیں سمجھتے تھے۔ (تحفۃ الاحوذی، جلد ۱ ص ۲۵۷)

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کی ان الفاظ سے تعریف کرتے ہیں "شیخ الاسلام سید المسلمین، الحافظ اور الحجۃ" (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۷)، محدث ابراہیم حربیؒ کہا کرتے تھے کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے اولین اور آخرین کے علوم جمع کر دیئے ہیں" (ایضاً)، امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے "میں نے بغداد میں امام احمدؒ سے بڑا فقیہ و عالم اور افضل کوئی نہیں دیکھا"۔ (بغدادی جلد ۴ ص ۴۱۹، تذکرہ جلد ۲ ص ۱۸، البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۳۳۵) اور نیز فرماتے ہیں کہ "جب میں بغداد سے نکلا تو میں نے امام احمدؒ سے بڑا فقیہ، زاہد اور متورع اور عالم کوئی وہاں نہیں چھوڑا" (تہذیب التہذیب ص ۷۳) علامہ خطیب ان کی تعریف یوں کرتے ہیں "امام المحدثین، الناصر للدین، المناضل (یعنی مدافعت کرنیوالے) عن السنۃ اور الصابر فی المحنۃ" (بغدادی جلد ۴ ص ۴۱۲) نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں: "امام احمدؒ امام سنت و مقتدائے ملت است" (تقصار ص ۹۴)

[2] امام احمدؒ کا یہ مسلک مغنی ابن قدامہ جلد ۱ ص ۶۰۶، تنوع العبادات ص ۸۶، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵۔ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷ وغیرہ میں مذکور ہے۔

[3] شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۹ (تنوع العبادات ص ۸۷) میں اس کی تصریح ہے۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

بخلاف وجوبها فی حال الجهر فانه شاذ حتی نقل احمد الاجماع علی خلافه۔ (فتاویٰ: ۲ ص ۱۴۹)

یعنی سورۂ فاتحہ کا جہری نمازوں میں امام کے پیچھے بطور وجوب پڑھنا شاذ ہے۔ حتیٰ کہ امام احمدؒ نے اس کے خلاف اجماع اور اتفاق نقل کیا ہے۔

(نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

ائمہ اربعہؒ کے مسلک کی تشریح کے بعد ضرورت تو باقی نہیں رہتی کہ ہم دوسرے ائمہ، محدثین اور فقہاء کے حوالے پیش کریں۔ بھلا حضرات ائمہ اربعہؒ کے اقوال کی موجودگی میں اور کس کے قول کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ان میں اکثریت ان ائمہ کی ہے جو حضرات ائمہ اربعہؒ میں سے کسی نہ کسی امام کے مقلد اور ان کی علمی تحقیق کے خوشہ چیں تھے۔ مگر چونکہ فریقِ ثانی کی طرف سے بعض ائمہ کے مسالک نقل کرنے میں غلطی ہوتی ہے۔ اس لیے ہم بعض ائمہ کے اقوال عرض کرتے ہیں۔

ان میں وہ ائمہ کرام بھی شامل ہیں جو خود مستقل طور پر امام تھے اور انھوں نے کسی کی تقلید نہیں کی، بلکہ عرصہ دراز تک ان کی تقلید ہوتی رہی ہے۔

امام ابراہیم النخعیؒ: (المتوفی ۹۶ھ) کسی نماز میں امام کے پیچھے قرأۃ سورۂ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔ (مغنی ابن قدامہ: ۱ ص ۶۰۶، الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۶۹، شرح مقنع جلد ۲ ص ۱۱) ان کی پوری عبارت مع تشریح کے باب سوم میں ذکر کی جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

(نوٹ پچھلا صفحہ) مصنف خیر الکلام (دیکھو ص ۱۳۱) کا یہ کہنا کہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امام کے ساتھ نہ پڑھے بلکہ سکتات میں پڑھے (محصلہ) قطعاً باطل اور مردود ہے کیونکہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سکتات کے قائل نہیں ہیں جیسا کہ ان کے حوالہ سے آگے اپنے مقام پر بحث آئیگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ پھر ان کی مرضی کے خلاف ان کی عبارت کا مطلب لینا کہاں کا انصاف ہے؟ اور شیخ منصور علی ناصفؒ لکھتے ہیں:

فلا فاتحۃ علی المأموم وعلیہ الجمھور و مالك وابوحنیفۃ واحمد (غایۃ المأمول جلد ۱ ص ۱۸۳، شرح التاج الجامع للاصول)

مقتدی پر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا لازم نہیں ہے یہی جمہور اہل اسلام اور امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کا مسلک اور مذہب ہے۔

لہ امام نوویؒ (المتوفی ۶۷۷ھ) لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق، جلالتِ شان اور فقہی کمال پر سب کا اتفاق ہے۔ امام شعبیؒ نے انکی وفات کے وقت کہا کہ ابراہیمؒ نے اپنے بعد اپنے سے بڑا عالم اور فقیہ کوئی نہیں چھوڑا۔ لوگوں نے کہا کیا حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ بھی نہیں؟ تو شعبیؒ نے کہا کہ نہ صرف حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ بلکہ اہل بصرہ، کوفہ، حجاز اور شام میں کوئی بھی نہیں۔ (تہذیب الاسماء واللغات جلد ۱ ص ۱۰۴) علم حدیث میں ان کے اس قدر وسیع معلومات تھے کہ مشہور محدث اعمش رح کا بیان ہے کہ میں نے جب کبھی ابراہیم رح کے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

امام زہریؒ [1]: (المتوفی ۱۲۴ھ) جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ سورۂ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔ (کتاب القرأۃ ص ۷۵، مغنی ابن قدامہ جلد اص ۶۰۹، شرح مقنع جلد ۲ ص ۱۱)

(بقیہ پچھلا صفحہ) سامنے کوئی حدیث پیش کی تو انھوں نے اس میں میرے معلومات اور بڑھائے۔ بڑے بڑے فقہا فقہی مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ سعیدؒ بن جبیرؒ کے پاس جب کوئی فتویٰ پوچھنے کے لیے آتا تو اس سے کہتے، ابراہیمؒ کی موجودگی میں مجھ سے پوچھتے ہو؟

ابو وائلؒ کے پاس جب کوئی مستفتی آتا تو اس کو ابراہیمؒ کے پاس بھیج دیتے۔ اور اس سے کہہ دیتے، جب وہ جواب دیں مجھے بتانا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۶ ص ۱۸۹) وہ اتنے محتاط تھے کہ اکثر یہ فرمایا کرتے تھے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب لوگ قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے ڈرتے تھے اور اب یہ زمانہ ہے کہ جس کا دل چاہتا ہے مفسر بن بیٹھتا ہے۔ مجھے زیادہ پسند ہے کہ علم کے متعلق ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالوں جس زمانہ میں میں فقیہ ہوا وہ بہت ہی انحطاط کا زمانہ ہے۔ (طبقات الکبریٰ شعرانی جلد اص ۳۶) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ فقیہ العراق اور صاحبِ اخلاص بلند پایہ علماء میں تھے اور احادیث کے پرکھنے میں وہ صراف اور نقاد تھے۔ اور گمنامی کی زندگی کو بہت پسند کرتے تھے۔ (تذکرہ جلد اص ۶۹)

[1] امام زہریؒ، امام ابن مدینیؒ کا بیان ہے کہ حجاز میں ثقات کا سارا علم زہریؒ اور عمروؒ بن دینارؒ کے درمیان تقسیم تھا۔ (تذکرہ جلد اص ۹۹) عمرؒ بن عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے کہ اب زہریؒ سے زیادہ سنت ماضیہ کا جاننے والا کوئی نہیں رہا (ایضاً) عمرو بن دینارؒ جو خود بھی بہت بڑے محدث تھے فرماتے تھے کہ میں نے زہریؒ سے زیادہ حدیث میں کسی کو انقص نہیں دیکھا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۴۴۸) فقہ میں وہ بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ مدینہ کے ساتوں مشہور فقہاء کا علم ان کے سینہ میں محفوظ تھا۔ (ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۵۱) اسی فقہی کمال کی وجہ سے وہ مدینے کی مجلس افتاء کے مسند نشین تھے۔ ان کے فتاویٰ کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ محمدؒ بن نوحؒ نے فقہی ترتیب سے ان کو تین ضخیم جلدوں میں جمع کیا تھا۔ (اعلام الموقعین جلد اص ۲۶) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ امام زہریؒ کے زمانہ میں ان سے بڑھ کر حافظ حدیث، عالم اور احادیث کی جمع و ترتیب کرنے والا اور کوئی نہ تھا (کتاب القرأۃ ص ۷۵) حافظ ابن کثیرؒ ان کو احد الاعلام من ائمۃ الاسلام اور تابعی جلیل وما علم الناس لکھتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۳۴۴) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ زہریؒ ہمارے نزدیک حدیث تفسیر اور رجال کی توثیق کرنے کے امام ہیں۔ (الرسالہ للامام الشافعیؒ ص ۶۴) اور حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ امام زہریؒ (بقیہ اگلے صفحہ پہ)

اور اسی طرح امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۶۱ھ)۔

امام لیث بن سعد (المتوفی ۱۷۵ھ) امام عبداللہ بن المبارک (المتوفی ۱۸۱ھ)

(بقیہ پچھلا صفحہ) اپنے وقت میں سنت اور حدیث کے بہت بڑے امام تھے۔ (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۵)

۱ سفیان ثوریؒ، علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، شیخ الاسلام، سید الحفاظ اور الفقیہ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۰) امام شعبہؒ و ابن معینؒ اور ایک بہت بڑی جماعت یہ کہتی ہے کہ سفیانؒ فن حدیث میں امیر المؤمنین تھے۔ ابن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے گیارہ سو شیوخ سے احادیث کی سماعت کی ہے جن میں سفیان ثوریؒ سے افضل کوئی بھی نہ تھا۔ ان کی تعریف و توصیف کے لیے یہ الفاظ کیا کم ہیں؟ شعبہؒ فرماتے ہیں۔ سفیانؒ مجھ سے بڑے حافظ ہیں۔ ورقاءؒ فرماتے ہیں: سفیانؒ نے اپنا نظیر خود بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ امام احمدؒ فرماتے تھے میرے نزدیک سفیانؒ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ اس سرزمین پر کوئی ایسا نہیں رہا جس پر تمام امت متفق ہو۔ ہاں مگر وہ صرف سفیان ثوری ہی ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۱)

امام قطانؒ فرماتے ہیں کہ سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ سے سب چیزوں میں بڑھ کر ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۱) علامہ خطیب لکھتے ہیں کہ وہ ائمہ مسلمین کے بہت بڑے امام اور اعلام دین کے بہت بڑے علم تھے۔ سب کا ان کی امامت پر اتفاق ہے۔ (بغدادی جلد ۹ ص ۱۵۲، تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۱۱۴) حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ وہ احد ائمۃ الاسلام اور عابد متقی اور بے شمار تابعینؒ سے روایتیں کرنے والے تھے۔ (البدایۃ والنہایۃ جلد ۱۰ ص ۱۳۴)

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام سفیانؒ ثوری از اصحاب مذاہب متبوعہ بود محدث جلیل و عارف نبیل علم را با سلوک یکجا داشت۔ (تقصار ص ۲۷)

۲ امام لیثؒ بن سعد علامہ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ امام احمدؒ ان کو کثیر العلم اور صحیح الحدیث کہتے تھے۔ ابن مدینیؒ ان کو ثقہ اور ثبت کہتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۴۶۱) ابن وہبؒ کا بیان ہے کہ اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ہم نے لیثؒ سے بڑا کوئی فقیہ نہیں دیکھا۔ (ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۳۸) امام نوویؒ کا بیان ہے کہ لیثؒ کی مہارت فقہ پر علماء کا اجماع ہے۔ اس کمال تفقہ کے باعث اپنے زمانہ میں مصر کے سب سے بڑے مفتی بھی تھے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۷۷) علامہ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ وہ الامام، الحافظ اور دیار مصر کے علماء کے شیخ اور رئیس تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۰۸) یحییٰ بن بکیرؒ کا بیان ہے کہ لیثؒ سے زیادہ کامل اور فقیہ البدن

(باقی اگلے صفحہ پر نمبر ۳ بھی)

امام اوزاعیؒ [۵۱] رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۵۷ھ)

(بقیہ اور نمبر ۴۹ پچھلے صفحہ) میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ سعید بن ایوبؒ کہتے ہیں اگر امام مالکؒ اور لیثؒ کسی موقع پر مجتمع ہوتے تو مالک کو ان کے سامنے لب کشائی کی ہمت نہ ہوتی۔ (بغدادی جلد ۱۳ ص ۶) امام شافعیؒ کا بیان ہے کہ لیثؒ امام مالکؒ سے زیادہ احادیث اور آثار کا اتباع کرتے تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲) حافظ ابن کثیرؒ ان کو امام فی الفقہ والحدیث والعربیۃ سے یاد کرتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۶۶) امام احمد فرماتے ہیں کہ لیث کثیر العلم اور صحیح الحدیث تھے۔ اور نیز فرمایا کہ اہل مصر میں ان سے زیادہ اصح الحدیث اور کوئی نہ تھا (بغدادی جلد ۱۳ ص ۱۲)

[۵۰] امام عبداللہ بن المبارکؒ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام العلامۃ الحافظ، شیخ الاسلام، فخر المجاہدین اور قدوۃ الزاہدین لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۵۳) امام ابن حبانؒ کا بیان ہے کہ ان میں اہلِ علم کے اتنے خصائل جمع ہو گئے تھے کہ ان کے زمانہ میں تمام روئے زمین پر کسی میں مجتمع نہ ہوئے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۳۸۶) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی امامت اور جلالت پر سب کا اتفاق ہے۔ وہ تمام چیزوں میں امام تھے ان کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی ہے اور ان کی محبت کی وجہ سے بخشش کی توقع کی جاتی ہے۔ علامہ ابن سعدؒ ان کو مقتدا، حجت اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۲۸۵) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ حفظ، فقہ، عربیت، زہد، شجاعت اور شعر کے مسلم امام تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۷۷)۔ علامہ خطیبؒ فرماتے ہیں کہ وہ علم میں حق پرستوں کے گروہ میں تھے۔ اور حفظ و زہد کے ساتھ متصف تھے۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۱۵۲) مولانا مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم تھے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۲۰)

[۵۱] امام اوزاعیؒ: علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ شیخ الاسلام اور حافظ تھے۔ اور وہ اس قابل تھے کہ ان کو وقت کا خلیفہ بنایا جاتا۔ امام ابو اسحاق فزاریؒ کا بیان ہے کہ اگر تمام امت کا خلیفہ منتخب کرنے کا اختیار مجھے دیا جائے تو میں امام اوزاعیؒ کا انتخاب کروں گا۔ اہل شام اور اندلس میں ایک عرصہ تک ان کی تقلید ہوتی رہی۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۶۸) امام ابو زرعہؒ فرماتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ سے فقہ اور دین کی بہت سی روایتیں منقول ہیں۔ اسی علمی قابلیت کی وجہ سے وہ اہل شام کے مفتی اعظم تھے۔ امام ابن مہدیؒ کا بیان ہے۔ حدیث کے مرکزی امام صرف چار ہیں۔ امام اوزاعیؒ (۲) امام مالکؒ (۳) امام ثوریؒ (۴) امام حماد بن زیدؒ۔ نیز ان کا بیان ہے کہ اہل شام میں ان سے بڑا کوئی سنت کا عالم نہ تھا۔ تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۲۳۹) حافظ ابن کثیرؒ ان کو الامام الجلیل علامۃ الوقت اور فقیہ اہل الشام لکھتے ہیں۔ امام عبیداللہ بن عبدالکریمؒ فرماتے ہیں: (بقیہ اگلے صفحہ پر)

امام اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۳۶ھ) اور امام سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۹۸ھ) وغیرہ جہری نمازوں میں مطلقاً اور سرّی میں وجوب کے قائل نہ تھے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اختصاراً اپنے اس دعوے کی دلیل بھی عرض کر دیں چنانچہ امام موفق الدین ابن قدامہ تحریر فرماتے ہیں:

(بقیہ پچھلا صفحہ) میں نے امام اوزاعیؒ سے بڑا عقلمند، پرہیزگار، عالم، فصیح، باوقار، حلیم اور خاموش طبع کوئی اور نہیں دیکھا۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۱۵) حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ وہ امام الشام فی وقتہ اور احد ائمۃ الدنیا تھے۔ (اجتماع الجیوش الاسلامیہ ص ۸۰)

[1] امام اسحاق بن راہویہ: علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ حافظ کبیر عالم نیشاپور بلکہ جملہ اہل مشرق کے شیخ تھے۔ محدث ابو زرعہ کا بیان ہے کہ ان سے بڑا کوئی حافظ دیکھنے میں نہیں آیا۔ ابو حاتمؒ کا بیان ہے کہ ان کے اتقان اور اصابت رائے پر آفرین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت بڑا حافظہ عطا فرمایا تھا۔ (تذکرہ جلد ۲ صفحہ ۱۹)

امام ابن خزیمہؒ کا بیان ہے کہ اگر وہ تابعین کے زمانہ میں ہوتے تو وہ یقیناً ان کے علم اور فقہ کا اقرار کرتے۔ امام احمدؒ ان کو امام من ائمۃ المسلمین کہتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۶ ص ۳۵۰) ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانے میں فقہ، علم اور حفظ میں یکتا تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۱۷) سعید بن ذویبؒ کا بیان ہے کہ وہ عدیم النظیر تھے۔ (بغدادی جلد ۶ ص ۳۵۰)

[2] امام سفیان بن عیینہؒ: امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ اگر امام مالکؒ اور سفیان بن عیینہؒ نہ ہوتے تو حجاز کا علم ختم ہو جاتا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۱۱۹) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی امامت جلالت شان اور عظمت پر سب کا اتفاق ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عیینہؒ سے بڑا کوئی عالم سنن نہیں دیکھا۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۲۲۴) ابن حماد حنبلیؒ انہیں شیخ الحجاز اور احد الاعلام لکھتے ہیں: ابن ناصر الدین کہتے ہیں: سفیان بن عیینہؒ امام عالی مقام اور حرم محترم کے محدث تھے۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۳۵۴)۔ ابن وہب کہتے تھے۔ میں نے سفیان بن عیینہؒ سے بڑھ کر کوئی شخص قرآن مجید کا عالم نہیں دیکھا۔ (بغدادی جلد ۹ ص ۱۸۵)

علامہ ذہبیؒ ان کو العلامہ، الحافظ اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ امام، حافظ، حجت، وسیع العلم اور بلند قدر تھے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سفیان بن عیینہؒ سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا کہ فتویٰ دینے میں احتیاط کرتا ہو اور حدیث کی تفسیر میں بھی ان سے بہتر کوئی نہیں دیکھا۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۴۲)

وجملة ذلك ان القرأة غير واجبة على العموم فيما جهر به الامام ولا فيما اسر به نص عليه احمد فى رواية الجماعة و بذلك قال الزهرىؒ والثورىؒ وابن عيينةؒ ومالكؒ وابو حنيفةؒ واسحاقؒ بن راهويهؒ۔ (مغنى جلد ۱ ص۶۰۱)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کا امام کے پیچھے پڑھنا نہ جہری نمازوں میں واجب ہے، نہ سرّی میں، ایک بڑی جماعت نے امام احمدؒ سے اس کی تصریح نقل کی ہے اور یہی امام زہریؒ، سفیان ثوریؒ، سفیانؒ بن عیینہؒ، مالکؒ، ابو حنیفہؒ اور اسحاقؒ بن راہویہؒ کا مسلک اور مذہب ہے۔

امام شمس الدینؒ ابن قدامہ الحنبلیؒ:

(المتوفی ۶۸۲ھ جن کا نام عبد الرحمٰنؒ بن ابی عمر محمدؒ بن احمدؒ بن محمدؒ بن قدامہؒ ہے۔ علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ وہ الامام اور شیخ الاسلام تھے تذکرہ جلد ۴ ص۲۷۳) فرماتے ہیں کہ

ولا تجب القرأة على المأموم هذا قول اكثر اهل العلم ممن كان لا يرى القرأة خلف الامام علىؓ وابن عباسؓ وابن مسعودؓ وابو سعيدؓ وزيدؓ بن ثابت وعقبةؓ بن عامر وجابرؓ وابن عمرؓ وحذيفة بن اليمانؓ وبه يقول الثورىؒ و ابن عيينةؒ واصحاب الرأى ومالكؒ والزهرىؒ والاسودؒ وابراهيمؒ وسعيدؒ بن جبيرؒ قال ابن سيرينؒ لا اعلم من السنة القرأة خلف الامام اھ (شرح مقنع جلد ۲ ص۱۱ طبع مصر)

اور مقتدی پر قرأۃ واجب نہیں ہے اور یہی اکثر اہل علم کا قول ہے اور جو حضرات قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے ان میں خصوصیت سے حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، ابو سعیدؓ، زیدؓ بن ثابت عقبہؓ بن عامر، جابرؓ، ابن عمرؓ، حذیفہؓ بن الیمانؓ قابلِ ذکر ہیں اور یہی قول امام سفیان ثوریؒ سفیانؒ بن عیینہؒ فقہاءِ حنفیہؒ امام مالکؒ، زہریؒ، اسودؒ ابراہیمؒ وسعیدؒ بن جبیرؒ کا ہے اور محمدؒ بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ قرأۃ خلف الامام سنت ہو۔

یہ حوالہ بھی اس بات کی واضح اور روشن دلیل ہے کہ اکثر اہلِ علم کے نزدیک مقتدی پر قرأت واجب نہیں ہے اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ واتباع تابعینؒ میں مذکورین حضرات قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے اور امام محمدؒ بن سیرینؒ قرأۃ خلف الامام کو خلاف سنت قرار دیتے ہیں اور ہم پہلے مغنی کے حوالہ سے عرض کر چکے ہیں کہ امام احمدؒ امام زہریؒ، امام سفیانؒ بن عیینہؒ

امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ اور امام اسحاق بن راہویہؒ سب حضرات کے نزدیک مقتدی پر جہری اور سری کسی نماز میں قرأۃ واجب نہیں ہے۔ اور قاضی شوکانیؒ نے تصریح کی ہے کہ امام اسحاق بن راہویہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ وغیرہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل نہ تھے۔

(نیل الاوطار جلد ۲ ص ۲۲۳)

مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں:

وقال الزهري ومالك وابن المبارك واحمد واسحاق يقرأ فيما اسرّ فيه الامام ولا يقرأ فيما جهر به۔ (تحفة الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۶)

امام زہریؒ، امام مالکؒ، ابن المبارکؒ، احمدؒ اور اسحاقؒ فرماتے ہیں کہ "جن نمازوں میں امام آہستہ قرأت کرتا ہو، ان میں مقتدی قرأۃ کر سکتا ہے اور جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے اس کی گنجائش نہیں ہے۔"

امام ابن قدامہؒ کے حوالہ سے ابھی نقل کیا جا چکا ہے اور مبارک پوری صاحبؒ کے حوالہ سے عنقریب آئے گا کہ یہ ائمہ باوجودیکہ سری نمازوں میں قرأۃ خلف الامام کے قائل تھے۔ لیکن وجوب کے قائل نہ تھے۔

شیخ عبد القادر جیلانیؒ[1]:

(متوفی ۵۶۱ھ) بھی مقتدی کے لیے قرأت کو درست نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

ان كان مأموما ينصت الى قراءة الامام ويفهمها۔ (غنیۃ الطالبین، طبع مصر، ص ۶۷۴)

اگر نماز پڑھنے والا مقتدی ہے تو اس کو امام کی قرائت کے لیے خاموش رہنا چاہیے اور اس کی قرأۃ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اگر ظاہری الفاظ پر نگاہ ڈالی جائے تو ان سے یہی متبادر ہو سکتا ہے کہ موصوف مقتدی کا تمام نمازوں میں یہ وظیفہ بتا رہے ہیں کہ وہ نہایت توجہ اور دلجمعی کے ساتھ امام کی قرأۃ کو سنے اور خود خاموش رہے اور اگر اس امر پر بھی دھیان رکھا جائے کہ صاحب موصوف امام احمد بن حنبلؒ کے مقلد تھے[2]۔ تو اس عبارت

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو الشیخ اور القدوۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۴ ص ۱۷۲) علامہ سیوطیؒ ان کو الشیخ لکھتے ہیں۔ (تاریخ الخلفاء ص ۳۰۵) اور حافظ ابن القیمؒ ان کو الشیخ الامام العارف اور قدوۃ العارفین لکھتے ہیں (اجتماع الجیوش الاسلامیہ ص ۱۰۱) نواب صاحبؒ ان کو امام الصوفیہ لکھتے ہیں۔ (الجنۃ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنۃ ص ۳۷)

[2] اگلے صفحہ پر دیکھیے

سے جہری نمازوں میں ممانعت ثابت ہوگی۔ اور چونکہ امام احمدؒ سری نمازوں میں وجوب قراۃ کے قائل نہیں تھے۔ اس لیے صاحب موصوف کا مسلک بھی یہی ہوگا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ [1] (المتوفی ۷۲۸ھ) مسئلہ خلف الامام پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "کہ امام کے جہر کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ پڑھے اور مقتدی سنیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام جہری نمازوں میں جب وَلَا الضَّآلِّيْنَ پڑھتا ہے تو مقتدی بھی آمین کہتے ہیں اور سری نمازوں میں چونکہ مقتدی سنتے نہیں۔ اس لیے وہ آمین بھی نہیں کہتے۔ اگر امام بھی قرأت کر رہا ہو اور مقتدی بھی پڑھتے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ امام کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ تم ایسے لوگوں کو سناؤ جو اس کے لیے آمادہ نہیں اور ایسی قوم کو خطبہ اور وعظ کہو جو توجہ نہیں کرتی۔ اور یہ ایسی کھلی حماقت ہے جس سے شریعت مطہرہ کا دامن بالکل پاک ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص خطبۂ امام کے وقت باتیں کر رہا ہو تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے گدھے پر کتابوں کا بوجھ لادا گیا ہو۔ ایسا ہی وہ شخص ہے جو جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرتا ہو۔"

(فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، جلد ۲ ص ۱۴۷)

یعنی نہ گدھا کتابوں سے منتفع ہو سکتا ہے اور نہ مقتدی قرأتِ امام سے۔ غور کیجیے کہ کتنی نازک تشبیہ ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والوں کو گدھے سے مثال دی گئی ہے۔

(نمبر ۳۱ پچھلے صفحہ کا) نواب صاحبؒ فرماتے ہیں کہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کہ در طبقات صوفیہ سرخیل طوائف اولیاست انجام کار در مذہب احمد بن حنبلؒ انتقال برحمت الٰہی فرمود او را نیز در مجتہدین شمردہ اند جم غفیر از حنفیہ قدیماً و حدیثاً مرید ایں خانوادہ و آخذ طریق او ست۔" (ہدایۃ السائل ص ۲۸۲)

[1] علامہ ذہبیؒ ان کی تعریف ان الفاظ سے کرتے ہیں۔ شیخ الاسلام، العلامہ، الحافظ، الناقد، المفسر، المجتہد، عالی قدر، رئیس الزہاد، یگانۂ دوراں، بحر العلوم، الذکی، الشجاع، السخی اور لکھتے ہیں کہ مخالف اور موافق سب ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔" (تذکرہ جلد ۴ صفحہ ۲۷۸)

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں "کہ وہ شیخ الاسلام، امام الائمہ اور مجتہد مطلق تھے۔ علامہ ابن حزمؒ کے بعد شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ کے ہم پایہ کوئی امام پیدا نہیں ہوا۔" (تقصار ص ۷۶)

مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی لکھتے ہیں: "شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ علماء اسلام میں بلحاظ جامعیت علوم و فنون خصوصیت سے ممتاز ہیں۔ (تفسیر واضح البیان ص ۳۸)

قارئین کرام! اگر جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کرنے کی کچھ بھی اجازت ہوتی یا شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے خزانۂ معلومات میں ممانعت پر کوئی وزنی دلیل اور امت کی اکثریت کی معیت نہ ہوتی تو یقیناً وہ کبھی ایسی نازک تشبیہ نہ نقل کرتے اور یہی شیخ الاسلامؒ ایک دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرماتے ہیں:

والامر باستماع قرأۃ الامام والانصات لہ مذکور فی القرآن وفی السنۃ الصحیحۃ وھو اجماع الامۃ فیما زاد علی الفاتحۃ وھو قول جماھیر السلف من الصحابۃؓ فی الفاتحۃ وغیرھا وھو احد قولی الشافعیؒ واختارہ طائفۃ من حذاق اصحابہ کالرازیؒ وابی محمد بن عبد السلامؒ فان القرأۃ مع جھر الامام منکر مخالف القرآن والسنۃ وما کان علیہ عامۃ الصحابۃؓ۔ (تنوع العبادات ص۸۵)

امام کی قرأۃ سننے اور اس کے لیے چپ رہنے کا حکم قرآن کریم اور صحیح حدیث میں مذکور ہے اور اس پر تمام امت کا اجماع ہے کہ مقتدی پر سورۂ فاتحہ کے بعد اور کوئی قرأت نہیں ہے اور یہی جمہور اور اکثر حضرات صحابہ کرامؓ کا مسلک ہے کہ مقتدی پر نہ سورۂ فاتحہ کی قرأت ضروری ہے اور نہ کوئی اور سورۃ۔ امام شافعیؒ کا بھی ایک قول یہی ہے اور ان کے پیروکاروں کے گروہ میں جو بڑے ماہر تھے۔ مثلاً امام رازیؒ اور امام ابن عبد السلامؒ ان کا بھی یہی قول ہے اور اسی کو انھوں نے پسند کیا ہے۔ کیونکہ جہر امام کے وقت مقتدی کا پڑھنا قرآن کریم اور سنت کے خلاف بھی ہے۔ اور فی نفسہٖ بُرا بھی ہے اور اکثر حضرات صحابہ کرامؓ کے تعامل کے بھی سراسر خلاف ہے۔

حضرت امام شافعیؒ وغیرہ کا مسلک پوری تفصیل کے ساتھ پہلے نقل کیا جاچکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اور شیخ الاسلام کی عبارت بھی بڑی صاف اور واضح ہے۔ مزید تشریح کی محتاج نہیں ہے اور ہم شیخ الاسلامؒ کے حوالہ سے پہلے نقل کر آئے ہیں کہ امام احمدؒ سے وہ نقل کرتے ہیں کہ جہری نمازوں میں مقتدی کا امام کے پیچھے قرأۃ کرنا شاذ بھی ہے اور خلاف اجماع بھی۔ اور لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ کے نزدیک نہ جہری نمازوں میں مقتدی پر قرأت واجب ہے اور نہ سرّی نمازوں میں۔ (تنوع العبادات ص۸۶)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سرّی نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کرنے کے قائل تھے جیسا کہ

انھوں نے اپنے فتاویٰ (جلد ۲ ص ۱۴۹) میں اس کی تصریح کی ہے، لیکن چونکہ وہ حنبلی تھے اس لیے قرین قیاس یہ ہے کہ ان کا مسلک بھی امام احمد بن حنبلؒ کی طرح صرف استحباب کا ہونا چاہیے، نہ کہ وجوب کا۔ اور امام ابن قدامہ کی عبارت سرّی نمازوں میں عدم وجوب کی پہلے نقل کی جاچکی ہے۔ مؤلف خیر الکلام ص۳۱ و ۳۲ پر لکھتے ہیں کہ ان کے ہاں سکتاتِ امام میں پڑھنے سے بھی فرض ادا ہو جاتا ہے (محصلہ) لیکن اپنے مقام پر تفصیل کے ساتھ آئے گا کہ شیخ الاسلامؒ سکتات کے قائل نہیں ہیں اس لیے یہ توجیہ مردود ہے۔ رہا شیخ الاسلامؒ کا حنبلی ہونا؟ تو اس پر سینکڑوں حوالے نقل کیے جا سکتے ہیں مگر ہم صرف نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ کے ایک حوالے پر اکتفا کرتے ہیں کہ شیخ الاسلام کو شیخ الحنابلہ لکھتے ہیں۔ (الجنۃ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنۃ ص۲۶۸)

حافظ ابن القیمؒ [۱]**:** (المتوفی ۷۵۱ھ) مسئلہ خلف الامام کی تحقیق میں ارشاد فرماتے ہیں:

کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مقتدی پر سے سجدہ سہو ساقط کر دیا ہے۔ بایں طور کہ امام کے پیچھے مقتدی کے بھولنے سے مقتدی پر سہو لازم نہ ہوگا۔ یعنی جب امام کی نماز صحیح ہو گئی تو مقتدی کی نماز بھی صحیح ہوگی۔ اسی طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتدی پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا بھی ساقط کر دیا ہے، کیونکہ امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے۔ آگے لکھتے ہیں:

فقرأۃ الامام وسترتہ قرأۃ لمن خلفہ وسترۃ لہ۔ (کتاب الروح لابن القیمؒ ص۱۶۶)

یعنی امام کی قرأۃ مقتدیوں کی قرأۃ ہے اور امام کا سُترہ مقتدیوں کا سترہ ہے (نہ ان کو الگ قرأۃ کی ضرورت ہے اور نہ سترہ کی۔)

---

[۱] امام سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ انھوں نے تصنیف کتب، مناظرہ اور مسائل کے استنباط میں بڑی جدت کی اور محنت اٹھائی ہے۔ حتیٰ کہ علم حدیث، تفسیر اور فقہ میں وہ کبار ائمہ میں شمار ہوتے ہیں۔ (بغیۃ الوعاۃ ص۲۵)

ملا علی قاریؒ حنفی المتوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں کہ حافظ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن القیمؒ اکابر اہل السنۃ والجماعت میں سے تھے۔ اور اس امت کے اولیاء میں ان دونوں کا شمار ہوتا ہے۔ (جمع الوسائل شرح شمائل طبع مصر، جلد ۱ ص۲۰۸)

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ المتکلم الحافظ اور الامام تھے۔ (دلیل الطالب ص۹۰۳)

اور دوسرے مقام پر یوں پھول برساتے ہیں۔ علامۃ کبیر مجتہد مطلق تمام علوم و فنون میں اپنے معاصرین پر تفوق رکھنے والے اور مذاہب کے جاننے میں تمام آفاق میں مشہور اور علوم کے سمندر تھے۔ (تقصار ص۸۱)

یہ مضمون بھی نہایت روشن ہے اور غیر مبہم۔ مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔

امام شاہ ولی اللہ الدہلوی[1] رح: (المتوفی ۱۱۷۶ھ) ان کو بھی بعض حضرات نے (جن میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارک پوری رح بھی شامل ہیں۔ دیکھیے (تحقیق الکلام جلد ۱ ص۵ وغیرہ) مجوزین قرأۃ خلف الامام میں شامل کر لیا ہے۔ حالانکہ معاملہ یوں نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

فان جهر الامام لم يقرأ الا عند الاسكاتة	اگر امام جہر سے قرأت کرتا ہو تو مقتدی کو اس کے
وان خافت فله الخيرة۔	پیچھے قرأۃ نہیں کرنی چاہیے، ہاں مگر سکتاتِ امام میں اور
(حجة الله البالغة جلد ۲ ص۹ طبع مصر)	سرّی نمازوں میں مقتدی کو اختیار ہے چاہے پڑھے چاہے نہ پڑھے۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا دلالت نمی دارد مگر در جہر۔ (انفاس العارفین ص) یہ بحث تو اپنے مقام پر آئے گی کہ سکتاتِ امام کا کیا کہاں اور کتنا ثبوت ہے؟ اور یہ بھی کہ آیت مذکورہ سرّی نمازوں کو بھی شامل ہے نہ کہ فقط جہری نمازوں کو۔ لیکن یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے۔ کہ شاہ صاحب رح قرأۃ خلف الامام کے جہری نمازوں میں مطلقاً اور سرّی نمازوں میں وجوب کے قائل نہ تھے۔

قاضی مقبول احمد صاحب نے مغالطات احسن الکلام ص۳۰ اور الاعتصام ۱۳؍ اگست ۱۹۶۲ء، ص۵ کالم ۳ میں خاصا واویلا کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مصنف احسن الکلام نے حضرت شاہ ولی صاحب رح کی عبارت کے نقل کرنے میں خیانت کی ہے۔ اور حضرت شاہ صاحب کی غلط ترجمانی کی بخلاف اس کے مولانا عبدالرحمٰن صاحب رح مبارکپوری نے صحیح ترجمانی کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کی یہ عبارت ہضم کر لی گئی ہے اور اگر پڑھے تو سورہ فاتحہ کو اس طرح پڑھے کہ امام کو خلجان میں نہ ڈال دے۔ اور میرے نزدیک یہ بہتر قول ہے۔ (حجة الله البالغہ ج ۲ ص ۹ مغالطات احسن الکلام ص۳۰)

---

[1] نواب صاحب رح لکھتے ہیں: کہ وہ المحدث اور المشہور تھے۔ (اکسیر ص۹) نیز لکھتے ہیں کہ وہ الشیخ الاجل اور المحدث تھے۔ (الجنۃ ص۳۸) مولانا میر سیالکوٹی رح لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رح کے بعد اس وقت تک ہندوستان میں تو ایسا شخص نہیں ہوا۔ کہ اسے امام کہہ سکیں اور دوسرے ممالک کا حال خدا جانے۔

(اخبار اہل حدیث ۱۵ نومبر ۱۹۲۹ء)

اور الاعتصام میں لکھتے ہیں کہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مولانا عبد الرحمٰن صاحبؒ مبارکپوری کی یہ عبارت بھی نقل کر دی جائے تاکہ قارئین اچھی طرح اندازہ فرما سکیں کہ شاہ ولی اللہ الدہلوی علیہ الرحمۃ کا مسلک بیان کرنے میں کس نے غلطی کی ہے۔ مولانا مبارک پوری نے یا مولانا سرفراز نے ؟

مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: شاہ ولی اللہ الدہلویؒ نے بھی باوجود حنفی المذہب ہونے کے امام کے پیچھے الحمد پڑھنے کو اولی الاقوال بتایا ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ا ص۵) آپ دونوں عبارتیں ملاحظہ فرمائیں اور بتائیں کہ کیا مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوریؒ نے شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کی غلط ترجمانی کی ہے یا مولوی سرفراز نے ؟

الجواب: قاضی صاحب غصہ جانے دیجیے احسن الکلام کے ٹھوس دلائل اور محکم براہین نے آپ کے اور آپ کی جماعت کے دماغ کو ضرور ماؤف کر دیا ہے اور دل کی بھڑاس نکالنے کے اور اپنے متعصب حواریوں کو یہ باور کرانے کے لیے کہ مغالطاتِ احسن الکلام ہماری طرف سے مکمل جواب ہے یا الاعتصام میں بے سوچے سمجھے چند مضامین درج کر کے احسن الکلام کا جواب تصور کر لینا علمی دنیا میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ ہاں اپنے جذباتی حواریوں کو جماعت میں منسلک رکھنے کے لیے قدرے سنبھالا ہو سکتا ہے۔ مگر تابکے ؟ لوگ دلائل دیکھا کرتے ہیں۔ ہم حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی مکمل عبارت نقل کرتے ہیں اور قارئین کرام سے التماس کرتے ہیں کہ وہ انصاف سے فرمائیں کہ حضرت شاہ صاحب کی عبارت میں خیانت کس نے کی ہے ؟ آیا مولانا مبارک پوری صاحبؒ اور ان کے وکیل قاضی مقبول احمد صاحب نے یا سرفراز نے ؟ حضرت شاہ صاحب کی عبارت مع ترجمہ یہ ہے:

وان کان مأموما وجب علیہ الانصات	اور اگر وہ مقتدی ہو تو اس پر خاموش رہنا اور سننے
والاستماع فان جھر الامام لم یقرأ الا	کے لیے توجہ کرنا واجب ہے۔ پس اگر امام جہر سے پڑھے تو
عند الاسکاتۃ وان خافت فلہ الخیرۃ فان	مقتدی قرأۃ نہ کرے مگر سکتہ میں اور اگر امام آہستہ پڑھے
قرأ فلیقرأ الفاتحۃ قرأۃ لا یشوش علی الامام	تو مقتدی کو اختیار ہے پس اگر مقتدی پڑھے تو فاتحہ پڑھے
وھذا اولی الاقوال عندی وبہ یجمع بین	اس طرح کہ امام کو خلل میں نہ ڈالے اور یہ میرے نزدیک سب سے
احادیث الباب والسر فیہ ما نص علیہ من	بہتر قول ہے اور یونہی اس باب کی حدیثیں باہم جمع کی جاتی
ان القرأۃ مع الامام تشوش علیہ وتفوت	ہیں اور راز اس میں یہ ہے کہ شارع نے صراحت کے ساتھ

التدبر وتخالف تعظیم القرآن ولم یعزم
علیهم ان یقرؤا اسرارا من العامة متی
ارادوا ان یصححوا الحروف باجمعهم
کانت لهم لجة مشوشة فسجل فی
النهی عن التشویش ولم یعزم علیهم ما یؤدی
الی المنهی وابقی خیرة لمن استطاع و
ذلك غایة الرحمة بالامة انتهی۔
(حجۃ اللہ البالغۃ جلد ۲ ص۹ طبع مصر)

بتایا ہے کہ امام کے ساتھ قرأۃ کرنا اس کو خلل میں ڈالتا ہے
اور تدبر کو فوت کر دیتا ہے اور تعظیم قرآن کے مخالف ہے۔
اور تاکیداً ان کو نہیں فرمایا کہ وہ ضرور آہستہ پڑھیں کیونکہ
عام لوگ جب مل کر تصحیحِ حروف کا ارادہ کریں گے تو ان کی
آواز بلند ہوگی جو باعث تشویش ہوگی سو اس تشویش کی
نہی میں تو تاکید کی ہے مگر آہستہ پڑھنے کی تاکید نہیں کی
جو اس ممنوع چیز تک ان کو پہنچا دے اور اختیار دیا گیا ہے کہ جو
پڑھ سکتا ہے پڑھے اور یہ امت کے ساتھ انتہائی رحمت ہے۔

یہ تمام خط کشیدہ عبارت قاضی مقبول احمد صاحب شیرِ مادر سمجھ کر پی گئے ہیں جس سے سرّی نمازوں
میں قرأۃ کرنے اور نہ کرنے کے اختیار کا راز کھلتا ہے۔ اور فان قرأ فلیقرأ الخ کا (جو ولن خافت
فله الخیرة کی تفریع ہے) معنی اور اگر پڑھے الخ کر کے اپنی لیاقت کا ثبوت دیا ہے اور غصہ ہم
پر آ رہا ہے کہ غلط ترجمانی ہم نے کی ہے۔ یہ ہے فریق ثانی کے علماء کا علم اور لیاقت سبحان اللہ تعالےٰ
قاضی صاحب! حضرت شاہ صاحبؒ حرف فا کے ساتھ (جو تفریع اور ترتیب کے لیے ہوتا ہے)
یہ فرماتے ہیں کہ اگر مقتدی نے سرّی نمازوں میں پڑھنے کی شق کو اختیار کیا تو اس طرح فاتحہ پڑھے کہ
امام کے لیے باعث تشویش نہ ہو حرف واؤ کے ساتھ بیان نہیں کر رہے جس کا معنی اور اگر پڑھے
الخ اور والسر فیه سے آہستہ پڑھنے کا اور الخیرة کا راز بیان فرمایا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ
نے تمام سرّی اور جہری نمازوں میں سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کو اولی الاقوال نہیں فرمایا جیسا کہ مبارکپوری صاحبؒ نے
دھوکہ کھایا ہے اور قاضی صاحب موصوف دھوکہ دہی پر کمربستہ ہیں کسی عربی کے ماہر ثالث سے فیصلہ
کرالیں کہ اس کا مطلب سرفراز ٹھیک بیان کر رہا ہے؟ یا مبارکپوری صاحبؒ جو فرماتے ہیں وہ درست ہے؟

جو بات حق ہو وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی
خدا نے مجھ کو دیا ہے دلِ خبیر و بصیر!

قارئین کرام! آپ کو اس ماسبق بحث سے یہ اندازہ بخوبی ہو گیا ہو گا کہ حضرات صحابہ
کرامؓ اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ اور ائمہ اربعہؒ اور ان کے علاوہ امت کی اکثریت کے نزدیک

جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرأۃ کو جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ وہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی کا سورۃ فاتحہ پڑھنا شاذ، مخالف قرآن وسنت اور مخالفِ اجماع سمجھتے تھے اور سری نمازوں میں بھی اُمّت کی اکثریت وجوبِ قرأۃ کی قائل نہ تھی۔ اس بحث کے پیشِ نظر فریقِ ثانی کے یہ باطل اور بے بنیاد دعاوی کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے والے بے نماز مفسدینِ صلوٰۃ اور تارکِ سُنت ہیں اور ان کے ساتھ مُباہلہ تک کرنا بھی صحیح ہے۔ ملاحظہ کیجئے کہ کہاں تک صحیح ہیں؟ اور ان کے ان غلو آمیز اور شر انگیز گستاخانہ کلمات سے کون امام بچ سکتا ہے؟ ہم نے محض نمونہ کے طور پر بعض حضرات ائمہؒ کی عبارات مقدمہ میں درج کی ہیں۔ ان کے علاوہ باب اوّل میں آیت کی تفسیر میں حضرات تابعینؒ و اتباعِ تابعینؒ کے جو آثار بیان ہوں گے۔ نیز باب سوم میں آثار حضرات صحابہؓ و تابعینؒ کے تحت جو آثار ذکر کیے جائیں گے۔ وہ ان کے علاوہ ہیں اور اگر آپ کی نزاکتِ طبع و قلتِ فرصت کا خیال دل کی گہرائیوں میں دب دب کر نہ اُبھرتا تو ہم ان کو بھی مقدمہ میں جگہ دیتے۔ کیونکہ ؎

رہ روان را خستگی راہ نیست
عشق ہم راہ ہست و ہم خود منزل است

اب ہم مقدمہ میں انہی اقتباسات پر اکتفا کرتے ہوئے صرف حضرت امام احمدؒ بن حنبل کی ایک جامع ومانع عبارت نقل کرتے ہیں۔ بغور پڑھیے۔ امام ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

قال احمدؒ[1] ما سمعنا احدًا من اھل الاسلام یقول ان الامام اذا جھر بالقرأۃ لا یجزئ صلوٰۃ من صلّٰی خلفہ اذا لم یقرأ وقال ھذا النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم واصحابہ والتابعون وھٰذا مالکؒ فی اھل الحجاز وھٰذا الثوریؒ

امام احمدؒ بن حنبلؒ نے فرمایا کہ ہم نے اہل اسلام میں کسی سے نہیں سنا۔ جو یہ کہتا ہو کہ جب امام جہر سے قرأۃ کرتا ہو اور مقتدی اس کے پیچھے قرأۃ نہ کرے تو مقتدی کی نماز باطل اور فاسد ہو جاتی ہے اور فرمایا یہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ اور یہ آپ کے صحابہؓ اور تابعینؒ ہیں اور یہ امام مالکؒ ہیں اہل حجاز میں اور یہ امام ثوریؒ ہیں

---

[1] اور نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ دارقطنی کے حوالہ سے ایک روایت رجالہ کلھم ثقات کے الفاظ سے نقل کر کے آگے لکھتے ہیں کہ حدیث دلیل است بر عدم قرأۃ چیزی در پس امام در حالتِ جہر امام و لہٰذا احمدؒ گفتہ ما سمعنا احدًا یقول ان الامام اذا جھر بالقرأۃ لا تجزئ صلوٰۃ من لم یقرأ۔ اھ
(ھدایۃ السائل ص ۱۹۳)

فی اھل العراق وھذا الاوزاعی فی اھل الشام وھذا اللیث فی اھل مصر ما قالوا الرجل صلی وقرأ امامہ ولم یقرأ ھو صلٰوتہ باطلۃ۔ (مغنی ابن قدامہ ج ۱ ص ۶۰۶ بعینہا یہ عبارت شرح مقنع جلد ۲ ص ۱۳ میں بھی ہے)

اہل عراق میں اور یہ امام اوزاعیؒ ہیں اہل شام میں اور یہ امام لیثؒ بن سعد ہیں اہل مصر میں ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ جب کوئی شخص نماز پڑھے اور اس کا امام قرأۃ کرے اور مقتدی خود قرأۃ نہ کرے تو اس کی نماز باطل اور فاسد ہو جاتی ہے۔

درماندگی:

مصنّف خیر الکلام نے حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ کی اس واضح اور صریح عبارت کا جو جواب دیا ہے اس کو پڑھ کر ان کی علمی حالت پر بے ساختہ ترس آتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ

(۱) اس کا مطلب بھی یہی لینا چاہیئے کہ امام کے ساتھ ساتھ پڑھنا کسی کے نزدیک ضروری نہیں بلکہ قرأۃ کا فریضہ (جن کے ہاں قرأۃ فرض ہے) سکتات میں ادا ہو سکتا ہے۔ (الخ) (خیر الکلام ص ۳۲)

(۲) یا امام احمد بن حنبلؒ کی عبارت کا یہ مطلب ہے کہ چونکہ یہ مسئلہ اختلافی ہے اس لیے کسی کی تحقیق میں فاتحہ فرض نہ ہو تو وہ جہری نمازوں میں نہ پڑھے تو اس کی نماز ہو جاتی ہے باقی رہا یہ سوال کہ امام صاحبؒ نے جہر کی قید کیوں لگائی ہے اس اختلافی مسئلہ میں تو جہر اور سرّ برابر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سرّی نمازوں میں منع کی چونکہ کوئی دلیل نہیں اس واسطے بعض علماء نے اس کو اختلافی مسئلہ قرار نہیں دیا بلکہ اتفاقی سمجھ کر یہ فتوٰی لگایا کہ سری نمازوں میں جو شخص نہ پڑھے اس کی نماز باطل ہے۔ الخ (ص ۳۲ خیر الکلام)

(۳) بعض حنفیہ (احسن الکلام ص ۲۴) نے علامہ کی عبارت سے قرأ امامہ امام پڑھ رہا ہو گا جملہ حذف کر دیا ہے پھر امام احمد بن حنبلؒ سے یہاں اوزاعیؒ اور لیثؒ کا نام بھی نقل کر دیا ہے حالانکہ امام ابن عبد البرؒ نے ان دونوں سے فاتحہ کی فرضیت نقل کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ کو ان کے اس قول کا علم نہیں۔ الخ (ص ۳۳ و ۳۴)

الجواب: یہ ہے فریق ثانی کے رئیس المحدثین قدوۃ السالکین اور استاذ الاساتذہ کا جواب جس میں ایک رتی جان بھی نہیں ہے۔ ترتیب وار سنیئے:

ا۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ سکتات کا مسئلہ نہیں بیان فرما رہے ہے بلکہ تصریح کرتے ہیں کہ جہری

نمازوں میں امام کے پیچھے مطلق قرأۃ نہ کرنے والے کی نماز تمام اہل اسلام کے نزدیک جائز ہے اور اس کا ایک شخص بھی منکر اور مخالف نہیں ہے۔ اگر امام احمد بن حنبلؒ کے علم میں یہ ہوتا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (یا کوئی اور) اس کا مخالف ہے تو باوجود قرب زمانے کے بلکہ امام شافعیؒ کا شاگرد ہونے کے (دیکھیے تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۷۲) کبھی یہ دعویٰ نہ کرتے کہ اہل اسلام میں اس کا کوئی قائل نہیں۔ چودھویں صدی کے مجتہدین کا تو انہیں کوئی علم نہ تھا کہ ان کے لیے کوئی گنجائش چھوڑ دیتے حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا یہ ارشاد امام شافعیؒ کے مسلک کی وضاحت کے لیے ایک مستقل دلیل ہے اور اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے کہ امام کے پیچھے قرأت ترک کرنیوالے کی نماز بالکل صحیح ہے۔

۲۔ امام احمد بن حنبلؒ تو جہری نمازوں میں تمام اہل اسلام کا اتفاق نقل فرماتے ہیں۔ پھر ان کی عبارت کا مطلب چونکہ یہ مسئلہ اختلافی ہے الخ کس طرح صحیح ہوا۔ رہا سری نمازوں کے بارے میں مصنف خیر الکلام کا یہ فرمانا کہ چونکہ دلیل نہیں ..... الخ (محصلہ) ممکن ہے اس چونکہ سے ان کے حواری تو شاید مطمئن ہو جائیں مگر علمی دنیا کبھی اس چونکہ سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ سری نمازوں میں بھی عدم قرأت کی دلیل ایک نہیں کئی ٹھوس دلائل ہیں اور صرف ایک برہان نہیں بلکہ متعدد براہین موجود ہیں۔ اور یہ مسئلہ بھی خاصا اختلافی ہے اور جو حضرات پڑھنے کے قائل ہیں۔ مثلاً: امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ تو وہ بھی سری نمازوں میں وجوب کے قائل نہیں ہیں سوائے گنے چنے چند حضرات کے کوئی امام سری نمازوں میں قرأۃ نہ کرنے والے کی نماز کے بطلان کا ہرگز قائل نہیں اور یہی جمہور کا مسلک ہے۔

۳۔ قدوۃ السالکین کا تعصب ملاحظہ ہو کہ یہ حسن ظنی ان کے قلب مبارک میں پیدا ہی نہیں ہوتی کہ یہ لفظ چھوٹ گیا ہے بلکہ فرماتے ہیں حذف کر دیا ہے اور خیر الکلام ص ۵۵۶ مناقشہ ۹ میں لکھا ہے کہ اس عبارت میں سے جملہ وقرأ امامہ اور اس کا امام پڑھتا ہو چھوڑ دیا ہے تاکہ جہری و سری سب نمازوں کو یہ فتویٰ شامل ہو۔ انتہیٰ بلفظہ۔ فریق ثانی کے رئیس المحدثین کو معلوم ہونا چاہیے کہ احسن الکلام جلد ۱ ص ۲۲۴ پر جہاں یہ عبارت نقل کی گئی ہے اس کے ترجمہ میں یہ لفظ موجود ہیں کہ جب امام جہر سے قرأۃ کرتا ہو الخ اس کی موجودگی میں یہ احتمال کہاں سے اور کیونکر پیدا ہوا کہ سری نمازیں بھی اس میں شامل ہوں جب کہ راقم کے نزدیک سری کو یہ شامل ہی نہیں تو سب کو شامل

ہونے کا کیا معنیٰ؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ چارسو صفحات کی کتاب میں کسی ایک آدھ جملہ کا چھوٹ جانا یا کتابت میں غلطی کا واقع ہونا غیر اغلب نہیں ہوتا۔ آپ کے ذہنِ مبارک سے اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ کیوں نکل گیا؟ باقی امام عبدالبرؒ سے بدرجہا زیادہ امام احمدؒ بن حنبلؒ امام اوزاعیؒ اور امام لیثؒ کے مسلک کو جانتے ہیں۔ مجتہد مطلق بھی ہیں اور قرب زمانہ بھی ہے اور یہ حوالہ علامہ ابنِ قدامہؒ کے علاوہ اور دیگر ثقہ اور ثبت حضرات محدثینِ عظامؒ نے بھی نقل فرمایا ہے۔ اس لیے اس سلسلہ میں امام احمدؒ بن حنبلؒ کا علم بالکل صحیح ہے اور مؤلف خیر الکلام کی بات پرِکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔

اقرار کے ساتھ انکار کی دم:

مصنف خیر الکلام نے جب بخوبی یہ محسوس کر لیا کہ حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ کی اس ٹھوس اور واضح عبارت کے جواب میں میری لکھی ہوئی سینہ زاد باتیں ناکام ہیں تو آخر میں اقرار بھی کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ پس زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام احمدؒ بن حنبلؒ کے قول کا مطلب وہی ہے جو ناقل (سرفراز) نے سمجھا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ امام احمدؒ بن حنبلؒ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی تاویل کی ہے اور صحابہ کرامؓ کے اقوال ان کو بسند صحیح نہیں پہنچے۔ مگر امام بخاریؒ اور دیگر محدثینؒ کو وہ اقوال بسند صحیح پہنچ گئے اس لیے انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہے۔ اس کی تاویل نہیں کی جیسا کہ امام احمدؒ بن حنبلؒ نے تاویل کی ہے۔ الیٰ ان قال ہر صورت اس اختلافی مسئلہ میں ایک امام کی رائے ہے جو دوسرے ائمہ حدیث خصوصاً امام بخاریؒ (جو بنقل حافظ ابن حجرؒ امام احمدؒ سے فقہ اور حدیث میں بیسیوں گنا سے زیادہ ہیں۔ مقدمہ فتح الباری صہ ۴۸۲) کی رائے کے خلاف ہے پس کسی صورت میں یہ قابل التفات نہیں۔ (خیر الکلام صہ ۳۴ و ۳۵)

الجواب: حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ اس مقام پر اہلِ اسلام کا متفقہ فیصلہ اور ائمہ مذکورین کا اجماع نقل کر رہے ہیں کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے والے کی نماز فاسد اور باطل ہونے کا کوئی قائل نہیں۔ حدیث کی تاویل اور عدم تاویل کا ذکر وہ یہاں نہیں فرما رہے وہ تو اہلِ اسلام کا متفقہ فیصلہ نقل فرما رہے ہیں اور حضرات صحابہ کرامؓ کے اقوال اگر امام احمدؒ بن حنبلؒ کو بسند صحیح نہیں پہنچے تو

اور کس کو پہنچے ہیں؟ اور جو اقوال حضرت امام بخاریؒ کو بقول مصنف خیر الکلام بسند صحیح پہنچے ہیں ان کا حال بھی اپنے مقام پر احسن الکلام جلد دوم میں واضح کر دیا گیا ہے جن کو مؤلف مذکور نے تنکوں کا سہارا دے کر تھامنے کی بے جا سعی کی ہے مگر سنبھلے پھر بھی نہیں۔ رہا یہ کہ امام بخاریؒ امام احمدؒ بن حنبلؒ سے بیس گنا فقہ و حدیث میں زیادہ ہیں۔ صرف عقیدت کی نقل سے کچھ نہیں بنتا۔ اس کا قائل اور اس کا درجہ معلوم ہونا چاہیے اور اس کی علمی شہرت اور اکثر امت کا اعتماد باحوالہ درکار ہے۔ محض نقل کی حیثیت کیا ہے؟ اور اگر وہ کوئی معتبر امام ہے تو یہ صرف ان کی غلو فی العقیدت کا اظہار ہے۔ حضرت امام بخاریؒ کا جو مقام حدیث و فقہ میں ہے اس کا کون منکر ہے یا ہو سکتا ہے؟ لیکن حدیث و فقہ میں جو مقام حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ کا ہے وہ حضرت امام بخاریؒ کا نہیں ہے اس لیے کہ حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ بالاتفاق ائمہ مجتہدین میں شمار ہوتے ہیں اور حضرت امام بخاریؒ کے متعلق مختلف آرا ہیں کوئی ان کو مجتہد مطلق کہتا ہے اور کوئی مجتہد فی المذہب کہتا ہے۔ اور امام سبکیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ ان کو شافعی بتاتے ہیں ہم نے بقدر ضرورت طائفہ منصورہ میں اس پر باحوالہ بحث کی ہے اور امام بخاریؒ بقول حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فقہی مسائل میں امام شافعیؒ اور امام ابو عبیدؒہ کے خوشہ چین اور ان کی کتب سے استمداد کرتے ہیں۔ اس لیے دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے لیے دونوں دل کا نور اور آنکھوں کا سرور ہیں مگر فرق مراتب ضرور ہے لہٰذا حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ کے اس واضح اور روشن حوالہ کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ علمی دنیا میں اس کو باور کرنے کے لیے کوئی تیار ہے اور یہ صرف امام حضرت احمدؒ بن حنبلؒ ہی کی رائے نہیں بلکہ جمہور حضرات صحابہ کرامؓ تابعینؒ اتباع تابعینؒ اور ائمہ دینؒ کی رائے ہے اور اتنی بڑی وزنی رائے ہے جس نے فریق ثانی کے اس غلو اور بے جا تعصب کا بھیجا نکال دیا ہے کہ قرأۃ خلف الامام نہ کرنے والوں کی نماز بے کار، باطل اور کالعدم ہے۔ اس لیے امام احمدؒ بن حنبلؒ کی اس مسئلہ میں لاعلمی کا دعویٰ (جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے) بالکل بے بنیاد اور سراسر مردود ہے۔ عجب نہیں کہ مؤلف مذکور یہ کہہ دیں: ؎

مگر میں نے تو اپنا فائدہ انکار میں دیکھا

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعین عظامؒ اور بعض دیگر ائمہؒ (جن سے آپ ماسبق حواشی میں اچھی طرح روشناس ہو چکے ہیں) کا یہ فیصلہ دیکھ لیجئے۔

اور فریقِ ثانی کے مفسدینِ صلوٰۃ اور بے نماز ہونے کے خالص متعصبانہ فتوے اور مباہلہ کے اعلان اور فراخ دلی سے انعامی چیلنج ملاحظہ کر لیجیے اور پھر فرمائیے کہ تکفیر کس کی ہوگی؟ اور بے نماز کون ہوگا؟ مفسدِ صلوٰۃ کون ہوگا؟ اور مباہلہ کس سے ہوگا؟ تارکِ سنت کون ہوگا اور انعامی شاہی چیلنج کا مستحق کون ہوگا؟ افسوس ہے کہ فریقِ ثانی نے تعصب اور کم فہمی کی وجہ سے ایسا ایٹم بم ایجاد کر لیا کہ اس کی زد سے نہ بڑے بڑے ائمہ بچ سکتے ہیں اور نہ حضرات تابعینؒ بلکہ حضرات صحابہ کرامؓ اور حتیٰ کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی بھی ان کے لایعنی فتووں سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ ثم العیاذ باللہ تعالیٰ) دیکھئے اس ناروا فتوے کی زد سے کون بچ سکتا ہے؟ ؎

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی!

باوجود اس کے کہ حق جمہور کے ساتھ ہے اور سو فیصدی ان کی رائے درست اور صحیح ہے۔ مگر وہ فریقِ ثانی کی طرح اس مسئلہ میں (بلکہ دیگر تمام اختلافی مسائل میں) نہ تو مجوزین قرأۃ خلف الامام کی تکفیر کرتے ہیں اور نہ قسم اٹھا کر ان کو بے نماز اور مفسدینِ صلوٰۃ کہتے ہیں اور نہ ان کو مباہلہ کا چیلنج دیتے ہیں۔ بلکہ جن اکابر (مثلاً امام بخاریؒ و امام بیہقیؒ وغیرہ) نے اپنی انتہائی وسعت اور کوشش صرف کر کے جمہور کی رائے کے ساتھ اختلاف رائے کیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان کو معذور تصور کرتے ہیں بلکہ ماجور بھی سمجھتے ہیں اور ائمہ دین اور دیگر حضرات سلف صالحینؒ کی نسبت بدظنی اور سوءِ اعتقاد کو کسی طرح بھی روا نہیں سمجھتے: ؎

وفاؤں کے ہزاروں دے چکے ہیں امتحاں اب تک
مگر وہ ہیں کہ اس پہ بھی ہیں ہم سے بدگماں اب تک

اگر بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے تو فریقِ ثانی کے بے بنیاد اور ہوا دعووں اور فتووں کا جواب تو اس مقدمہ ہی سے پورا ہو جاتا ہے اور مزید کوئی چیز پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مگر چونکہ ہم تہیہ کر چکے ہیں کہ مسئلہ زیرِ بحث کو پوری طرح بے نقاب کرنا ہے۔ اس لیے ہم مقدمہ کے بعد اصل بحث اور اس کے دلائل عرض کرتے ہیں ——— لیکن بابِ اوّل شروع کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم امام ترمذیؒ[1] (المتوفی ۲۷۹ھ) اور علامہ بدر الدین عینیؒ[2]

---

[1] و [2] کا مکمل حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے۔

(المتوفی ۸۵۵ھ) کی بعض عبارتوں کو یہیں حل کرتے جائیں، جن سے بہت ممکن ہے کہ بعض اہلِ علم کو مغالطہ لگ جائے اور طالب علموں کا غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا تو بہت اغلب ہے، رہے وہ حضرات جو غلط فہمی اور مغالطہ کو متاعِ عزیز سمجھ کر سینہ سے لگائے پھرتے ہیں۔ ان کے لیے ہمارے پاس کوئی علاج اور دوا موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی صرف اسی کو ہدایت دیتا ہے جو دل میں اس کی تڑپ اور جذبہ پیدا کرے۔ اور عملاً اس کی طرف پیش قدمی کرے ورنہ اس دربارِ عالی سے بھی محرومی کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا: ؎

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

امام ترمذیؒ تحریر فرماتے ہیں: اکثر اہلِ علم جن میں حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ شامل ہیں اور خاص طور پر امام مالکؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، شافعیؒ، احمدؒ اور اسحاقؒ کا یہ مسلک ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قرأۃ کرنی چاہیے (ترمذی جلد ۱ ص۴۱) ہم پہلے امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام عبداللہ بن مبارکؒ امام اسحٰقؒ اور

(پچھلے صفحے کے حاشیے) ۵؎ امام ترمذیؒ، علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور الحافظ لکھتے ہیں۔ صحاح ستہ میں جو مشہور کتاب "الجامع" ہے۔ وہ انہی کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ کتاب "العلل" بھی انھوں نے لکھی ہے۔ حافظہ میں وہ ضرب المثل تھے۔ (تذکرہ ۲ ص۱۸۷) مگر افسوس یہ امام عالی مقام بھی جرح سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چنانچہ علامہ ابن حزمؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ ترمذی صاحب الجامع مجہول ہیں (میزان الاعتدال جلد ۳ ص۱۱۷) اگر امام ترمذیؒ مجہول ہیں تو دنیا میں معروف کون ہوگا؟

۲؎ علامہ بدر الدین عینیؒ، مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ (المتوفی ۱۳۰۴ھ) لکھتے ہیں کہ وہ امام، عالم، علامہ عالم بالعربیۃ والتصریف اور حافظ لغت تھے۔ نیز لکھتے ہیں کہ اگر ان میں مذہبی تعصب نہ ہوتا تو کیا خوب ہوتا (فوائد البہیہ ص۲) بعض غیر مقلد حضرات علامہ عینیؒ کے تعصب پر مولانا لکھنویؒ کی یہ عبارت لیے لیے پھرتے ہیں۔ لیکن یہ تو فرمائیں کہ ذرعی تعصب سے کون امام بچ سکا ہے۔ علامہ ذہبیؒ جن کے بعد آج تک کوئی ناقد رجال پیدا نہیں ہوا۔ اور حافظ الدنیا ابن حجرؒ بھی ان کے ناقد رواۃ ہونے پر نہ صرف اعتماد کرتے ہیں بلکہ ان کے خوشہ چین بھی ہیں۔ (شرح نخبۃ الفکر ص۱۱۱) معہٰذا شیخ الاسلام تاج الدین سبکیؒ لکھتے ہیں کہ ذہبیؒ بڑے متعصب ہیں وہ ہمارے استاد ہیں اور ہم پر ان کا حق ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا حق ان پر مقدم ہے ہم جو کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ کسی حنفی یا شافعی کے حق میں ذہبی

بن راہویہ کا مسلک پوری وضاحت سے نقل کر آتے ہیں کہ جہری نمازوں میں ان میں کوئی بھی قرأۃ خلف الامام کا قائل نہ تھا اور سِرّی نمازوں میں امام مالکؒ ، امام احمدؒ اور عبداللہؒ بن مبارکؒ وغیرہ وجوب قرأۃ کے قائل نہ تھے ۔ اور خود امام ترمذیؒ نے امام عبداللہؒ بن مبارکؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں : بعض لوگوں نے تشدد سے کام لیا ہے لیکن میرے نزدیک جس شخص نے امام کے پیچھے قرأۃ نہ کی اس کی نماز صحیح ہے ۔ (ترمذی جلد ۱ ص ۴۲)

اندریں حالات اگر کسی کو امام ترمذیؒ کی اس عبارت سے کوئی شک اور شبہ پیدا ہو ۔ تو ہرگز صحیح نہیں ۔ المعصوم من عصمہ اللہ تعالیٰ ۔ لیجیے ہم آپ کو ترمذیؒ کی اسی عبارت کی شرح مولانا مبارک پوری صاحبؒ کے حوالہ سے سناتے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

فیہ اجمال ومقصودہ ان ھؤلاء الائمۃ کلھم یرون القرأۃ خلف الامام اما فی جمیع الصلوات او فی الصلوٰۃ السرّیۃ فقط واما علی سبیل الوجوب او علی سبیل الاستحباب والاستحسان ۔

کہ امام ترمذیؒ کا یہ قول مجمل ہے ۔ ان کی مراد یہ ہے کہ یہ ائمہ مذکورین امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل تھے ۔ بعض سب نمازوں میں اور بعض صرف سری نمازوں میں ۔ بعض وجوب کے قائل تھے اور بعض صرف استحباب اور استحسان کے ۔

(تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۴)

اور تصریح کرتے ہیں کہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کے وجوب کے قائل نہ تھے ۔ (ایضاً ص ۲۵۷) اور لکھتے ہیں کہ امام عبداللہؒ بن مبارکؒ بھی امام کے پیچھے وجوب قرأۃ کے قائل نہ تھے ۔ (ایضاً ج ۱ ص ۲۵۷)

رہا یہ کہ تمام نمازوں میں قرأۃ خلف الامام کا قائل کون تھا ؟ اور پھر خاص طور پر وجوب کا جہاں تک راقم الحروف کے محدود مطالعہ کا تعلق ہے ۔ ان ائمہ میں سے جن کا تذکرہ امام ترمذیؒ نے کیا ہے ۔ ایک بھی ایسا نہیں جو تمام نمازوں میں قرأۃ خلف الامام کا قائل ہو اور خاص طور پر وجوب کا ۔ اگر مولانا مبارکپوری صاحبؒ کو امام شافعیؒ کے مسلک میں غلط فہمی ہوئی ہو ۔ تو ہم پوری وضاحت اور

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) کا قول مسموع نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ وہ شافعیوں اور حنفیوں کے حق میں اکثر تعصب سے کام لیتے ہیں ۔ (طبقات الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۹۱) والعصمۃ بید اللہ تعالیٰ وحدہ ۔

اور صراحت کے ساتھ امام شافعیؒ کا مسلک عرض کر چکے ہیں۔ علامہ عینیؒ لکھتے ہیں کہ

واستدل بهذا الحديث عبد الله بن المبارك والاوزاعي ومالك والشافعي واحمد واسحق وابو ثور وداؤد على وجوب قرأة الفاتحة خلف الامام في جميع الصلوات انتهى بلفظه۔ (عمدة القاری ج۳ ص۶)	یعنی حضرت عبادہؓ کی (لا صلوٰۃ لمن لم یقراء بام القرآن) کی روایت سے امام ابن مبارکؒ، امام اوزاعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ، امام اسحاقؒ، امام ابو ثورؒ[۱] اور امام داؤد ظاہریؒ نے یہ استدلال کیا ہے کہ تمام نمازوں میں قرأت فاتحہ خلف الامام واجب ہے۔

اس عبارت سے غلط فہمی پیدا نہ ہونی چاہیے:

اولاً اس لیے کہ ہم ان حضرات ائمہ کرام رحمہم اللہ کی عبارتیں پوری تشریح کے ساتھ اور خود فریق ثانی کے محدث جلیل اور وکیل اعظم مولانا مبارکپوری صاحبؒ کے اقرار کے ساتھ نقل کر آتے ہیں کہ یہ ائمہ تمام نمازوں میں وجوب قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ امام ابو ثورؒ کے علاوہ باقی ائمہ کرامؒ کی عبارتیں پہلے نقل کی جا چکی ہیں اور ان کا مسئلہ زیر بحث کے متعلق محقق مسلک بھی عرض کیا جا چکا ہے۔ امام ابو ثورؒ کا صحیح مسلک علی التعیین معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی پیش کردہ سابق عبارتوں سے بظاہر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ جہری نمازوں میں وہ بھی امام کے پیچھے قرأۃ کو شاذ اور خلاف اجماع ہی سمجھتے ہوں گے اور اسی صفحہ کے حاشیہ سے انکا مسلک یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں ان کی رائے اور تحقیق وہی تھی جو حضرت امام شافعیؒ کی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وثانیاً علامہ عینیؒ کی اسی عبارت پر گرفت کرتے ہوئے مولانا مبارکپوریؒ صاحب لکھتے ہیں:

---

[۱] امام ابو ثورؒ (المتوفی ۲۴۰ھ) علامہ ذہبی لکھتے ہیں: کہ وہ الامام، المجتہد اور الحافظ تھے۔ امام نسائیؒ ان کو ثقہ اور مامون اور احد الفقہاء کہتے ہیں۔ امام ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ وہ فقہ، علم، ورع، فضیلت، تصنیف کتب اور تشریح سنت میں دنیا کے اماموں میں ایک تھے۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۸۷) علامہ خطیب لکھتے ہیں کہ وہ احد الثقات المامونین ومن الائمۃ الاعلام فی الدین تھے۔ (بغدادی جلد ۶ ص ۶۵) حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ پہلے اپنی رائے اور فقہ پر کاربند تھے۔ جب حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بغداد تشریف لے گئے تو امام موصوف نے اپنے مسلک سے رجوع کر لیا اور امام شافعیؒ کے پاس آتے جاتے رہے۔ (تہذیب جلد ۱ ص ۱۱۹) اس سے بظاہر یہ متبادر ہوتا ہے کہ امام شافعیؒ کا مسلک اختیار کر لیا تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قلت هذا وهم من العینی فان عبد الله بن المبارك لم یکن من القائلین بوجوب القرأة خلف الامام کما عرفت وکذالك الامام مالك والامام احمد لم یکونوا قائلین بوجوب قرأة الفاتحة خلف الامام فی جمیع الصلوٰت۔ انتہی

(تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷)

میں کہتا ہوں کہ یہ امام بدر الدین عینیؒ کا وہم ہے کیونکہ عبد اللہ بن مبارک امام کے پیچھے وجوب قرأۃ کے قائلین میں نہ تھے جیسا کہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے اور اسی طرح حضرت امام مالکؒ اور امام احمد بھی تمام نمازوں میں سورۃ فاتحہ کے امام کے پیچھے پڑھنے کے وجوب کے قائل نہ تھے۔

مولانا مبارکپوری صاحبؒ کا یہ ارشاد فرمانا بالکل صحیح ہے۔ یہ یقیناً علامہ عینیؒ کا وہم اور ان کے سرعت قلم کا نتیجہ ہے۔ ورنہ دلائل اور براہین کے رو سے ان ائمہ کا جن کا ذکر علامہ موصوف نے کیا ہے مسلک با دلائل نہایت شرح وبسط کے ساتھ اپنے موقع پر بیان ہوگا اور اجمالی طور پر بقدر کفایت مقدمہ میں ذکر ہو چکا ہے۔

ہمیں اچھی طرح اس امر کا احساس ہے کہ سلسلۂ کلام دراز سے دراز تر ہوتا جا رہا ہے اور شاید کہ آپ مقدمہ کی طوالت سے ہی گھبرا جائیں۔ حالانکہ ہم نے ابھی بہت کچھ عرض کرنا ہے۔ اس لیے ہم مقدمہ کو انہی اقتباسات پر ختم کرتے ہیں اور فریقِ ثانی کی خدمت میں نہایت اخلاص سے عرض کرتے ہیں کہ وہ کوئی ایسا غیر محتاط لفظ زبان سے نہ نکالے جس کی زد میں اکثر امت اور جمہور سلف صالحینؒ آجائیں۔ کیونکہ ہم لوگوں تک حدیث کے پہنچانے کا واحد ذریعہ یہی لوگ ہیں اور ان پر برسنے والا گویا بالواسطہ حدیث پر برس رہا ہے۔ اور ان کی گستاخی کرنے والا کبھی حدیثِ رسول کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا: ؎

تا دامن آکے چاکِ گریباں نے دم لیا
ہے دامن اور جیب میں رشتہ قریب کا

نوٹ: قرآن کریم کی ضروری تشریح حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ کے فوائد سے ماخوذ ہے اور طبقات ابن سعد، شذرات الذہب، تہذیب الاسماء اور ابن خلکان وغیرہ میرے پیش نظر نہیں ہیں۔ ان کتابوں کے حوالے تابعین اور غلامانِ اسلام سے ماخوذ ہیں۔ باقی جملہ کتابوں سے میں نے براہ راست استفادہ کیا ہے۔ الا ماشاء اللہ تعالیٰ اور حوالہ جات میں صحت کی ہر ممکن کوشش مد نظر رکھی گئی ہے۔

ابو الزاہد

باب اوّل

اصل دین آمد کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیثِ مصطفیٰ بر جاں مسلّم داشتن

اہلِ اسلام سے یہ بات ہرگز مخفی نہیں کہ جو رتبہ، درجہ اور قطعیت اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کی کتاب کو حاصل ہے۔ وہ یقیناً دنیا میں کسی اور کلام اور کتاب کو حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دلائل اور براہین کے موقع پر مسلمانوں کے ہاں سب سے پہلا نمبر صرف قرآنِ کریم کو حاصل ہے۔ اس لیے کہ قرآنِ کریم کا ایک ایک حرف اور ایک ایک جملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اس میں کسی انسان کی دماغی محنت اور کاوش کو کوئی دخل نہیں ہے۔ بخلاف احادیث کے کیونکہ پہلے ہر حدیث کو نقل بالتواتر کا درجہ حاصل نہیں ہے جیسا کہ قرآنِ کریم کو حاصل ہے اور پھر احادیث میں نقل بالمعنیٰ[1] کا بھی کافی دخل ہے جیسا کہ فن حدیث سے تعلق رکھنے والوں پر یہ بات مخفی نہیں ہے۔ لہٰذا یہ امر یقینی ہے کہ جس گروہ کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے ثبوت ہوگا۔ اس کا مسلک حق اور صحیح ہوگا اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ الحمد للہ تعالیٰ کہ امام کے پیچھے قرأۃ

---

[1] بلکہ امام سیوطی وغیرہ نے تو یہاں تک دعوے کیا ہے فان اکثر الاحادیث مروی بالمعنی۔ (الاقتراح ص ۱۹) یعنی اکثر احادیث جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بقید الفاظ مروی نہیں ہیں۔ بلکہ راویوں نے احادیث کے معانی کو اپنے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

ترک کرنے پر جمہور کے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب سے قطعی اور محکم دلیل موجود ہے۔

قرآنِ کریم کے آداب :

اس سے قبل کہ ہم قرآنِ کریم کی وہ آیت اور اس کی تفسیر اور تشریح نقل کریں جس سے ہم استدلال کرتے ہیں یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کے عمومی آداب پر غور اور فکر کر لیں کہ جس وقت اور جس مقام پر قرآن کریم کی قرأۃ اور تعلیم و تدریس اور تلاوت ہوتی ہو وہاں سامعین کو کیا کرنا چاہیے ؟ اور اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ان کو کیا ادب سکھلایا ہے ؟ اگر اسی ایک پہلو پر سرسری غور کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ کافی حد تک بحث اسی سے حل اور طے ہو جائے۔ ہم قرآن کریم کی چند آیات اور احادیث اور علماء کرام کی بعض عبارتیں اور نقول عرض کرتے ہیں جن سے سامعین کے آداب پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ اور قرآن کریم کے آداب کا قابلِ تعظیم پہلو بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے۔ ملاحظہ کریں۔

(۱) شروع شروع میں جس وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کریم لاتے۔ ان کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی دل میں پڑھتے جاتے تھے تاکہ جلد اسے یاد کر لیں اور سیکھ لیں۔ مبادا حضرت جبرائیلؑ چلے جائیں اور وحی پوری طرح محفوظ نہ ہو سکے۔ ظاہر بات ہے کہ اس صورت میں پوری طرح سننے اور سمجھنے میں دقت ہوتی تھی۔ ارشاد ہوا کہ آپ ہمہ تن متوجہ ہو کر سنیں۔ جس وقت حضرت جبرائیلؑ پڑھیں۔ آپ اس وقت خاموش ہو کر توجہ کریں اور سنیں اور زبان مبارک کو حرکت نہ دیں۔ قرآن کریم کا حرف بحرف جمع کرنا اور آپ کی ذات سے پڑھوانا ہمارے ذمے ہے۔ آیات ملاحظہ کریں :

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ٥ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ٥ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ٥ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ٥ (پ ۲۹ ۔ قیمٰۃ ع ۱)	نہ حرکت دیجیے قرآن کے پڑھنے میں اپنی زبان کو تاکہ آپ جلدی اس کو سیکھ لیں۔ اس کا جمع کرنا اور اس کا (آپ کی زبان سے) پڑھنا ہمارے ذمہ ہے اور جب ہم (بزبان فرشتہ) پڑھیں تو آپ ان کے پڑھنے کی اتباع کریں۔ پھر ہمارا ذمہ ہے اس کو کھول کر بتلانا

ان آیات سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی تعلیم و تدریس اور تلاوت کے وقت سامعین کو خاموش رہ کر پوری

دلجمعی اور توجہ کے ساتھ قاری اور تالی کی قرأۃ سننی چاہیئے۔ کیونکہ قرآن کریم کے آداب اور اتباع اور اس کی تعظیم وتکریم کا یہی واضح پہلو ہے۔

مصنف خیر الکلام نے اپنی عادت کے مطابق کہ چپ نہ رہ سکوں یہ فرمایا ہے کہ اس آیت کا قرآن کریم کی تعظیم واحترام سے کوئی تعلق نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ آپ کو اس سے پہلے قرآنی آداب کا علم نہ تھا۔ اور یہ بات سراسر غلط ہے اور نیز لازم آئے گا کہ استاد جب تک سبق ختم نہ کرے شاگرد کا پڑھنا بے ادبی ہو تو پھر پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ ہی چھوڑ دیا جاتے بلکہ اس کا مطلب جیسا کہ بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے یہ ہے کہ قرآن کے اتارنے سے آپ کو سخت تکلیف برداشت کرنی پڑتی تھی۔

(بخاری جلد ۱ ص ۳) (محصلہ خیر الکلام ص ۳۶۲، ۳۶۳)

الجواب:

یہ جو کچھ کہا ہے محض دفع الوقتی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ

هٰذا تعليم من الله عزّ وجلّ لرسوله صلى الله عليه وسلم في كيفية تلقيه الوحي من الملك فانه كان يبادر الى اخذه ويسابق الملك في قرأته فامره الله عزّ وجل اذا جاءه الملك بالوحي ان يستمع له وتكفل الله ان يجمعه في صدره ..... الخ

(تفسیر جلد ۴ ص ۴۴۹)

اس میں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم دی گئی ہے کہ فرشتہ سے وحی کس کیفیت سے حاصل کرنی ہے کیونکہ آپ وحی کے لینے میں جلدی کرتے اور فرشتہ سے اس کی قرأۃ میں مسابقت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ جب فرشتہ وحی لائے تو آپ توجہ فرمائیں اور قرآن پاک کو آپ کے سینہ میں محفوظ کر دینے کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود اٹھالیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ اس آیت کے نزول سے پہلے اس طرح پڑھنے کو خلاف ادب نہ سمجھتے تھے لیکن آپ پر واضح کر دیا گیا ہے کہ آپ کا کام استماع ہے ساتھ ساتھ پڑھنا نہیں ہے باقی حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہمارے مطلب کے خلاف نہیں ہے کیونکہ آپ اسی خیال سے پڑھتے تھے کہ مبادا بھول نہ جاؤں سو آپ پر منکشف کر دیا گیا کہ آپ بھولیں گے بھی نہیں اور اس طرح قرآن کریم کا ادب بھی ملحوظ رہے گا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف خیر الکلام

الف با تا پڑھنے والے ابجد خوانوں کو ذہن مبارک میں جگہ دیے ہوتے ہیں جبھی تو فرماتے ہیں کہ پڑھنا پڑھانا ختم ہو جائے گا۔ بات اُن کی ہو رہی ہے جو سن کر تدبر اور قرآن کریم کے مضمون پر غور و خوض کر سکیں اور ان کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ پہلے سُن لیں پھر لب کشائی کریں۔ بچوں کی بات نہیں ہو رہی۔

(۲) ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ سے خطاب فرمایا ہے:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا (پ ۱۶ طٰہٰ رکوع ۷)

اور آپ جلدی نہ کریں قرآن کے لینے میں جب تک پورا نہ ہو جایا کرے اس کا اترنا۔ اور کہیے اے میرے رب زیادہ کر علم میرا اور سمجھ۔

یہ آیت بھی اس امر کو صراحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ تلاوت اور قرأت قرآن کریم کے وقت سامعین کو پورے تدبر اور انہماک کے ساتھ قرآن سننا چاہیے اور خود ساتھ ساتھ پڑھنے کی کوشش اور کاوش نہیں کرنی چاہیے۔

(۳) بعثتِ محمدی سے پہلے جنّوں کو کچھ آسمانی خبریں معلوم ہو جاتی تھیں۔ جب آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر وحی آنا شروع ہوئی تو وہ سلسلہ بند ہو گیا اور بہت کثرت سے شہب کی مار پڑنے لگی۔ جنوں کو خیال ہوا کہ ضرور کوئی نیا واقعہ رونما ہوا ہے جس کی وجہ سے آسمانی خبروں پر بہت زیادہ سخت پہرے بٹھلائے گئے ہیں۔ اسی کی تلاش و جستجو کے لیے جنوں کے مختلف گروہ مشرق و مغرب میں پھیل پڑے۔ ان میں سے ایک جماعت بطن نخلہ (مکہ مکرمہ کے پاس ایک مقام کا نام ہے) کی طرف سے گذری۔ وہاں اتفاق سے اس وقت آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے چند اصحاب کے ساتھ نماز فجر ادا کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جنوں کی اس ٹکڑی کا رُخ قرآن کریم سننے کے لیے ادھر پھیر دیا۔ قرآن کریم کی آواز ان کو بہت عجیب اور مؤثر و دلکش معلوم ہوئی اور اس کی عظمت اور ہیبت دلوں پر چھا گئی۔ آپس میں کہنے لگے کہ چپ رہو اور خاموشی کے ساتھ یہ کلام پاک سنو۔ آخر قرآن کریم نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا۔ وہ سمجھ گئے کہ یہی نئی چیز ہے جس نے جنوں کو آسمانی خبروں سے روکا ہے۔ بہر حال جب آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قرآن کریم پڑھ کر فارغ ہوتے تو یہ لوگ

اپنے دلوں میں ایمان وایقان کا موجزن سمندر لے کر واپس ہوئے اور اپنی قوم کو نصیحت کی جس کی پوری تفصیل سورۂ جن میں کی گئی ہے اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی اسی سورت کے ذریعہ سے ان کا پورا قصہ اور واقعہ بتلایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ صَرَفْنَا اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ۔

(پارہ ۲۶، احقاف ۴)

اور جب متوجہ کر دیا۔ ہم نے جنوں کا ایک گروہ آپ کی طرف وہ سننے لگے قرآن، پھر جب وہ وہاں پہنچے، بولے چپ اور خاموش رہو۔ پھر جب قرآن ختم ہوا تو اپنی قوم کی طرف چلے گئے تاکہ ان کو خدا تعالیٰ کی مخالفت اور عذاب سے ڈرائیں

اللہ تعالیٰ نے اس مضمون میں جنوں کے اس گروہ کی تعریف بیان کی ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ پوری توجہ کے ساتھ خاموش رہ کر قرآن کریم کی قرأۃ سنی بلکہ اس کار خیر پر دوسروں کو بھی آمادہ کیا اور مرد مومن کی بھی یہی عادت اور خصلت ہونی چاہیے کہ قرأۃ قرآن کے وقت خود چپ رہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرے۔ مؤلف خیر الکلام کہتے ہیں کہ یہ خاموشی ادب و احترام کے لیے نہ تھی، تحقیق حال کے لیے تھی کیونکہ دوسری جگہ ثابت ہے کہ جب آپ نے سورۂ رحمٰن پڑھی تو جنات جواب دیتے تھے۔ (محصلہ صد ۳۶۴)

الجواب:

جنوں کا خاموش رہنا خالص ادب اور احترام کے لیے تھا اگرچہ وہ اس وقت تک مسلمان نہ تھے مگر بات سمجھنے کی اور خدائی کلام کی تعظیم کی اہلیت ان میں تھی۔ علاوہ ازیں قرآن کریم کے مضامین پر مطلع ہونا اور اس سے آگاہی حاصل کرنا آپ کو کیوں ناگوار ہے؟ آپ بھی استماع وانصات سے کام لیں۔ رہا سورۂ رحمٰن میں جنوں کا جواب تو یقین رکھیے کہ وہ ساتھ ساتھ سورۂ رحمٰن ہرگز نہ پڑھتے تھے۔ جب آپ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا الآیۃ کی قرأۃ مکمل کر چکتے تو اس کے بعد جنات تائید میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اقرار کرتے تھے جیسا کہ مقتدی جہری نمازوں میں آمین کہکر تائید کرتے ہیں کیونکہ ساتھ ساتھ پڑھنا تو خلاف اجماع اور شاذ ہے۔ کما مَرّ اور سکتات کا صحیح احادیث میں کہیں وجود نہیں ہے۔

(۴۳) اللہ تعالیٰ کافروں اور مشرکوں کے ایک بڑے منصوبے کا تذکرہ یوں کرتا ہے اور اس کے بعد ان کو سزا کا مستوجب قرار دیتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۔

(پارہ ۲۴، حم السجدہ ۴)

اور کافروں اور منکروں نے کہا۔ اس قرآن کے سننے کے لیے کان مت دھرو اور قرآۃ قرآن کے وقت شور و غل مچا دو تاکہ تم غالب ہو جاؤ۔

اگرچہ مشرکین کا قرآن کریم کو نہ سننا اور قرآت کے وقت شور و غل مچانا، معاندانہ اور مخالفانہ طور پر تھا اور حضرات مجوزین قرآۃ خلف الامام کو قرآن کریم سے یقیناً عداوت اور عناد نہیں ہوتا اور نہ اُن کا پڑھنا من کل الوجوہ ان کافروں کے شور و غل کے برابر ہے۔ اور گو وہ از روئے دیانت پڑھتے ہیں لیکن دیکھنا صرف یہ پہلو ہے کہ قرآن کریم کی قرآۃ اور تلاوت کے وقت خود پڑھنا کیا باعثِ مخالجت و منازعت اور تشویش و رہا تھا پائی کا سبب ہے یا نہیں؟ اگر ایسا ہے اور یقیناً ہے تو ایسے موقع پر خود قرآن کریم کا پڑھنا آداب قرآن کریم کے خلاف اور موجب تشتّتِ افکار ہو گا، لہٰذا حق اور صواب یہی ہے کہ تلاوت قرآن کریم کے وقت خاموش رہ کر اس کا ادب و احترام ملحوظ رکھنا چاہیے۔ مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ جن باتوں کی شریعت نے اجازت دی ہے وہ کیونکر بے ادبی ہیں۔ (محصلہ صد ۳۶۴) تو اس کا جواب یہ ہے کہ جہری نمازوں میں امام کے ساتھ ساتھ قرآت کرنے کا کسی شرعی دلیل سے ثبوت نہیں ہے اور یہ خلاف اجماع ہے۔

قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر میں حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

هٰذا حال هؤلاء الجهلة من الكفار ومن سلك مسلكهم عند سماع القرآن وقد امر الله عباده المؤمنين بخلاف ذلك فقال واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون۔

(تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص ۹۸ مع المعالم)

ان جاہل کافروں اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کا یہ حال ہے کہ وہ قرآن کی قرآۃ کے وقت خاموشی اور سکوت اختیار نہیں کرتے اور شور و غل مچاتے ہیں اور مومنوں کو اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف حکم دیا ہے کہ جب قرآن مجید پڑھا جائے تو تم اس کی طرف توجہ کرو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحمت نازل کی جائے۔

حافظ صاحبؒ کی عبارت سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ قرآۃ قرآن کے وقت مومنوں کا کام

دلچسپی کے ساتھ اس کو سننا ہے اور جاہل کافر اور ان کے پیرو کار اس ضابطہ کو ملحوظ نہیں رکھتے بلکہ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

(۵) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

"اے ابن مسعودؓ! مجھے قرآن کریم پڑھ کر سناؤ۔ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: میں نے کہا حضرت! کیا میں آپؐ کو قرآن پڑھ کر سناؤں؟ حالانکہ آپؐ پر قرآن کریم نازل ہوا ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ انی اشتھی ان اسمعہ من غیری —— میرا دل چاہتا ہے کہ کسی دوسرے سے قرآن سنوں۔" (مسلم جلد ا ص ۲۷۰)

یہ روایت بخاری جلد ۲ ص ۶۵۹ اور ترمذی جلد ۲ ص ۱۲۷ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ نے سورۃ نساء کا کافی حصہ پڑھ کر سنایا اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پورے ذوق وشوق سے سنا۔ امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں اس سے جو احکام اور فوائد اخذ ہو سکتے ہیں۔ ان کی تفصیل کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

منہا استحباب استماع القرآۃ و الاصغاء لہا والبکاء عندھا وتدبرھا و استحباب طلب القرآۃ من غیرہ لیستمع لہ وھو ابلغ فی الفھم والتدبر من قرأتہ بنفسہ۔ (نووی شرح مسلم ج ا ص ۲۷۰)

ان فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن کریم کا بغور سننا اور توجہ کرنا اور رونا اور تدبر کرنا پسندیدہ بات ہے اور یہ بھی مستحب ہے کہ دوسرے سے قرآن کریم سنے اور دوسرے سے سننا خود پڑھنے سے فہم وتدبر میں زیادہ ممد ومعاون ہے۔

یعنی اگرچہ قرآن کریم کا پڑھنا کار ثواب ہے لیکن جس طرح دوسرے سے سننے میں فہم وتدبر اور غور و فکر کا موقع ملتا ہے۔ وہ یقیناً خود پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے خود پڑھنے کے بجائے بعض اوقات دوسرے سے سننا افضل اور اعلیٰ ہے۔

مؤلف خیر الکلام کہتے ہیں کہ یہ نماز میں نہ تھا اور آپ نے کمال توجہ سے سنا آخر میں آپ نے رونا شروع کیا اور فرمایا بس اتنا ہی کافی ہے معلوم ہوا کہ مناسب کلمہ کہنا بے ادبی نہیں ورنہ تکبیر تحریمہ کا پڑھنا خلاف ادب ہوگا۔ (محصلہ ص ۳۶۵)

الجواب:

ہم نے کب کہا ہے کہ وہ نمازیں تھے۔ بتلانا تو صرف قرآن کریم کی تعظیم کا پہلو ہے۔ دیکھیے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باقرار شماکس غور سے آخر تک سنا اور رونا شروع کر دیا۔ یہی اس کے تدبر اور استماع کا لازمی نتیجہ تھا اور آپ نے حَسْبُکَ کہ بس اتنا ہی کافی ہے آخر میں فرمایا ہے۔ درمیان میں اور ساتھ ساتھ نہیں فرمایا۔ باقی تکبیر تحریمہ فرض ہے۔ اس کو واجب لغیرہ کے لیے (یعنی خاموشی جو قرأۃ قرآن کے استماع کے لیے ہے) نہیں چھوڑا جاسکتا اور ساتھ ساتھ پڑھنا تو منکر اور شاذ ہے۔ کما مرّ۔

قرآن کریم کے مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا —— کہ جس نے ایک نیکی کی اس کو دس گنا ثواب ملے گا) قاعدہ سے عموماً اور اس صحیح حدیث سے خصوصاً کہ جو شخص قرآن کریم کا ایک حرف پڑھے گا۔ اس کو دس نیکیاں عطا ہوں گی (ترمذی جلد ۲ ص ۱۱۵) یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ خود پڑھنے والا دس نیکیوں کا مستحق ہے لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے سے قرآن سننے والے کو بیس نیکیاں ملتی ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں؛

من استمع الی أیۃ من کتاب اللہ کتب لہ حسنۃ مضاعفۃ (الحدیث)	جو آدمی قرآن کریم کی ایک آیت سنتا ہے اس کے لیے دوہرا اجر لکھا جاتا ہے۔

(رواہ احمد فی مسندہ - ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۸۱)

چونکہ مقتدی پر انصات واجب ہے اس لیے اس حدیث کے رُو سے اس کو دہرا اجر ملیگا اور غیر حافظ جب حافظ کی قرأۃ سننے کے لیے توجہ کرے تو اس حدیث کے رُو سے وہ بھی دہرے اجر کا مستحق ہے۔ خدا تعالیٰ کے ہاں کیا کمی ہے؟

مؤلف خیر الکلام کا طنزاً یہ کہنا کہ غیر حافظوں کے لیے یہ نسخہ اکسیر ہے ۔۔۔۔ الخ (ص ۳۸۰) محض تسکین قلب کا سامان ہے اور بس۔ ملاحظہ کیجیے کس طرح صرف اپنی فاسد رائے سے حدیث کو رد کیا جا رہا ہے۔ (معاذ اللہ تعالیٰ) صرف بطور تائید ایک روایت اور ملاحظہ کریں: آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ان اللہ یحب الصمت عند ثلاث عند تلاوۃ القرآن وعند الزحف وعند الجنازۃ۔
(اخرجہ ابن کثیر جلد ۲ ص ۳۱۶)

تین مقامات پر اللہ تعالیٰ خاموشی کو پسند کرتا ہے۔ ان میں سے ایک قرآن کریم کی قرآۃ کا، دوسرا لڑائی کا اور تیسرا جنازہ کا وقت ہے۔

احسن الکلام طبع اول میں وعندہ تلاوۃ القرآن (الحدیث) کر دیا گیا تھا جس پر مؤلف خیر الکلام نے اعتراض کیا کہ مؤلف احسن الکلام نے چالاکی کر کے وعند الزحف.... الخ کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ لڑائی کے وقت ذکر اللہ قرآن سے ثابت ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انصات اور ذکر جمع ہو سکتے ہیں چونکہ یہ ہماری تائید میں ہے۔ لہٰذا احسن الکلام والا اس کو کھا گیا ہے۔ (محصلہ ص ۲۷۹ ج ۱)

الجواب:

وعند الزحف کا جملہ ہمارے ہرگز خلاف نہیں ہے کیونکہ لڑائی کے موقع پر مختلف اوقات ہوتے ہیں کبھی ذکر کا حکم ہے اور کبھی انصات کا اور کبھی ذکر قلبی اور استعانت وغیرہ کا۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مرفوع روایت نقل کرتے ہیں جس میں یہ بھی ہے کہ پس جب تم کافروں سے ملو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو یاد کرو اور جب وہ شور و غل کریں تو تم خاموش رہو۔

(تفسیر جلد ۲ ص ۳۱۶)

اور ایک دوسری حدیث میں یلی کرنی کا معنی یوں کرتے ہیں: ای لا یشغلہ ذلک الحال عن ذکری ودعائی واستعانتی (ایضاً) یعنی لڑائی میں وہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس سے مانگنے اور استعانت سے بے پروا نہ ہو تو اس میں ذکر اور انصات دونوں جمع نہیں ہوئے بلکہ دونوں اپنے اپنے موقع پر ہیں اور حیرت ہے کہ ان کو الحدیث کی اصطلاح بھی معلوم نہیں جبھی تو کہتے ہیں کہ حذف کر دیا ہے جس کا مطلب ہے کہ آخر تک حدیث پڑھو اور اس کو ملحوظ رکھو۔

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ

دل الکتاب والسنۃ والاجماع علی ان الاستماع افضل من القرآۃ۔
(فتاوےٰ جلد ۲ ص ۱۴۳)

کتاب و سنت اور اجماع امت سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ قرآن کریم کی قرأت کو سننا خود پڑھنے سے زیادہ اعلیٰ اور افضل ہے۔

الحاصل قرآن کریم وحدیث اور اقوال ائمہؒ سے یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ قرآن کریم کی

تلاوت اور قرآت کے وقت سامعین کو ہمہ تن گوش ہو کر اس کی طرف توجہ اور تدبر کرنا چاہیے۔ اور صرف یہی پہلو قرآن کریم کی توقیر و تعظیم پر علیٰ وجہ الاتم دلالت کرتا ہے۔

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے۔ وہ قرآن کریم کے عمومی آداب پر مشتمل ہے۔ اور اس سے عام قاعدہ اور ضابطہ بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ اب ہم تخصیص کے ساتھ امام کے پیچھے قرأت کی ممانعت پر قرآن کریم کی آیت پیش کرتے ہیں۔ پھر اس کی تفسیر و تشریح اور شان نزول حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ اور معتبر مفسرینؒ سے نقل کریں گے۔ اور فریق ثانی کی طرف اس پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں۔ ان کو نقل کر کے ان کی حقیقت کو بقدر وسعت الم نشرح کریں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

قرأۃ خلف الامام اور قرآن کریم:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ — اور جب قرآن کریم پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو۔ تاکہ تم پر رحم ہو۔

(پارہ ۹، اعراف ۲۴)

جمہور اہل اسلام کا بیان ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسئلہ خلف الامام پر روشنی ڈالی ہے کہ جب امام قرآن کریم کی قرأۃ کر رہا ہو تو اس وقت مقتدیوں کا وظیفہ صرف یہ ہے کہ نہایت توجہ کے ساتھ اس کی طرف کان لگائے رہیں اور خود خاموش رہیں۔ امام کا وظیفہ قرآت کرنا اور مقتدیوں کا وظیفہ خاموشی کے ساتھ توجہ کرنا ہے اور ان کو استماع اور انصات کے علاوہ قرآت کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ الحمد سے لے کر والناس تک سب قرآن ہے۔ لیکن قرآن کریم صحیح احادیث، حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے اقوال کی روشنی میں دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کا خاص اطلاق کس سورت پر ہوا ہے؟ اور قرآن کا اولین اور بالذات مصداق کونسا حصہ ہے؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (پ۱۴، الحجرات ۶) — اور البتہ دی ہیں ہم نے آپ کو سات آیتیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور دیا قرآن بڑے درجہ کا۔

حضرت ابوہریرہ رضہ سے مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ام القرآن هی السبع المثانی والقرآن العظیم۔ کہ ان سات آیتوں اور قرآن عظیم کا مصداق سورۃ فاتحہ ہے۔

(بخاری جلد ۲ ص ۶۸۳ اور اسی کے قریب الفاظ دارمی ص ۴۴۶ طبع دمشق میں ہیں)

اس کے علاوہ حضرت ابو سعید بن المعلیٰ رضؓ اور حضرت ابی ابن کعب رضؓ وغیرہ سے بخاری و موطا امام مالکؒ وغیرہ میں مرفوعاً صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ قرآن عظیم کا پہلے نمبر پر مصداق ام الکتاب ام القرآن اور سورۃ فاتحہ ہے۔ اور یہی حضرت عمرؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ، ابراہیم نخعیؒ، عبداللہ بن عبیدبن عمیرؒ ابن ابی ملیکہ شہرؒ بن حوشبؒ، حسن بصریؒ، مجاہدؒ اور قتادہؒ وغیرہ اکابر سے مروی ہے اور اسی کو امام ابن جریرؒ اور حافظ ابن کثیرؒ ترجیح دیتے ہیں اور لکھتے ہیں؛

فہذا نص فی ان الفاتحۃ ھی السبع المثانی والقرآن العظیم۔ کہ یہ روایات اور اقوال مفسرین اس بات پر نص ہیں کہ سبع مثانی اور قرآن عظیم کا اولین مصداق سورۃ فاتحہ ہے۔

(تفسیر ابن کثیر، جلد ۲ ص ۵۵۷)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ قرآن کریم کی سب سورتوں سے افضل ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا پڑھنا ہر نماز میں لازم قرار دیا گیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے (جو احادیث سے ثابت ہے) کہ تورات انجیل اور زبور بلکہ قرآن کریم میں اس جیسی مزیت اور فضیلت والی اور کوئی سورت نازل نہیں کی گئی اور یہ بالکل ممتنع ہے کہ استماع اور انصات کا حکم سورۃ فاتحہ کو شامل نہ ہو۔ حالانکہ استماع اور انصات کی آیت اس کو کئی طور سے شامل ہے کہ یہ آیت مطلق ہے اور سورۃ فاتحہ اس کا ایک حصہ ہے اور یہ کہ آیت عام ہے اور یہ اس کا فرد ہے (اور یہ کہ آیت مجمل ہے اور حدیث اس کی تفسیر ہے کہ اس سے مراد سورۃ فاتحہ ہے۔ (صفدر) علاوہ بریں اس کی قرأۃ اکثر اور مشہور ہے اور یہ تمام سورتوں سے افضل ہے۔ پھر آگے لکھتے ہیں؛

فان قولہ واذا قریٔ القرآن یتناولہا ولا یتناول غیرھا اظہر لفظاً ومعناً۔ یعنی واذا قریٔ القرآن کی آیت جس طرح اپنی لفظی اور معنوی حیثیت سے سورۃ فاتحہ کو شامل ہے اس طرح وہ قرآن کی کسی دوسری سورت کو شامل نہیں ہے۔

(فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۳)

اس تحقیق سے یہ امر بالکل واشگاف اور ہویدا ہو جاتا ہے کہ واذا قریٔ القرآن

کا صحیح، اصلی اور بالذات مصداق صرف سورۂ فاتحہ ہے۔ لہٰذا یہ حکم سُورۂ فاتحہ پر خصوصاً اور دیگر سُورتوں پر عموماً حاوی ہے۔ اور اس لحاظ سے مقتدیوں کو امام کے پیچھے سُورۂ فاتحہ کا ترک کرنا اصل ہوگا۔ اور باقی سُورتوں کو ترک کر اس کی فروع، امام نسائیؒ نے (جلد ۱ ص ۱۰۶ میں) جناب رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیث (جس کی پوری تفصیل اپنے مقام پر آئے گی انشاء اللہ العزیز) اذا قرأ فانصتوا کو (کہ جب امام قرأۃ کرے تو تم مقتدی خاموش رہو) قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر اور تاویل میں نقل کر کے یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچا دی ہے کہ گویا آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی قرآن کی اس آیت کو نماز اور نمازیوں کے حق میں ہی سمجھتے تھے۔ اب آپ حضرات صحابہ کرامؓ تابعینؒ اور معتمد مفسرین کرامؒ سے اس آیت کی تفسیر سن لیجیے کہ وہ کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

اس سے قبل کہ ہم اس آیت کی تفسیر حضرات صحابہ کرامؓ سے نقل کریں۔ یہ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ حضرات صحابہؓ کی تفسیر کا رتبہ، درجہ اور حیثیت کیا ہے۔ امام حاکم رح لکھتے ہیں: کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے نزدیک صحابی کی تفسیر مسند اور مرفوع حدیث کے حکم میں ہوتی ہے۔ (مستدرک ج ۲ ص ۲۵۸) اور یہی امام حاکم رح کی اپنی تحقیق ہے۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۲۰) حافظ ابن کثیر رح لکھتے ہیں کہ اکثر علماء کے نزدیک صحابی کی تفسیر مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۳۳) حافظ ابن القیم رح لکھتے ہیں: وتفسیر الصحابی حجۃ۔ (زاد المعاد جلد ص ۵۲) علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں وتفسیر الصحابی مرفوع۔ (تدریب الراوی ص ۶۵) علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں جس صحابی نے نزول وحی کا زمانہ پایا ہو۔ اس کا کسی آیت سے متعلق یہ کہنا کہ یہ فلاں اور فلاں حکم میں نازل ہوئی۔ یہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ (توجیہ النظر ص ۱۶۵)

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں:

وکذا حکم اقوالھم فی التفسیر فانھا اصوب من اقوال من بعدھم وقد ذھب بعض اھل العلم الی ان تفسیرھم فی حکم المرفوع۔	یعنی حضرات صحابہ کرامؓ کی تفسیر بعد کے آنے والے مفسرین سے بہت زیادہ صحیح اور صواب ہے حتیٰ کہ بعض (بلکہ اکثر) علماء کی تحقیق یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ کی تفسیر مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔

(الجنۃ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنۃ ص ۹۶)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۳۲ھ)

سے قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر یوں منقول ہے:

---

[1] یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ آفتابِ نبوت سے اکتساب نور کرنے کے بعد تمام حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نجوم ہدایت تھے۔ مگر بعض کو ایسے جزوی فضائل حاصل تھے کہ دوسرا کوئی ان میں ان کا ہم پایہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ان میں ایک شخصیت حضرت عبداللہ ابن مسعود رضؓ کی ہے۔ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے معلمینِ قرآن میں سب سے پہلا نمبر ان کا بیان کیا ہے (بخاری جلد ا ص ۵۳۱ و مسلم جلد ۲ ص ۲۹۳) اور فرمایا ہے جس چیز کو تمہارے لیے ابن مسعود رضؓ پسند کرتے ہیں میں اس پر راضی ہوں۔ (مستدرک جلد ۳ ص ۳۱۹ صحیح) نیز فرمایا اگر بغیر مشورہ کے تمہارے لیے میں خلیفہ کا انتخاب کروں تو وہ صرف ابن مسعودؓ ہی ہوں گے اور جس چیز کو ابن مسعودؓ تمہارے لیے پسند نہ کرے میں بھی اس کو تمہارے لیے پسند نہیں کروں گا۔ (الاستیعاب جلد ا ص ۳۵۹) اور فرمایا ابن مسعود کے عہد اور تحقیق کو مضبوطی سے قائم رکھو۔ (ایضاً) حضرت عقبہؓ بن عمرو فرماتے تھے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد میں نے ما انزل اللہ (یعنی جو کچھ خدا تعالیٰ نے نازل کیا ہے) کا ابن مسعود رضؓ سے بڑا عالم کوئی نہیں دیکھا۔ حضرت ابو موسیٰ رضؓ نے فرمایا کیوں نہ ہو۔ وہ ہر وقت حضور کے پاس رہتے تھے اور حضورؐ ان سے کسی وقت حجاب نہیں کرتے تھے۔ (مسلم ۲ ص ۲۹۳) مشہور تابعی شقیق رحؒ کا بیان ہے کہ میں ابن مسعودؓ پر کسی صحابی کو ترجیح نہیں دیتا۔ (مستدرک جلد ۳ ص ۳۱۹) یہی وجہ ہے کہ ابن مسعود رضؓ علی رؤس الاشہاد فرمایا کرتے تھے۔ اس خدا کی قسم جس کے بغیر کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔ قرآن کریم کی کوئی سورت اور کوئی آیت ایسی نہیں جس کا شان نزول مجھے معلوم نہ ہو کہ کس موقع اور کس حالت میں نازل ہوئی ہے اور میں کتاب اللہ کا اپنے سے بڑا عالم کسی کو نہیں پاتا۔ (بخاری جلد ۲ ص ۷۴۸ و مسلم ۲ ص ۲۹۳) اور فرمایا تمام صحابہؓ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ان سب سے کتاب اللہ کا بڑا عالم ہوں۔ (ایضاً) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضؓ حضرات خلفائے راشدینؓ سے بھی کتاب اللہ کے بڑے عالم ہیں۔ (شرح مسلم جلد ۲ ص ۲۹۳) اور اہل علم میں ان پر وہ حضرات کسی کو فضیلت نہ دیتے تھے۔ (مفتاح السعادۃ جلد ا ص ۳۵۳) حضرت عمر رضؓ نے ان کو علم کا انبار کہا۔ اور اہلِ کوفہ کی طرف تعلیم قرآن کے لیے ارسال کیا۔ (بغدادی جلد ا ص ۱۴۷) بعض حضرات نے مسئلہ رفع یدین کے پیش نظر حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ پر متعدد مسائل میں نسیان کا الزام عائد کیا ہے۔ لیکن نسیان تو انسان کی فطرت اور خمیر میں ودیعت کیا گیا ہے۔ جو اولادِ آدم کو باپ سے بطور ورثہ ملا ہے۔ اگر نسیان (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

سے محض نسیان ہی مراد ہے تو دوسروں کا ذکر بعد میں ہوگا۔ کیا آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ ارشاد نہیں فرمایا: انما انا بشر انسٰی کما تنسون اور اگر نسیان سے مراد بعض مسائل اور احادیث سے لاعلمی ہے تو یہ قصور صرف حضرت ابن مسعود رض کا نہیں بلکہ دوسرے بھی اس بات میں ان کے شریک ہیں۔ کیا حضرت ابوبکر رض کو وراثت جدہ کی بابت اور حضرت عمر رض کو حکم طاعون سے متعلق بلکہ رفع یدین کے مرکزی راوی حضرت ابن عمر رض کو مسح علی الخفین کے مسئلہ سے ناواقفی اور لاعلمی نہ تھی؟ اور کیا یہ اکابر عموماً اور حضرت ابن عمر رض خصوصاً اس لیے قابل اعتماد نہ رہے۔ کہ انھوں نے مسح علی الخفین (دیکھیے موطا ص ۱۲) جیسے مسئلہ سے جس کا ثبوت متواتر احادیث اور تعامل امت سے ثابت ہے۔ لاعلمی ظاہر کی بلکہ انکار کیا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رح فرماتے ہیں کہ ان ابن عمر رض انکر المسح علی الخفین مع قدیم صحبتہ وکثرۃ روایتہ اھ (فتح الباری جلد ۱ ص ۲۴۵ طبع مصر) کہ بے بیشک حضرت عبداللہ بن عمر رض نے مسح علی الخفین کا انکار کیا حالانکہ وہ پرانے صحابی اور کثیر الراویہ تھے۔ باقی باتوں کا ذکر تو روایات اور احادیث سے متعلق ہے اور یہ تفصیل کا مقام نہیں۔ لیکن حضرت ابن مسعود رض پر جو یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ معوذتین کو قرآن کریم کی سورتیں نہیں سمجھتے تھے۔ یہ خالص افترا اور بہتان ہے۔ علامہ ابن حزم رح لکھتے ہیں کہ

کل ما روی عن ابن مسعود رض من ان المعوذتین وام القرآن لم یکونا فی مصحفہ فکذب موضوع لا یصح۔
(محلی ابن حزم جلد ۱ ص ۱۳)

جتنی روایتیں بھی ابن مسعود رض سے اس مضمون کی نقل کی گئی ہیں کہ معوذتین اور ام القرآن ان کے مصحف میں نہ تھیں تو وہ خالص جھوٹی اور جعلی ہیں جو کسی طرح صحیح نہیں ہیں۔

امام نووی رح اور علامہ سیوطی رح لکھتے ہیں:

وما نقل عن ابن مسعود رض باطل لیس بصحیح۔
(شرح المہذب جلد ص و اتقان ج ۱ ص ۷۹)

معوذتین کے قرآن میں نہ ہونے کی جتنی روایتیں ابن مسعود رض کی طرف منسوب ہیں وہ سب باطل اور غیر صحیح ہیں۔

امام سبکی رح فرماتے ہیں کہ دلیل قاطع اس پر قائم ہے کہ یہ حضرت ابن مسعود رض پر جھوٹ باندھا گیا ہے اور وہ اس سے بالکل بری ہیں۔ (طبقات جلد ۲ ص ۲۰۷)

پہلی روایت : امام ابن جریر رحؒ[۱] فرماتے ہیں۔ ہم سے ابو کریبؒ[۲] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے محاربیؒ[۳] نے بیان کیا۔ وہ داؤدؒ[۴] بن ابی ہند سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ لیسیرؒ[۵] بن جابر سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا :

---

[۱] ان کا ترجمہ عنقریب آرہا ہے۔

[۲] ابو کریب کا نام محمد بن العلاءؒ ہے۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، الثقہ اور محدث کوفہ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص۴۲) امام نسائی رحؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابو عمرو الخفافؒ کا بیان ہے کہ میں نے اسحاق رحؒ بن ابراہیم رحؒ کے بعد ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں دیکھا۔ محدث مسلمہؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۹ ص۳۸۶)

[۳] محاربی کا نام یحییٰ بن یعلیٰ ہے۔ امام ابو حاتم رحؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں اور ابن حبان رحؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۱۱ ص۳۰۳) اور کسی کی جرح ان پر منقول نہیں ہے۔ قاضی مقبول احمد صاحب نے اس روایت پر یہ اعتراض کیا ہے کہ محاربی دو ہیں۔ ایک یعلیٰ بن یعلیٰ جن کی توثیق مولانا سرفراز صاحب نے فرمائی ہے اور دوسرے عبد الرحمٰن بن محمد بن زیاد جو انتہا درجہ کے ضعیف ہیں اور قوی احتمال ہے کہ مولانا نے ضعیف محاربی کی توثیق کر کے اپنا مطلب نکال لیا ہو۔ (محصلہ الاعتصام ۲۸ ستمبر سنہ ۱۹۶۲ء ص۶ کالم ۲)

الجواب : راقم نے یعلیٰ بن یعلیٰ رحؒ کی توثیق نہیں نقل کی بلکہ یحییٰ بن یعلیٰ المحاربی رحؒ کی توثیق نقل کی ہے اور اس سند میں یہی محاربی ہیں۔ ہم محض قاضی صاحب کی تسلی کے لیے عبد الرحمٰن بن محمد بن زیاد المحاربی کے متعلق بھی یہ عرض کیے دیتے ہیں کہ وہ انتہائی درجہ کے ضعیف نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کے ثقہ ہیں۔

اوّلاً۔ اس لیے کہ یہ بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ کے مرکزی راوی ہیں کیا فریق ثانی کے نزدیک صحاح ستہ کے مرکزی راوی بھی انتہا درجہ کے ضعیف ہوتے ہیں؟ یہ ہے غیر مقلدین حضرات کا علم و دیانت۔ سبحان اللہ تعالیٰ۔ اگرچہ ان کے بارے میں بعض نے مضطرب کثیر الغلط اور یہم وغیرہ کے الفاظ لکھے ہیں لیکن امام ابن معینؒ، نسائیؒ اور ابو حاتمؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام وکیعؒ فرماتے ہیں کہ طویل احادیث کے وہ بڑے حافظ تھے۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ عثمان بن ابی شیبہؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ محدث بزارؒ اور دارقطنیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ عجلیؒ ان کو لا باس بہ کہتے ہیں اور ساجیؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ (ملتقطاً تہذیب التہذیب جلد ۶ ص۲۶۶)

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

صلی ابن مسعود فسمع اناسا یقرأون مع الامام فلما انصرف قال اما آن لکم ان تفهموا اما آن لکم ان تعقلوا واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا کما امرکم الله تعالیٰ۔ (تفسیر ابن جریر جلد ۹ ص ۱۰۳)	کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے نماز پڑھی اور چند آدمیوں کو امام کے ساتھ قرأۃ کرتے سنا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کیا وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ تم سمجھ اور عقل سے کام لو اور جب قرآن کریم کی قرأۃ ہوتی ہو تو تم اس کی طرف توجہ کرو اور خاموش رہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے۔

یہ روایت وضاحت سے یہ بات ثابت کرتی ہے کہ پڑھنے والے امام کے پیچھے قرأۃ کر رہے تھے اور حضرت ابن مسعودؓ نے ان کو فہم و عقل سے کام نہ لینے پر تنبیہ کرتے ہوئے قرأۃ سے منع کیا اور یہ بات بھی عیاں کر دی کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو استماع اور انصات کا حکم دیا ہے۔ جو امام کے ساتھ اس کی اقتداء میں نماز ادا کر رہے ہوں اور یہ وہی ابن مسعودؓ ہیں جو کتاب اللہ کے عالم ہونے میں تمام حضرات صحابہؓ

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) قاضی صاحب مؤلف احسن الکلام سے بے شک اختلاف رکھیے، مگر صحاح ستہ کے ثقہ راوی کو تو انتہا درجہ کا ضعیف نہ قرار دیجیے۔

ؔ داؤد بن ابی ہندؒ کو امام احمدؒ، سفیان ثوریؒ، ابن معینؒ، ابو صالحؒ اور نسائیؒ ثقہ کہتے ہیں۔ یعقوب بن ابی شیبہؒ ان کو ثقہ اور ثبت کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو متقنین میں شمار کرتے ہیں۔ ابن خراشؒ ان کو ثقہ اور ابن سعدؒ ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۳ ص ۲۰۴) ذہبیؒ ان کو الامام اور الثبت لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۳۶)۔

ؔ یسیر بن جابرؒ، ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام عجلیؒ ان کو من ثقات اصحاب عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں۔ عوام بن حوشبؒ ان کو صحابی بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سلہ ھ میں ان کی ولادت ہوئی تھی۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۳۷۹) حافظ ابو عمرؒ بن عبدالبرؒ بھی ان کو صحابی بتلاتے ہیں۔

(الاستیعاب جلد ۲ ص ۶۱۷)

نوٹ: تفسیر ابن جریر اور ابن کثیر کے بعض نسخوں میں کاتب کی غلطی سے بشیر بن جابر لکھا گیا ہے جو قطعاً غلط ہے مسند احمد جلد ۱ ص ۳۸۴ اور مسند طیالسی ص ۵۱ اور صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۹۲ میں ایک دوسری حدیث کی سند میں یسیر بن جابرؒ ہی آیا ہے جو صحیح ہے مزید تشریح کے لیے نووی جلد ۲ ص ۳۹۲۔ اور تجرید اسماء الصحابہؓ للذہبیؒ جلد ۲ ص ۱۵۳ وغیرہ کی طرف مراجعت کیجیے۔

کرامؓ حتیٰ کہ حضرات خلفائے راشدینؓ سے بھی بڑھے ہوئے تھے اور جن کو ہر سورت اور ہر آیت کا شان نزول بخوبی معلوم تھا۔ تو لف خیر الکلام نے یہ جواب دیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ شان نزول بیان کر رہے ہیں بلکہ استدلال کر رہے ہیں اور استدلال بھی ان کی بے جا حرکت پر تھا کیونکہ وہ امام کے ساتھ ساتھ جہر کے ساتھ پڑھتے تھے جیسا کہ لفظ استماع سے معلوم ہوتا ہے ...... الخ (محصلہ صد ۳۵۱)۔

الجواب:

حضرت ابن مسعودؓ تو کما امرکم اللہ۔ سے اس کا شان نزول بیان فرما رہے ہیں اور اگر استدلال بھی مان لیا جائے تو ماوشما کا استدلال تو نہیں بلکہ حضرت ابن مسعودؓ صحابی کا استدلال ہے جو پہلے درجہ کے مفسر ہیں۔ اور مقتدیوں کی بیجا حرکت امام کے ساتھ قرأۃ تھی نہ کہ جہر۔ جیسا کہ یقرؤن کے الفاظ اس پر دال ہیں اور حضرت ابن مسعودؓ کے ارشاد میں لفظ انصات اس کی واضح دلیل ہے اور حضرت ابن مسعودؓ نے قرأۃ کی اس بیجا حرکت سے انھیں منع فرمایا ہے اور مطلق قرأۃ پر جہر کا اطلاق محض مجازی طور پر ہوتا ہے جس کے لیے قرینہ صارفہ درکار ہے اور وہ یہاں مفقود ہے۔

دوسری روایت۔ امام بیہقیؒ[1] فرماتے ہیں۔ ہم سے ابوالحسن، محمدؒ[2] بن الحسینؒ بن داؤد علویؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے ابوالحسنؒ علیؒ[3] بن محمدؒ بن حمشاذ العدلؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں۔ مجھ سے محمدؒ بن حسینؒ[4] انماطی بغدادیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے یحییٰ بن ایوبؒ[5] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے عبدالوہاب[6] ثقفی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے

---

[1] امام ابوبکر احمدؒ بن الحسین البیہقی علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ، العلامہ اور شیخ خراسان لکھتے ہیں (تذکرہ ۳ صہ ۳۰۹)

[2] جلیل القدر عالم اور بڑے پایہ کے صوفی تھے۔ (بغدادی جلد ۱۲ صہ ۲۲۸) علامہ ذہبیؒ ان کو امام بیہقیؒ کے مشائخ اور زمرۂ محدثین میں بیان کرتے ہیں۔ (تذکرہ ۳ صہ ۲۰۹)۔

[3] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الکبیر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ ۳ صہ ۶۹)

[4] ثقہ تھے (بغدادی جلد ۲ صہ ۲۲۸)

[5] علی بن مدینیؒ اور ابوحاتمؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ اور حسین بن فہمؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن قانعؒ ان کو ثقہ اور مامون۔ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ صہ ۱۸۸)

[6] الحافظ الامام اور ثقہ تھے۔ (تذکرہ ۱ صہ ۲۹۵) آخر عمر میں ان کے دماغ میں کچھ فتور آ گیا تھا۔ (تقریب صہ ۲۲۹)

(باقی اگلے صفحہ پر)

ایوبؒ نے بیان کیا۔ وہ منصورؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ ابو وائلؒ سے روایت کرتے ہیں:

قال عبد اللہؓ فی القرأۃ خلف الامام انصت للقرآن کما امرت فان فی القرأۃ لشغلاً وسیکفیک ذلک الامام۔ (کتاب القرأۃ ص۷۳)

کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ امام کے پیچھے خاموشی اختیار کرو۔ جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ خود پڑھنے کی وجہ سے امام کی قرأۃ سننے سے آدمی رہ جاتا ہے اور امام کا پڑھنا ہی تمہیں کافی ہے۔ (الگ قرأۃ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔)

حضرت ابن مسعودؓ کی یہ روایت صحیح ہے جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں اور خطاب ان لوگوں کو تھا جو امام کے پیچھے اس کی اقتدا کر رہے تھے۔ جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے اور یہ سری وجہری تمام نمازوں کو شامل اور فاتحہ وغیر فاتحہ سب کو حاوی ہے اس میں قرآت کو ما زاد علی الفاتحہ پر حمل کرنا جیسا کہ قاضی مقبول احمد صاحب وغیرہ نے کیا ہے سراسر باطل ہے اور اس روایت میں گو امرتُ ہے لیکن پہلی روایت میں تصریح ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور امر بھی واذا قرئ القرآن۔ الآیۃ سے واضح ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے اسی مضمون کی روایتیں مختلف اسانید سے اور بھی مروی ہیں مگر ہمارا مقصد استیعاب نہیں ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ[۴] رضی اللہ تعالیٰ عنہما (المتوفی ۶۸ھ) سے اس آیت کی تفسیر میں متعدد روایات مروی ہیں۔ مگر ہم یہاں صرف دو روایتیں نقل کرتے ہیں۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) لیکن اس فتور کے زمانہ میں انھوں نے کوئی روایت بیان نہیں کی۔ (میزان الاعتدال جلد ۱ ص۱۶۱)

[۱] ثقہ، ثبت اور حجت تھے۔ (تقریب ص۴۶)

[۲] الامام الحافظ اور الحجۃ تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص۱۳۴) ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ وہ بڑے متقن تھے تدلیس نہیں کرتے تھے۔ عجلیؒ ان کو ثقہ، ثبت اور حجت کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۱۰ ص۳۱۵)

[۳] ابو وائلؒ ان کا نام شقیق بن سلمہؒ ہے۔ ابن معینؒ کہتے ہیں وہ ایسے ثقہ تھے کہ ان کے مثل سے متعلق سوال نہیں ہو سکتا۔ امام وکیعؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ان کی یہ خوبی تھی کہ تدلیس نہیں کرتے تھے۔ (ایضاً ۴ ص۳۶۲)

[۴] تمام حضرات صحابہ کرامؓ میں فن تفسیر میں حضرت ابن مسعودؓ کے بعد نمبر حضرت عباسؓ کا آتا ہے۔ اور کیوں نہ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

پہلی روایت: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے ابوزکریا بن ابی اسحاق مزکیؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں ہم سے ابوالحسن[۱] احمد بن محمد بن عبدوسؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے عثمان بن سعیدؒ[۲] نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں ہم سے عبداللہ بن صالحؒ[۳] نے بیان کیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے حق میں یہ دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ! اس کو دین کی سمجھ اور قرآن کریم کی تفسیر اور تاویل کی مہارت عطا فرما۔ (مسند احمد جلد ۱ ص ۳۲۸ قال الہیثمی رح رجاله رجال الصحیح مجمع الزوائد جلد ۹ ص ۲۷۶ وصححہ ابن کثیرؒ البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۲۹۷) حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ وہ اعلم الناس بما انزل علیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ (ایضاً البدایہ جلد ۸ ص ۳۰۰)۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ دین کے امام علم کا سمندر اور بہت بڑے عالم تھے۔ (تذکرہ ۱ ص ۳۷) یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ ایسے محقق اور صاحب بصیرت بھی قرآن کریم کی تفسیر میں ان کی طرف مراجعت کرتے تھے۔ (بخاری ۲ ص ۷۴۳)۔

[۱] علامہ ذہبیؒ انکو مسند نیشاپور لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۳ ص ۲۲۵) علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ ادیب مورخ کثیر العلوم تھے اور علاقہ نیشاپور میں علم حدیث کا درس دیتے تھے (بغدادی جلد ۴ ص ۲۳۹) [۲] علامہ سبکیؒ نے طبقات جلد ۲ ص ۹۸ میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور علامہ ذہبیؒ ان کو مسند نیشاپور لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۳ ص ۶۵) [۳] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور الحجۃ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۷۷)

[۴] امام ابن معینؒ انکو ثقہ اور ابوحاتمؒ صدوق کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو مستقیم الحدیث کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۵۶) عبدالملکؒ بن شعیبؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ ابوزرعہؒ انکو حسن الحدیث اور ابن عدیؒ مستقیم الحدیث کہتے ہیں مسلمہؒ بن قاسمؒ لا باس بہ کہتے ہوئے ان کی توثیق کرتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۵۹) امام ابن معینؒ نے ان کو ثبت فی کتاب کہا ہے (تہذیب جلد ۵ ص ۲۶۰) یعقوبؒ بن سفیانؒ انکو الرجل الصالح کہتے ہیں (تہذیب جلد ۵ ص ۲۵۹) ابوہارون الخربیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوصالحؒ سے اثبت اور کوئی نہیں دیکھا اور ابن القطانؒ فرماتے ہیں کہ وہ صدوق ہیں۔ ان پر ایسا کوئی الزام ثابت نہیں ہو سکا جسکی وجہ سے انکی حدیث ساقط الاعتبار ہو۔ ہاں وہ مختلف فیہ ہیں (فحدیثہ حسن) انکی حدیث حسن ہے۔ (ایضاً ص ۲۶۰) حافظ ابن حجرؒ نے اس کی نشاندہی کی ہے کہ یہ صحیح بخاری کے راوی ہیں (ایضاً) اور صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۰۶۳ میں انکی روایت موجود ہے اور جن حضرات محدثین کرامؒ نے ان میں کلام کیا ہے تو اسکی اصل وجہ ان کا ایک شریر پڑوسی تھا جس کا نام خالد بن نجیح تھا، ابوصالح عبداللہؒ بن صالحؒ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ تہذیب التہذیب (جلد ۵ ص ۲۵۹) وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے اور امام بخاریؒ نے ادب المفرد اور جزء القراۃ وغیرہ میں ان سے باقاعدہ تخاج کیا ہے فریق ثانی کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ محض تعصب کی وجہ سے ایسے مسلّم راویوں کو بھی مجروح اور ضعیف گردانتے کے درپے ہے۔ امام حاکمؒ انکی سند سے ایک حدیث کو صحیح الاسناد اور ذہبیؒ صحیح کہتے ہیں (مستدرک ۲ ص ۱۹۹) اور انکی سند سے ایک روایت کو علامہ ذہبیؒ سندہ قوی کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۵۶) اور حافظ ابن کثیرؒ انکی سند سے ایک حدیث کو اسناد جید سے تعبیر کرتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ص و تفسیر جلد ۳ ص ۴۲۸) قاضی مقبول احمد صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ابن عدیؒ نے ان کو مستقیم الحدیث کہا

وہ کہتے ہیں مجھ سے معاویہ[1] بن صالحؒ نے بیان کیا۔ وہ علیؒ بن ابی طلحہ[2]ؒ سے روایت کرتے ہیں کہ

عن ابن عباسؓ فی قولہ تعالیٰ واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون یعنی فی الصلوٰۃ المفروضۃ

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اذا قرئ القرآن الآیۃ فرضی نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (کتاب القراۃ صہ ۴۳)

حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ اس آیت میں استماع اور انصات کا جو حکم آیا ہے وہ شان نزول کے لحاظ سے صرف فرضی نماز کو شامل ہے اور یہی اس کا شان نزول ہے۔ گو غیر فرضی نمازوں (مثلاً نماز عید و تراویح وغیرہ) اور خطبہ کو بھی عموم الفاظ کے لحاظ سے شامل ہے۔

تنبیہ: علیؒ ابن ابی طلحہ ہاشمیؒ کی براہ راست حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے سماعت نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ حضرت مجاہد بن جبرؒ اور سعید بن جُبیرؒ کی وساطت سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں اور یہ دونوں ثقہ ہیں (جیسا کہ اپنے موقع پر ذکر ہوگا) اس لیے یہ روایت بلا شک و شبہ

(پچھلے صفحہ کا باقی) ہے مگر ساتھ ہی کہا ہے کہ سند اور متن میں غلطی کر جاتا ہے۔ عمداً جھوٹ نہیں کہتا۔ (تہذیب جلد ۵ صہ ۲۵۶) اس لیے عبداللہؒ بن صالحؒ پر شدید جرح موجود ہے۔ اھ محصلہ الاعتصام ۲۱ ستمبر ۱۹۶۲ء صہ ۱ کالم ۲) مگر جمہور محدثین کی تعدیل کے مقابلہ میں صرف ابن عدیؒ کا یہ بیان ادنیٰ جرح بھی نہیں چہ جائیکہ شدید جرح ہو۔

[1] علامہ خطیبؒ ان کو ثقات میں بیان کرتے ہیں (بغدادی جلد ۱۱ صہ ۴۲۵) امام احمدؒ ان کو ثقہ اور ابن عدیؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابو زرعہؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صہ ۲۰۹) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام الفقیہ اور قاضی اندلس لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ صہ ۱۶۹) حاکمؒ ان کی سند سے ایک روایت کو صحیح (مستدرک ۱ صہ ۱۰۹) اور ذہبیؒ حسن الاسناد، اور صالح الاسناد سے تعبیر کرتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ صہ ۳۵۲ و صہ ۳۵۳) بلکہ ذہبیؒ بھی ان کی ایک سند کو صحیح کہتے ہیں (تلخیص المستدرک جلد ۴ صہ ۸۱) اور سیوطیؒ ان کی سند سے ایک روایت کو اسنادہ صحیح سے تعبیر کرتے ہیں (تاریخ الخلفاء صہ ۱) اور مستدرک جلد ۳ صہ ۲۳ میں ایک روایت کی سند یوں ہے۔ عبداللہ بن صالح عن معاویۃ بن صالح عن علی بن ابی طلحۃ عن ابن عباسؓ..... الخ امام حاکمؒ اور ذہبیؒ دونوں فرماتے ہیں صحیح۔

[2] امام نسائیؒ ان کی لیس بہ باس سے توثیق کرتے ہیں (میزان جلد ۲ صہ ۲۲۵) ابو داؤدؒ ان کو مستقیم الحدیث کہتے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

صحیح اور معتبر ہے۔ (دیکھیے مزید تحقیق کے لیے میزان الاعتدال ۲ صفحہ ۲۲۸ فتح الباری ۸ صفحہ ۳۳۲)، تہذیب التہذیب ۷ صفحہ ۳۳۹، اور تفسیر اتقان ج ۱ صفحہ ۱۸۸)

علی بن ابی طلحہؒ کے اس تفسیری صحیفہ کو صحیح اور معتبر سمجھتے ہوئے امام ابو جعفر نحاسؒ نے اپنی کتاب الناسخ والمنسوخ میں استفادہ کیا ہے (اتقان جلد ۱ صفحہ ۱۸۸) اور اسی صحیفہ سے امام بخاریؒ نے صحیح میں اور امام ابن جریرؒ و ابن ابی حاتمؒ اور امام ابن المنذرؒ وغیرہ نے تفاسیر میں خوشہ چینی کی ہے۔ (فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۳۳۸)

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں: اما روایت از ابن عباس بطریق مختلفہ آمدہ اجود آنہا طریق معاویہؒ بن صالحؒ از علیؒ بن ابی طلحہؒ از ابن عباسؓ است، بخاری در صحیح خود اعتماد بر ہمیں طریق کردہ پس ہیں۔ اکسیر فی اصول التفسیر صفحہ ۱۱)

مصنف خیر الکلام نے اس سے جو مخلص تلاش کیا وہ یہ ہے کہ علیؒ بن ابی طلحہؒ کی ابن عباسؓ سے باقرار مصنف احسن الکلام سماعت نہیں۔ لہٰذا یہ منقطع ہے اور مجاہدؒ اور سعیدؒ بن جبیرؒ کا واسطہ تفسیری صحیفہ میں ہے جب تک یہ ثابت نہ کیا جائے کہ یہ اسی صحیفہ کی روایت ہے۔ تو اتصال ثابت نہیں ہو سکتا۔ پھر امام احمدؒ بن حنبلؒ نے فرمایا ہے کہ لہ اشیاء منکرات۔ (میزان جلد ۲ صفحہ ۲۲۸) اس کے لیے کچھ منکر چیزیں بھی ہیں اور متن کے لحاظ سے اس میں کوئی ذکر نہیں کہ مقتدی کو آیا جہر سے روکا گیا ہے یا کلام کرنے یا شور ڈالنے سے اور یہ بھی احتمال ہے کہ آیت فرضی نماز جمعہ اور عید سب کو شامل ہو۔ اس صورت میں نماز کو دوسرے مقامات پر ترجیح نہ ہوگی۔

(محصلہ خیر الکلام صفحہ ۳۴۷ و ۳۴۸)

الجواب:

ہم نے باحوالہ ثابت کیا ہے کہ علیؒ بن ابی طلحہؒ صحیح مسلم کا راوی اور ثقہ ہے اور اس نے مجاہدؒ اور سعیدؒ بن جبیرؒ کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ سے تفسیر حاصل کی ہے اور اسی کو امام حاکمؒ اور ناقدِ فن رجال علامہ ذہبیؒ وغیرہ صحیح کہتے ہیں جیسا کہ باحوالہ گذر چکا ہے اور ہم نے باحوالہ نواب

(بقیہ پچھلا صفحہ) ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ محدث عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ صفحہ ۳۳۹) اور صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۲۶۵ میں ان کی روایت موجود ہے۔

صاحبؒ سے یہ ذکر کیا ہے کہ ابن عباسؓ کی روایت کے طرق تو متعدد ہیں مگر اجود ترین طریقہ معاویہؒ بن صالحؒ از علیؒ بن ابی طلحہؒ از ابن عباسؓ ہے اور اسی طریق پر امام بخاریؒ نے اعتماد کیا ہے۔ صحیفہ کی قید مؤلف خیر الکلام کی محض سینہ زاد ہے۔ جس کی پرکاہ بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ روایت اصولِ حدیث کے رُو سے بالکل صحیح اور متصل ہے۔ رہا امام احمدؒ کا یہ فرمانا کہ لہ اشیاء منکرات تو بجا ہے لیکن اس کی وجہ ان کا روایت میں ضعف نہیں بلکہ اس لیے کہ

ولکن لہ رأی سوء کان یری السیف
(تہذیب التہذیب جلد ۷، صفحہ ۳۴۰)

ان کی رائے اچھی نہ تھی کیونکہ وہ خلیفہ کے مقابلہ خروج کو جائز سمجھتے تھے۔

اور حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ

ونقل البخاری من تفسیرہ روایتہ معاویۃ بن صالح عنہ عن ابن عباسؓ شیئاً کثیراً فی التراجم وغیرھا ولکنہ لا یسمیہ یقول قال ابن عباسؓ اویذکر عن ابن عباسؓ وقد وقفت علی السبب الذی قال فیہ ابو داؤد یری السیف اھ
(تہذیب التہذیب جلد ۷، صفحہ ۳۴۰)

امام بخاریؒ نے اپنی تفسیر میں معاویہؒ بن صالحؒ عن علیؒ بن ابی طلحہؒ عن ابن عباسؓ کے طریق سے اپنے ابواب کے تراجم وغیرہا میں بہت زیادہ روایتیں نقل کی ہیں لیکن وہ ان کا نام نہیں لیتے بلکہ کہہ دیتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے فرمایا یا ابن عباس سے نقل کیا گیا ہے اور میں اس کی وجہ پر مطلع ہو چکا ہوں وہ یہ ہے کہ امام ابو داؤدؒ فرماتے ہیں کہ وہ بادشاہ کے خلاف تلوار کے استعمال کی اجازت دیتے تھے۔

ان کے ایسے خیالات اشیاء منکرات کی مد میں ہیں اور ایسے راوی جو شیعہ، مرجی اور قدری وغیرہ ہیں صحیحین میں ان کی بے شمار روایتیں موجود ہیں۔ یہ ان کی ضعف کی وجہ نہیں ہے اہل علم سے یہ امر مخفی نہیں ہے اگر ضرورت پڑی تو ہم انشاء اللہ تعالیٰ اس کی تفصیل عرض کریں گے اور اس ارشاد سے مقتدی کو قرأۃ سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ وَاِذَا قُرِئَ ... الآیۃ اس کا واضح قرینہ ہے۔ باقی جہر اور شور و غل وغیرہ حضرات صحابہ کرامؓ سے جماعتی رنگ میں حضورؐ کے پیچھے نہ ہوتا تھا۔ افراد کا معاملہ الگ ہے اور نماز میں قرآت سے منع کرنا اس آیت کا اولین مصداق ہے کیونکہ جمعہ اور عید وغیرہ کا حکم ہجرت کے بعد نازل ہوا ہے اور آیت مکیؒ ہے۔ ہاں ضمنی طور پر وہ بھی اس میں داخل ہیں کیونکہ بقول مؤلف خیر الکلام شان نزول کے حکم میں اس قسم کی وسعت ہوتی ہے۔

دوسری روایت: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں۔ ہم سے ابوالحسنؒ علی بن محمدؒ بن عبد اللہؒ بن بشرانؒ نے بغداد میں بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں۔ ہم سے ابو جعفر محمدؒ بن عمرو الرزازؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے سعدانؒ بن نصرؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں ہم سے مسکینؒ بن بکیر الحرانیؒ نے بیان کیا۔ وہ ثابتؒ بن عجلانؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ سعیدؒ بن جبیرؒ سے اور وہ عبداللہ بن عباسؓ سے انھوں نے فرمایا:

المؤمن فی سعة من الاستماع الیه الا فی صلوٰة مفروضة او المکتوبة او یوم جمعة او یوم فطر او یوم اضحیٰ یعنی واذا قرئ القرآن ..... الآیة	کہ آیت واذا قرئ القرآن کے پیش نظر مومن پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کو گنجائش ہے کہ سنے یا نہ سنے مگر مفروضہ نماز جمعہ، عید الفطر، عید الاضحیٰ کے موقع پر اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(کتاب القرأة ص۱۳)

(ان حالات میں اس کو بہرحال خاموش رہنا اور استماع و انصات کرنا ضروری ہے)

۱؎ امام خطیبؒ ان کو ثقہ، صدوق، ثبت، حسن الاخلاق اور تام المروۃ لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۱۲ ص۹۹)

۲؎ علامہ بغدادیؒ ان کو ثقہ اور ثبت لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۳ ص۱۳۲)

۳؎ امام ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور دار قطنیؒ ان کو ثقہ اور مامون لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۹ ص۲۰۵)

۴؎ امام احمدؒ اور ابن معینؒ ان کی لا بأس کہتے ہوئے توثیق کرتے ہیں۔ ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن عمارؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو صالح الحدیث اور لا بأس بہ کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ حدیث کے حافظ تھے۔ قاضی مقبول احمد صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ تقریب میں اس کو خطا کار کہا ہے اور امام احمدؒ اور ابو احمدؒ نے اس کو بہت وہمی اور کثیر الخطا کہا ہے۔ (محصلہ الاعتصام ۲۸ ستمبر ۱۹۶۲ء ص۸ کالم ۱) لہٰذا اس حدیث پر کسی طرح اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ (ایضاً)

الجواب۔ ان کا وہم اور خطأ وغیرہ جو کچھ ہے مطلق نہیں ہے بلکہ صرف سعیدؒ بن عبد العزیزؒ کی روایت میں ہے۔ چنانچہ خود ابو احمدؒ نے تصریح کی ہے ومن این کان مسکین یضبط عن سعید اھ۔ (تہذیب جلد ۱۰ ص۱۲۱) کہ مسکینؒ کو سعیدؒ کی روایت میں ضبط کہاں سے نصیب ہوا؟ اور اس سند میں روایت ثابتؒ بن عجلانؒ سے ہے نہ کہ سعیدؒ سے۔

۵؎ امام احمدؒ اور ابن معینؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ دحیمؒ اور نسائیؒ لیس بہ بأس سے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں، ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص۱) ۶؎ ان کا ذکر عنقریب آتے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابن عباسؓ کی سابق روایت سے معلوم ہو چکا ہے کہ آیت مذکورہ کا شانِ نزول فرضی نماز ہے۔ اور اس روایت میں وہ عموم الفاظ کے پیشِ نظر جمعہ اور عیدین کی نماز اور خطبہ وغیرہ کا حکم بھی استماع و انصات بیان کرتے ہیں اور اس کی پوری تحقیق اپنے مقام پر آئے گی کہ نصوص میں عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے۔ نہ کہ خصوص اسباب کا۔ اور یہ کہ کوئی آیت شانِ نزول پر مقید نہیں ہوتی۔ اسی طرح کے مضمون کی روایت حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مغفل وغیرہ سے بھی مروی ہے کہ اس آیت کا حکم امام کے پیچھے اقتداء کرنے والوں کو ہے۔ مگر حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کے بعد کچھ کہنے کی مطلقاً حاجت باقی نہیں رہتی، کیونکہ قرآنِ کریم کی تفسیر کے متعلق ان کا مقام تمام حضرات صحابہ کرامؓ سے علی الاطلاق بہت اونچا اور بلند ہے اور سند کے لحاظ سے بھی یہ روایتیں سو فی صدی صحیح ہیں جیسا کہ آپ پوری تفصیل سے پڑھ چکے ہیں۔ مصنفؒ خیر الکلام سے نہ تو جواب بن سکا ہے اور نہ خاموشی گوارا فرما سکے ہیں کیونکہ "ملا آں باشد کہ چپ نشود"۔ وہ لکھتے ہیں کہ بعض حنفیہ نے آیت کے شانِ نزول میں صحابہ کرامؓ سے صرف دو قول نقل کیے ہیں۔ ایک عبداللہؓ بن مسعود کا قول ہے۔ دوسرا عبداللہؓ بن عباسؓ کا ہے حالانکہ ابن عباسؓ سے بسند صحیح اور ابن مسعودؓ سے پانچ اسانید کے ساتھ اگرچہ بعض اسانید میں انفرادی طور پر کچھ کلام ہے مگر مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرآت خلف الامام کے قائل تھے پس ان دو صحابہؓ سے صرف اس قدر مروی ہونے سے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں ہے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ آیت نمازی کو قرآت سے روکنے کے لیے ہے۔ (محصلہ خیر الکلام ص ۳۴۳، ص ۳۴۴)

الجواب:

روایت تو صرف ایک صحابی کی بھی کافی ہوتی ہے جب کہ سند صحیح ہو آپ کو دو صحابہؓ کی روایت سے کیوں تسلی نہیں ہوتی؟ اور یہ روایتیں صحیح اسانید کے ساتھ ہیں اور ہیں حضرت ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ سے جو فنِ تفسیر میں پہلا درجہ رکھتے ہیں اگر ان کی روایتیں معتبر نہیں تو نہ معلوم آپ کے نزدیک کس کی مروی روایتیں معتبر ہوں گی؟ یقین رکھیے کہ یہ کوئی جواب نہیں ہے ممکن ہے کہ آپ کے حواری ایسے قدرے مطمئن ہو جائیں مگر ایک رتی جان بھی اس میں نہیں ہے باقی حضرت ابن مسعودؓ سے ایک روایت بھی قرآت خلف الامام کے جواز کی ثابت نہیں تفصیل اپنے مقام پر مذکور ہے اور

حضرت ابن عباسؓ کی روایتیں متعارض ہیں۔ صحیح روایت ترک قرأۃ کی ہے جیساکہ ابھی مذکور ہوا اور اپنے مقام پر آگے بھی آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس کے بعد ہم بعض تابعینؒ کی چند روایات اس آیت کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔ قرآن کریم کی تفسیر میں قرآن، حدیث اور صحابہؓ کے بعد تابعین کی تفسیر قابلِ حجت ہے اور یہی اکثر ائمہؒ سے منقول ہے۔ خصوصاً مجاہدؒ بن جبرؒ کی تفسیر کیونکہ وہ فن تفسیر کے امام تھے۔ سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے۔ جب مجاہدؒ کی تفسیر تمہارے پاس پہنچ جائے تو پھر کسی کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ اور ان کے بعد سعیدؒ بن جبیرؒ، عکرمہؒ، عطاءؒ بن ابی رباحؒ حسن بصریؒ، مسروقؒ، سعیدؒ بن المسیبؒ، ابوالعالیہؒ، ربیعؒ بن انسؓ، قتادہؒ اور ضحاکؒ بن مزاحمؒ وغیرہ کا درجہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ جلد ۱ صفحہ ۵)

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں: وھکذا تفسیر التابعی حجۃ (الجنہ صفحہ ۹۶) صحابی کی طرح تابعی کی تفسیر بھی حجت ہے۔

حضرت مجاہدؒ[1] بن جبرؒ: (المتوفی ۱۰۲ھ) سے

پہلی روایت: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبداللہؒ[2] نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ

---

[1] علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ وہ فقیہہ، عالم، ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ (طبقات ابن سعد ۵ صفحہ ۴۶۶) امام ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ علم کا ظرف تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۸۶) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی امامت اور جلالت پر سب کا اتفاق ہے۔ خصیفؒ کا بیان ہے کہ مجاہدؒ تفسیر کے سب سے بڑے عالم ہیں (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۸۶) حبر الامت حضرت ابن عمرؓ ان کے حفظ کے اتنے معترف تھے کہ فرماتے تھے کہ کاش نافعؒ کا حفظ تمہاری ہی طرح ہوتا (شذرات الذہب جلد ۱ صفحہ ۱۲۵) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ احد الائمۃ التابعین والمفسرین تھے اور حضرت ابن عباسؓ کے ارشد تلامذہ میں تھے اور اپنے زمانہ میں تفسیر کے سب سے بڑے عالم تھے (البدایۃ والنہایۃ جلد ۹ صفحہ ۲۲۴) اور ان کے فقہی کمال کے لیے یہ سند کافی ہے۔ کہ مخزن علوم مکہ کی جماعت افتاء کے ایک معزز رکن تھے۔ (اعلام الموقعین جلد ۱ صفحہ ۳۶) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں: ابن تیمیہؒ گفتہ اعلم الناس بالتفسیر اہل مکہ لانہم اصحاب عبد اللہ بن عباسؓ کمجاھد۔ آگے لکھتے ہیں۔ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ اور دیگر اہلِ علم نے ان کی تفسیر پر کلی اعتماد کیا ہے (اکسیر صفحہ ۱۱)

[2] یہ وہی امام ہیں جن کو الحاکم کہتے ہیں اور جن کی کتاب مستدرک شائع ہو چکی ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

ہم سے حافظ ابو علیؒ حسینؒ بن علیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو یعلیؒ موصلیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن ابو بکر مقدمیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے یحییٰؒ بن سعیدؒ نے بیان کیا۔ وہ سفیانؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو ہاشمؒ اسمٰعیلؒ بن کثیرؒ مکی نے بیان کیا۔ وہ مجاہد بن جبرؒ سے روایت کرتے ہیں کہ اذا قرئ القرآن فاستمعوا له قال فے الصلوٰۃ۔ (کتاب القرأۃ ص ۷۳) و اذا قرئ القرآن .... الآیۃ

دوسری روایت:

امام بیہقیؒ سے لے کر محمدؒ بن ابو بکر مقدمی تک وہی سند ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے اشعثؒ بن عبداللہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الحافظ الکبیر اور امام المحدثین تھے۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۲۲۷)

۱؎ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ حفظ اتقان، ورع، مذاکرہ ائمہ اور کثرت تصنیف میں گوے سبقت لے گئے تھے (بغدادی جلد ۸ ص ۷۱) ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ اور محدث اسلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۱۱۰)۔

۲؎ ذہبیؒ ان کو الحافظ، الثقہ اور محدث جزیرہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۴۶)

۳؎ امام یحییٰ بن سعیدن القطانؒ اور ابو زرعہؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتم رح ان کو صالح الحدیث اور ابن قانعؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۷۹)

۴؎ امام الجرح والتعدیل ذہبیؒ ان کو الامام العلم اور سید الحفاظ لکھتے ہیں۔ نسائیؒ فرماتے ہیں کہ مالکؒ، شعبہ اور یحییٰؒ بن سعیدؒ حدیث رسول کے امین تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۷۴) علامہ ابن سعد رح لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ، ثبت، حجت، بلند مرتبہ اور مامون تھے۔ خلیلؒ کہتے ہیں وہ بلا کسی اختلاف کے مسلم امام تھے (تہذیب ۱۱ ص ۲۱۹)

۵؎ امام سفیان ثوریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

۶؎ امام احمدؒ، نسائیؒ، یعقوبؒ بن شیبہ، یعقوبؒ بن سفیانؒ اور عجلیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو صاحب الحدیث کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۲۶)

۷؎ امام ابن معینؒ اور ابو داؤدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام نسائیؒ لا بأس بہ سے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۵۶)

شعبہ[1] نے بیان کیا وہ حمید اعرج[2] سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت مجاہدؒ سے واذا قرئ القرآن فاستمعوا قال فی الصلوٰۃ (کتاب القرأۃ ص۴۷) انھوں نے فرمایا کہ واذا قرئ القرآن کا شان نزول نماز ہے۔

تیسری روایت:

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں۔ ہم سے حافظ ابو عبداللہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے قاضی عبدالرحمٰنؒ بن حسنؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے آدمؒ بن ابی ایاسؒ[3] نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں۔ ہم سے ورقاءؒ[4] نے بیان کیا۔ وہ ابن ابی نجیحؒ[5] سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت مجاہدؒ سے

قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الصلوٰۃ فسمع قراۃ فتی من الانصار فنزل و اذا قرئ القرآن (الاٰیۃ)

وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز میں قرآت کر رہے تھے۔ آپ کے ساتھ ایک انصاری بھی پڑھتا رہا۔ اس پر اذا قرئ القرآن الاٰیۃ نازل ہوئی۔

(کتاب القرأۃ ص۴۷)

---

[1] ذہبیؒ ان کو الحجۃ، الحافظ اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص۱۸۱) سفیان ثوریؒ ان کو امیر المؤمنین فی الحدیث کہتے تھے۔ (کتاب العلل امام ترمذی جلد ۲ ص۲۳۸)

[2] امام ابن معینؒ، ابو زرعہؒ، ابو داؤدؒ، ابن خراشؒ، عجلیؒ اور بخاریؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ نسائیؒ لا بأس بہ کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص۴۷)

[3] امام حاکمؒ نے اس سند سے (مستدرک جلد ۲ ص۴۵، ۴۶، ۲۵۹، ۲۷۰، ۵۲۱، ۳۵۳، ۲۷۶۔ و جلد ۳ ص۳۱۴، جلد ۴ ص۲۲ وغیرہ میں) چند حدیثیں نقل کی ہیں اور ہر مقام پر امام حاکمؒ اور ذہبیؒ ان کو صحیح کہتے ہیں اور ایک مقام پر حاکمؒ اور ذہبیؒ دونوں علیٰ شرط الشیخین تصحیح کرتے ہیں۔

[4] ورقاءؒ، امام احمدؒ، ابن معینؒ اور وکیعؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ ورقاءؒ کی تفسیر شیبانؒ اور سعیدؒ سے زیادہ معتبر ہے کیونکہ ورقاءؒ ابن ابی نجیحؒ سے اور وہ مجاہدؒ سے تفسیر روایت کرتے ہیں اور وہ فن تفسیر کے امام تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص۱۱۴)

(نمبر ۵ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے قرآۃ کرنا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں معمول نہ تھا۔ ورنہ صرف ایک ہی انصاری کے پڑھنے کا کیا مطلب ہے اور جب حکم نازل ہوا تو نہ پڑھنے والوں کو کچھ نہ کہا۔ بلکہ منع کیا تو پڑھنے والے ہی کو منع کیا اور آیت کا شان نزول بھی حضرت مجاہدؒ نے وضاحت سے بیان فرما دیا ہے اور اسی مضمون کی ایک روایت امام زہریؒ سے بھی منقول ہے۔ (کتاب القرأت صہ ۴۸)

حضرت امام بیہقیؒ اور مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ نے اس اثر کو منقطع کہہ کر گلو خلاصی کرنے کی ناکام کوشش کی ہے جو بے سود ہے۔ اولاً[۱] اس لیے امام ابن مدینیؒ فرماتے ہیں: کہ مجاہدؒ کا مرسل عطاء کے مرسل سے مجھے کہیں زیادہ پسند ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صہ ۴۲) امام یحییٰؒ بن سعید القطانؒ کہتے ہیں: مجاہدؒ کا مرسل مجھے طاؤسؒ کے مرسل سے زیادہ پسند ہے۔ (تدریب الراوی صہ ۲۰ و کتاب العلل ترمذی صہ ۳۲۹) جب ائمہ جرح و تعدیل ان کے مرسل پر کامل اعتماد کرتے ہیں۔ تو نقار خانہ میں طوطی کی کون سنتا ہے؟

وثانیاً[۲] علماء احناف کے نزدیک اور جمہور اہل اسلام اور دوسری صدی سے قبل تمام محدثین کرامؒ کے نزدیک تنہا مرسل قابل حجت ہوتا ہے جیسا کہ اپنے مقام پر آئے گا۔ اور جب دوسری روایات سے (گو مرسل ہی کیوں نہ ہوں) وہ معتضد اور قوی ہو جائے تو فریق ثانی کے نزدیک بھی وہ حجت ہے۔ اور مبارک پوری صاحبؒ کو اس کا اقرار ہے (دیکھیے تحقیق الکلام جلد ۱ صہ ۹۱) اور اگر حضرت ابن مسعودؓ و ابن عباسؓ وغیرہ کی صحیح روایات سے بھی[۱] انقطاع کا یہ بہانہ رفع

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ ۵) ابن ابی نجیح رح، امام احمدؒ، ابو زرعہؒ، ابن معینؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن سعدان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ امام سفیانؒ اور ابو حاتمؒ ان کی تفسیر کی بڑی قدر کرتے تھے (تہذیب التہذیب جلد ۶ صہ ۵۴)

[۱] جو پہلے شان نزول کے سلسلہ میں پیش کی گئی ہیں جن کا استدلالی رنگ نہیں جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے (صہ ۳۵ میں) ناکام بہانہ کیا ہے۔ حضرت مجاہدؒ اور ان دونوں حضرات صحابہؓ کے اثر میں شان نزول ہونے کے بارے میں کوئی فرق نہیں ہے اور جمہور حضرات صحابہؓ ان کے ساتھ ہیں جیسا کہ ان کا مرسل حجت ہے اسی طرح ان کی تفسیر بھی حجت ہے اور کسی صحیح روایت سے ان کا قرآۃ خلف الامام کرنا ثابت نہیں ہے۔ جزء القراۃ صہ ۹ کا حوالہ بالکل بے سند ہے۔ اس لیے اس کو اس صحیح اور مسند روایات کا جواب تصور کرنا بے سود ہے۔

نہ ہو۔ تو کسی دوسرے جہان اور دوسری جون کی انتظار کیجیے۔

وثالثاً[۳۰] امام شافعیؒ، بخاریؒ، ابن تیمیہؒ وغیرہ کلی طور پر مجاہدؒ کی تفسیر پر اعتماد کرتے ہیں اور نواب صاحبؒ کا حوالہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا ان کا یہ عذر بارد اور رکیک تاویل قابل سماعت نہیں ہے حضرتؒ مجاہدؒ کی اور بھی متعدد روایات باسانید صحیحہ مروی ہیں مگر ہم صرف ان پر ہی اکتفا کرتے ہیں: وفیھا کفایۃ لمن لہ ھدایۃ۔

حضرت سعیدؒ[۱] بن المسیبؒ (المتوفی ۹۴ھ)

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے ابو یعلی الموصلیؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے محمدؒ بن ابو بکر مقدمیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے عبد الرحمٰن[۲]ؒ بن مہدیؒ

---

[۱] امام نوویؒ لکھتے ہیں۔ ان کی امامت اور جلالت پر سب کا اتفاق ہے۔ ابن حبانؒ لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ میں اہل مدینہ کے سردار تھے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ صـ۲۲۰)۔ حافظ ذہبیؒ ان کو الامام شیخ الاسلام اور اجلہ تابعینؒ میں لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ صـ۴۸) ابن عمادؒ لکھتے ہیں کہ ان کی ذات میں حدیث، فقہ، زہد و ورع اور عبادات اور جملہ علمی و عملی کمالات جمع تھے۔ (شذرات الذہب جلد ۱ صـ۱۰۳) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ علی الاطلاق وہ سید التابعین تھے اور حضرت ابن عمرؓ ان کو احد المتقین کہتے تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ صـ۹۹) امام یحییٰ بن سعیدؒ فرمایا کرتے تھے۔ ہم قرآن کی تفسیر میں رائے کو دخل نہیں دیتے صرف وہی کہہ سکتے ہیں۔ جس کا ہمیں علم ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۱ صـ۹) امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ان کے تمام مراسیل صحیح ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ صـ۵۱) امام حاکمؒ لکھتے ہیں کہ تمام مراسیل میں صحیح تر مراسیل ان کے ہیں۔ (معرفت علوم الحدیث صـ۲۵) امام بیہقیؒ ان کے مراسیل کو اصح المراسیل کہتے ہیں۔ (سنن الکبریٰ جلد ۱ صـ۴۲۱) علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں کہ مراسیل میں سے صحیح ترین مرسل سعیدؒ بن المسیبؒ کا ہے (توجیہ النظر صـ۱۶۶) امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ ان کے مراسیل صحیح ترین ہیں۔ (مقدمہ فتح الملہم صـ۳۶) امام شافعیؒ باوجودیکہ وہ دیگر تابعینؒ کے مراسیل میں کلام کرتے ہیں مگر حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل کی طرح وہ سعیدؒ بن المسیبؒ کے مرسل کو حجت اور صحیح مانتے ہیں۔ (مقدمہ فتح الملہم صـ۳۶)

[۲] ذہبیؒ ان کو الحافظ الکبیر الامام العلم اور الشہیر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ صـ۳۰۱) علیؒ بن المدینی کا بیان ہے کہ ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا۔ اگر میں رکن حطیم اور مقام ابراہیم کے درمیان کھڑا ہو کر قسم کھاؤں تب بھی یہی کہوں گا کہ میں نے ان جیسا یا ان سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا۔ (شذرات صـ۳۵۵ و تہذیب الاسماء جلد ۱ صـ۳۰۵) علامہ سمعانیؒ لکھتے ہیں کہ پختہ کار حافظ صاحب تقویٰ اور جامع حدیث تھے۔ (کتاب الانساب صـ۲۹۶)

نے بیان کیا۔ وہ حمادؒ بن سلمہؒ[1] سے روایت کرتے ہیں اور وہ قتادہؒ[2] سے اور وہ سعیدؒ بن المسیبؒ سے وہ فرماتے ہیں واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا قال فی الصلوٰۃ (کتاب القراۃ ص۴۵) کہ آیت واذا قرئ القرآن الآیۃ کا شانِ نزول نماز ہے۔

حضرت حسن بصریؒ[3] (المتوفی سنہ۱۱۰ھ)

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے حافظ ابو علیؒ نے بیان کیا وہ بیان کرتے ہیں ہم سے ابو یعلیٰ موصلیؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے محمدؒ بن ابوبکر مقدمیؒ نے بیان

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ، المحدث اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص۱۸۹) آخر میں ان کے حافظہ میں معمولی فتور آ گیا تھا۔ (تقریب ص۱۰۱) لیکن اس سے ان کی حدیث اور روایت پر مطلقاً اثر نہیں پڑتا۔ اس کی مزید تحقیق اپنے مقام پر آئے گی، امام احمدؒ فرماتے ہیں جب کسی شخص کو دیکھو کہ وہ حمادؒ بن سلمہؒ کے حق میں کچھ کہتا ہے تو اس کو منافق سمجھنا (فاتھمہ علی الاسلام) تذکرہ جلد ۱ ص۱۹۰) یہی الفاظ امام ابن معینؒ سے بھی منقول ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص۱۲) نواب صاحب لکھتے ہیں؛ گو یم حمادؒ بن سلمہؒ امام است تفروش مادام کہ در مرویش مانع از اصول نبود مضر نیست۔ (بدور الاہلہ ص۳۳۷)

[2] حضرت قتادہؒ کا ترجمہ جلد ۱ ص۲۲۵ میں مذکور ہے وہاں ملاحظہ کریں۔

[3] علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ وہ جامع کمالات عالم بلند مرتبت رفیع المنزلت، فقیہ مامون عابد زاہد وسیع العلم فصیح و بلیغ، حسین اور جمیل تھے۔ (طبقات جلد ۷ ص۱۱۵) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ علم کا سمندر، فقیہ النفس کبیر الشان عدیم النظیر اور بلیغ التذکیر تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص۶۲) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی جلالتِ شان پر سب کا اتفاق ہے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص۱۶۱) ابوبکر الہذلیؒ کا بیان ہے کہ جب تک وہ ایک سورت کی تفسیر اور شان نزول وغیرہ سے پوری طرح واقفیت حاصل نہ کر لیتے تھے۔ اس وقت تک آگے نہ پڑھتے تھے۔ (شذرات جلد ۱ ص۱۳۶) فقہ کے بہت بڑے امام تھے اور بصرہ کے مفتی اعظم تھے۔ قتادہؒ کا بیان ہے کہ حسن بصریؒ حلال و حرام کے سب سے بڑے عالم تھے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۷ ص۱۱۸ قسم اول) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام الفقیہ المشہور احد التابعین الکبار، الاجلاء، اور علم و عمل اور اخلاص میں یکتا تھے (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص۲۶۸) نواب صدیق حسن خان صاحبؒ لکھتے ہیں۔ حسن بصریؒ و محمدؒ بن کعب القرظیؒ و ابو العالیہ الریاحیؒ وغیرہ ایں ہمہ قدماء مفسرین اند و غالب اقوال ایشاں متلقی از صحابہؓ بودہ است۔ (اکسیر ص۱۱)

کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے یوسفؒ[1] بن یعقوبؒ نے بیان کیا وہ شعبہؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ منصورؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت حسن بصریؒ سے۔ انھوں نے فرمایا: واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا فی الصلوٰۃ۔ (کتاب القراۃ صـ۴۵) کہ واذا قرئ القرآن کا شانِ نزول نماز ہے۔

حضرت ابو العالیہؒ[2] الریاحیؒ (نام رفیعؒ بن مہرانؒ تھا۔ المتوفی ۹۳ھ)

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ہم سے حافظ ابو علیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے ابو یعلیٰ (موصلیؒ) نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے محمدؒ بن ابو بکر مقدمیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے عبد الوہابؒ[3] نے بیان کیا۔ وہ مہاجرؒ[4] سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت ابو العالیہ الریاحیؒ سے، انھوں نے فرمایا:

---

[1] امام ابن معینؒ، ابو داؤدؒ، یعقوب بن شیبہؒ اور خلیلیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو شیخ کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ صـ۴۱۳) باقی جملہ روات کی توثیق پہلے نقل کی جا چکی ہے۔

[2] امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ وہ کبار تابعینؒ میں تھے۔ ابو القاسم طبریؒ کا بیان ہے کہ ان کی توثیق پر سب کا اتفاق ہے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ صـ۲۵۱) ابو بکرؒ بن ابی داؤدؒ کا بیان ہے کہ حضرات صحابہؓ کے بعد ابو العالیہؒ سے بڑھ کر عالم قرآن کوئی نہ تھا۔ (تذکرہ جلد ۱ صـ۵۸) ابن حمادؒ ان کو مفسر قرآن لکھتے ہیں (شذرات جلد ۱ صـ۱۰۲) علامہ ابن سعدؒ ان کو کثیر الحدیث لکھتے ہیں (طبقات جلد ۷ صـ۸۵) خود امام بیہقیؒ اُن کی قہقہہ فی الصلوٰۃ کی حدیث کے علاوہ باقی تمام احادیث کو صحیح اور مستقیم تسلیم کرتے ہیں۔ (سنن الکبریٰ جلد ۱ صـ۱۴۷) امام عجلیؒ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ اور کبار تابعینؒ میں سے تھے۔ امام ابن عدیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث ضحک فی الصلوٰۃ کے علاوہ ابو العالیہؒ کی باقی تمام احادیث مستقیم اور صالح ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ صـ۲۸۵) مولیٰ طاش کبریٰ زادہ لکھتے ہیں کہ وہ کبار تابعینؒ میں تھے، آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات کے صرف دو سال بعد مسلمان ہوئے تھے اور حضرت ابو بکرؓ کے پاس گئے تھے اور حضرت عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی ہے اور قرآن کریم حضرت اُبیؓ بن کعب، حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت ابن عباسؓ سے پڑھا تھا اور صحیح روایت سے ثابت ہے کہ تین مرتبہ انھوں نے قرآن کریم حضرت عمرؓ پر پیش کیا تھا۔ (مفتاح السعادۃ جلد ۱ صـ۳۹۴) اور اسی کے قریب تہذیب التہذیب جلد ۳ صـ۲۸۴ میں ہے۔

(نمبر ۳ اور نمبر ۴ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

كان النبي صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلی قرأ فقرأ اصحابه فنزلت فاستمعوا له الاٰية فسكت القوم وقرأ النبي صلی اللہ علیہ وسلم۔
(کتاب القرأۃ ص۷۲)

کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب نماز پڑھتے تو ساتھ ساتھ آپ کے حضرات صحابہؓ بھی قرأت کرتے تھے۔ جب واذا قرئ القراٰن (الآیۃ) نازل ہوئی تو حضرات صحابہ کرامؓ نے خاموشی اختیار کرلی اور جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قرأۃ کیا کرتے تھے۔

امام بیہقیؒ علامہ حازمیؒ (المتوفی ۵۸۴ھ) اور مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ نے اس روایت کے منقطع ہونے کا ناکام بہانہ کیا ہے اور یہی کچھ مؤلف خیر الکلام نے ص۵۵ میں کہا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اولاً: اس لیے کہ مرسل حجت ہے اور مرسل معتضد بلا اختلاف حجت ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

وثانیاً: اگر اس کو ابو العالیہؒ کی تفسیر بھی تسلیم کرلیا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں جس کی تائید کئی محقق مفسرین کرامؒ سے آگے آرہی ہے۔ خود مؤلف خیر الکلام ص۲۰ میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ مگر معترض کو معلوم ہونا چاہیے کہ کسی آیت کی تفسیر اگر کسی تابعی سے ثابت ہو اور ایک بڑے مفسر نے بھی اس کی تصدیق کی ہو اور کسی صحابی اور تابعی سے اس کی تردید وارد نہ ہوئی ہو تو اس کی صحت میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟ اور اسی صفحہ کے آخر میں لکھتے ہیں کہ ایک تفسیر کے مقابلہ میں محض اٹکل پچو بات بنانا درست نہیں۔ لہٰذا ان کو اپنے تجویز کردہ نسخہ پر عمل کرنا چاہیے کہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی۔

حضرت امام زہریؒ[۱]:

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے

---

۵۴ ان کا ترجمہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کی ذیل میں نقل کر دیا گیا ہے۔

۵۵ مہاجر بن مخلد کو امام ابن معینؒ صالح کہتے ہیں۔ محدث ساجیؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ اور نیز کہتے ہیں کہ وہ معروف و مشہور تھے۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص۳۲۳) باقی رواۃ کا حال اور توثیق آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔

۱ امام زہریؒ اور امام عبد اللہ بن مبارکؒ کا ترجمہ مقدمہ میں عرض کیا جا چکا ہے اور بقیہ رواۃ کا عنقریب گزر چکا ہے۔

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

حافظ ابو علیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے حسنؒ بن سفیانؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے حبانؒ بن موسٰیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے عبداللہؒ بن مبارکؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے یونسؒ نے بیان کیا وہ امام زہریؒ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ

قال لا یقرأ من وراء الامام فیما یجهر به الامام یکفیهم قرأة الامام وان لم یسمعهم صوته ولکنهم یقرأون فیما لا یجهر به سراً فی انفسهم ولا یصلح لاحد خلفه ان یقرأ معه فیما جهر به سراً ولا علانیة قال الله واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون (کتاب القرأة ص۵)

امام کے پیچھے جہری نمازوں میں مقتدیوں کو قرأت کرنے کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے۔ امام کا پڑھنا ہی مقتدیوں کو کافی ہے۔ چاہے وہ مقتدیوں کو کچھ بھی نہ سناتا ہو ان کو نہ تو جہر سے پڑھنا جائز ہے اور نہ آہستہ۔ ہاں سری نمازوں میں وہ اپنے دل میں قرأت کر سکتے ہیں اور جہری نمازوں میں اس لیے منع ہے کہ اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے کہ جب قرآن پڑھا جاتا ہو تو تم خاموش ہو کر اس کی طرف توجہ کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

سری اور جہری نمازوں کا بیان اپنی جگہ پر ہوگا۔ لیکن بہر حال امام زہریؒ بھی آیت مذکورہ کا شانِ نزول مسئلہ قرأۃ خلف الامام بتاتے ہیں۔ سکتات میں پڑھنے کا کسی صحیح حدیث سے ثبوت نہیں اور یہ استدلالی رنگ نہیں بلکہ شانِ نزول ذکر ہو رہا ہے۔ مرسل زہریؒ اگرچہ تنہا حجت نہیں ہوتا مگر اس سے دیگر مراسیل کی تائید مطلوب ہے اور دوسرے مراسیل کے ساتھ مل کر یہ مرسل مسئلہ زیر بحث پر صراحت سے روشنی ڈالتا ہے۔

(پچھلے صفحہ کا باقی) صرف تین راوی باقی ہیں۔ ان کی توثیق سن لیجئے ۔ حسنؒ بن سفیانؒ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، الامام اور شیخ خراسان لکھتے ہیں۔ امام حاکمؒ کا بیان ہے کہ وہ خراسان کے محدث اور اپنے تمام معاصرین پر تثبت، کثرت روایت فہم، فقہ، ادب اور دیگر علوم میں فائق تھے۔ (تذکرہ ۲ ص۲۴۵) ۔ حبانؒ بن موسٰیؒ، ابراہیمؒ بن الجنیدؒ ان کی لا باس به سے توثیق کرتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص۱۷۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تقریب ص۸۲) یونسؒ بن یزیدؒ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثبت لکھتے ہیں۔ اور احمدؒ بن صالحؒ کا بیان ہے کہ ہم امام زہریؒ کے تلامذہ میں یونسؒ کو ترجیح نہیں دیتے۔ امام احمدؒ فرماتے تھے کہ وہ ثقہ ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۵۳)

عبیدؒ بن عمیرؒ (المتوفی ۷۴ھ) اور عطاءؒ بن ابی رباحؒ (المتوفی ۱۱۴ھ):

امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں ہم سے حمیدؒ بن مسعدہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے بشرؒ بن المفضلؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے جریریؒ نے بیان کیا۔ وہ طلحہؒ بن عبیدؒ بن کریزؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں میں نے عبیدؒ بن عمیرؒ اور عطاءؒ بن ابی رباحؒ کو آپس میں باتیں کرتے دیکھا۔ حالانکہ ایک واعظ وعظ کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ آپ ذکر کیوں نہیں سنتے اور کیوں وعید کے مستوجب ہو رہے ہیں؟ لیکن ان دونوں نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور پھر گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ میں نے پھر کہا۔ انھوں نے پھر میری طرف دیکھا اور باتوں میں مشغول ہو گئے میں نے سہ بارہ ان سے کہا۔ مگر ان دونوں نے کہا:

انما ذلك فی الصلوٰة یعنی واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا (الآیۃ) (تفسیر ابن جریر جلد ۹ صلا و ابن کثیر ج ۳ صلا ۲۸۱)

یعنی جو آیت واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا تمہارے پیش نظر ہے۔ اس کا شان نزول نماز ہے نہ کہ وعظ و عام تلاوت۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے باتیں کرنا اور قرأت کرنا ممنوع ہے کیونکہ یہ استماع و انصات کے خلاف ہے اور اس آیت کریمہ کا شانِ نزول ہی نماز ہے۔ خارج از نماز باتوں کو یہ شامل نہیں ہے۔

۱؎ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ عالم، واعظ اور کبیر القدر تھے (تذکرہ جلد ۱ ص۴۸) امام ابن معینؒ اور ابو زرعہؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ عجلیؒ ان کو ثقہ من کبار التابعینؒ کہتے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ ان کی مجلس وعظ میں حاضر ہوتے اور ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص۷۱)

۲؎ ذہبیؒ ان کو مفتی اہل مکہ اور محدث، القدوہ اور العلم لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص۹۲) ابن حبانؒ ان کو علم فقہ ورع اور فضیلت میں تابعینؒ کے سردار لکھتے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ ان کو ثبت، حجۃ، امام اور کبیر الشان لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص۲۰۳) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ کبار اور ثقات و بلند پایہ تابعینؒ میں تھے۔ دو سو ۲۰۰ صحابہؓ سے ان کی ملاقات ہوئی ہے۔ نیز ابن سعدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ ثقہ، فقیہ، عالم اور کثیر الحدیث تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص۳۰۶)

۳؎ ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور نسائیؒ ثقہ کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص۴۹)

۴؎ امام ذہبیؒ ان کو الامام، الثقہ، الحافظ اور العابد کہتے ہیں امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ بصرہ میں تثبت ان پر ختم تھا۔ (تذکرہ جلد ۱ ص۲۸۴)

(باقی نمبر ۵ و ۶ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

حضرت محمدؒ بن کعب القرظیؒ (المتوفی ۱۸۸ھ):

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے ابونصرؒ عمرؒ بن عبدالعزیزؒ بن عمرؒ بن قتادہؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے ابومنصورؒ عباس بن فضل نضروی نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں ہم سے احمدؒ بن نجدہؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے سعیدؒ بن منصورؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابومعشرؒ نے بیان کیا۔ وہ محمدؒ بن کعب (القرظیؒ) سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ حضرات صحابہ کرامؓ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کرتے تھے۔ جب آپ قرأت کرتے تھے تو وہ بھی ساتھ قرأت

(نمبر ۵ والا پچھلے صفحہ کے حاشیے) ۵ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الحجۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ صہ ۱۴۶)

۶ امام احمدؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۵ صہ ۲۲)

۱ ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ وہ علم و فقہ میں مدینہ کے فاضل ترین علماء میں تھے (تہذیب التہذیب جلد ۹ صہ ۴۲۱) امام نوویؒ لکھتے ہیں۔ وہ بڑے اور ائمہ تابعین میں تھے (تہذیب الاسماء جلد ۱ قسم اوّل صہ ۹۰) حافظ عجلیؒ ان کو ثقہ، رجل صالح اور عالم قرآن کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ، عالم اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ عونؒ بن عبداللہؒ کا بیان ہے کہ میں نے تفسیر قرآن کا ان سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔ (البدایۃ والنہایۃ جلد ۹ صہ ۲۵۷ و تہذیب التہذیب، جلد ۹ صہ ۴۲۱)۔ علامہ ذہبیؒ ان کو مفسر قرآن لکھتے ہیں۔ (دول الاسلام جلد ۱ صہ ۵۶) حافظ ابن کثیرؒ ان کو عالم تفسیر قرآن، صالح اور عابد لکھتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ صہ ۲۵۷) جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ایک پیش گوئی فرمائی تھی کہ بنو قریظہ میں ایک شخص پیدا ہوگا جو فن تفسیر میں اپنا نظیر نہ رکھتا ہوگا۔ ائمہ کا خیال ہے کہ یہ محمدؒ بن کعب قرظیؒ کے حق میں تھی۔ (البدایہ جلد ۹ صہ ۲۴۱)۔ مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں: مدینہ طیبہ میں محمدؒ بن کعبؒ کے بعد زیدؒ بن اسلمؒ جیسا مفسر قرآن کوئی اور نہ تھا۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ صہ ۲۱۷)

۲ امام بیہقیؒ کے شیخ ہیں۔ ان کی سند سے ایک حدیث کی امام بیہقیؒ تصحیح کرتے ہیں (دیکھیے سنن الکبریٰ ج ۲ صہ ۱۷۹)

۳ ثقہ اور مشہور تھے (تقریب صہ ۱۹۱) ۴ امام دارقطنیؒ ان کی توثیق کرتے ہیں اور ان پر کسی کی جرح منقول نہیں ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ صہ ۵۵) ۵ ابوحاتم ان کو ثقہ من المثبتین الاثبات کہتے ہیں۔ ابن نمیرؒ اور ابن خراشؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن قانعؒ ان کو ثقہ اور ثبت کہتے ہیں۔ خلیلیؒ کہتے ہیں ان کے ثقہ ہونے پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب التہذیب جلد ۴ صہ ۸۹-۹۰) ۶ ابومعشرؒ کو بعض محدثینؒ روایت حدیث

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

کرتے جاتے۔ اس پر سورۃ اعراف کی یہ آیت نازل ہوئی:

واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا (الآیۃ) (کتاب القرأۃ ص۴۷) کہ جب قرآن کریم کی قرأت کی جاتی ہو تو تم توجہ کرو اور خاموش رہو۔

حدیث مرسل:

مرسل حدیث سے احتجاج اور عدم احتجاج کی بحث اسی کتاب میں آگے اپنے مقام پر آرہی ہے (انشاء اللہ تعالیٰ) یہاں بقدر ضرورت تھوڑی سی بحث مناسب معلوم ہوتی ہے تاکہ بات ذرا واضح ہو جائے اور یہ حوالے آگے ذکر نہ کیے جائیں گے تاکہ تکرار لازم نہ آئے۔ امام سیوطیؒ علامہ قاسمؒ بن قطلوبغاؒ محدث جزائریؒ اور مولانا عثمانیؒ نقل کرتے ہیں:

کمزور سمجھتے تھے۔ مگر امام احمدؒ ان کو صالح محلہ الصدق کہتے تھے۔ ابن معینؒ کہتے ہیں۔ ان سے حدیثیں لکھی جاسکتی ہیں۔ ابوزرعہؒ ان کو صدوق فی الحدیث کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ کہتے ہیں ان سے بڑے بڑے ثقات نے روایات کی ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۳ ص۲۲۹ و تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص۴۲۰) امام نعیمؒ ان کو کیس اور حافظ کہتے ہیں (تہذیب ص۴۲۰) علامہ ذہبیؒ ان کو علم کا ظرف لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ امام نسائیؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے (تذکرہ جلد ۱ ص۲۱۶) حافظ ابن حجرؒ ان کو ابوداؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ کا راوی بتاتے ہیں (تہذیب جلد ۱ ص۴۱۹) ان کے متعلق یہ اختلاف صرف روایتِ حدیث کے بارے میں ہے فن تفسیر میں وہ بلا اختلاف اور بلا مدافعت مسلم امام تھے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ، محمد بن عثمان بن ابی شیبہؒ، امام علی بن المدینیؒ اور عمرو بن علی الفلاسؒ وغیرہ ائمہ کہتے ہیں کہ ابو معشرؒ کی وہ روایات جو تفسیر کے سلسلہ میں ہیں اور خاص طور پر وہ جو محمد بن قیسؒ اور محمد بن کعبؒ سے نقل کرتے ہیں۔ وہ بلاچون وچرا صحیح، معتبر اور قابل حجت ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص۴۲۰ و ص۴۲۱ محصلہ) مبارک پوری صاحبؒ نے ان کی جو تضعیف نقل کی ہے وہ ان کے لیے چنداں مفید نہیں۔ کیونکہ محدثین جب ان کو کمزور کہتے ہیں تو صرف روایتِ حدیث کے بارے میں اور ہم نے جو روایت نقل کی ہے وہ تفسیر کے بارے میں ہے اور خاص طور پر محمد بن کعب قرظیؒ سے ہے اور ان کی روایت کو اس مد میں بلاقیل وقال محدثین تسلیم کرتے ہیں۔ مؤلف خیر الکلام نے اپنی عادت کے مطابق محدثین کی جرح تو نقل کر دی ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۳۵۹) مگر تفسیر کے بارے میں ان کی روایت کے قابل اعتبار ہونے کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکے اور لکھتے ہیں کہ جب حدیث کو محدثینؒ کی شرائط کے مطابق محمد بن کعبؒ سے بیان کریں ان سے چند

وقال ابن جریر اجمع التابعون باسرھم علی قبول المرسل ولم یأت عنھم انکارہ ولا عن احد من الائمۃ بعدھم الی رأس المائتین قال ابن عبد البرؒ کانہ یعنی الشافعیؒ اول من ردہ اھ (تدریب الراوی صـ۱۲۳ منیۃ الالمعی صـ۴ توجیہ النظر صـ۲۲۵ ومقدمہ فتح الملہم صـ۳۴)

امام ابن جریرؒ نے فرمایا کہ تابعینؒ سب کے سب اس امر پر متفق تھے کہ مرسل قابل احتجاج ہے تابعین سے لے کر دوسری صدی کے آخر تک ائمہ میں سے کسی نے مرسل کے قبول کرنے کا انکار نہیں کیا۔ امام ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ گویا امام شافعیؒ ہی پہلے وہ بزرگ ہیں جنھوں نے مرسل کے ساتھ احتجاج کا انکار کیا ہے۔

اس سے صاف طور پر یہ بات واضح ہو گئی کہ دوسری صدی کے آخر تک تابعینؒ اور ائمہ دینؒ میں سے کوئی بھی مرسل حدیث سے احتجاج کا منکر نہ تھا۔ تعجب ہے کہ فریق ثانی کے نزدیک یہ اجماع تو حجت نہیں لیکن دوسری صدی کے بعد کا نظریہ قابل قبول ہے اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اور امت کی اکثریت کا لحاظ قرن اول میں لیا جائے گا...... الخ صـ۵۳۱)

الحمد للہ تعالیٰ کہ قرن اول والے مرسل کو بلا قیل وقال تسلیم کرتے تھے۔ اور اس پر ان کا اجماع ہے۔

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ اور علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں:

حدیثیں صالح پائی گئی ہیں...... الخ مگر ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ محدثین کرامؒ ہی ان کی: محمد بن کعبؒ سے روایتوں کو صالح کہتے ہیں اور یہ بھی انہیں میں سے ہے اور بالکل صالح ہے اور امام کے پیچھے قرأت ترک کرنے کے سلسلے میں ہے قرأت ہو یا کلام ہو جہر ہو یا آہستہ اور اس کا شانِ نزول ہی یہ بتاتے ہیں۔ قاضی مقبول احمد صاحب کو بلا وجہ غصہ آگیا ہے کہ اس کو امام بخاریؒ منکر الحدیث کہتے ہیں اور مصنف احسن الکلام خود لکھتا ہے کہ جس کو امام بخاریؒ منکر الحدیث کہیں اس سے روایت نہیں لی جاسکتی۔ (محصلہ الاعتصام، ۲۸ ستمبر ۱۹۶۲ء) لیکن محدثینؒ نے ان کی تفسیر کی روایت کو اور اسی طرح تاریخی روایت کو حجت مانا ہے۔ تفسیر کے بارے میں تو حوالہ گزر چکا ہے تاریخ کے متعلق سنیے۔ امام خلیلیؒ فرماتے ہیں:

وتاریخہ احتج بہ الائمۃ وضعفوہ فی الحدیث اھ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صـ۴۲)

اور ان سے تاریخ میں ائمہ نے احتجاج کیا ہے اور حدیث میں اس کو ضعیف سمجھا ہے جیسا کہ محمد بن اسحاقؒ کہ حدیثِ احکام میں ضعیف ہے مگر مغازی کا امام ہے۔ اس کے احادیث احکام میں ضعیف ہونے سے اس کے تاریخ میں معتبر ہونے پر کیا زد پڑتی ہے؟ فکذا ھذا۔

واما المراسیل فقد کان یحتج بہا العلماء فیما مضی مثل سفیان الثوریؒ ومالکؒ والاوزاعیؒ حتی جاء الشافعیؒ فتکلم فیہ اھ

(الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ طبع و توجیہ النظر ص ۲۴۵)

مراسیل کے ساتھ گذشتہ زمانہ میں علماء احتجاج کیا کرتے تھے، مثلاً امام سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ جب امام شافعیؒ آئے تو انھوں نے مرسل کی حجیت میں کلام کیا۔

امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ

فاذا لم یکن مسند ضد المرسل ولم یوجد مسند فالمرسل یحتج بہ ولیس ھو مثل المتصل فی القوۃ۔

(رسالہ ابوداؤد، ص ۵)

جب مرسل کے خلاف کوئی مسند حدیث موجود نہ ہو اور مسند اس باب میں نہ پائی جائے تو مرسل حجت ہوگی مگر متصل کی طرح قوی نہ ہوگی۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ مراسیل سے احتجاج اور عدم احتجاج کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

واما المراسیل قد تنازع الناس فی قبولہا وردّہا واصحّ الاقوال ان منہا المقبول والمردود ومنہا الموقوف فمن علم من حالہ انہ لا یرسل الا عن ثقۃ قبل مرسلہ ومن عرف انہ یرسل عن الثقۃ وغیر الثقۃ کان ارسالہ روایۃ عن من لا یعرف حالہ فھذا موقوف وما کان من المراسیل مخالفاً لما رواہ الثقات کان مردوداً واذا کان المرسل من وجھین کل من الراویین اخذ العلم عن شیوخ اخر فھذا یدل علی صدقہ

بہرحال مراسیل کے قبول اور رد کرنے میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے اور صحیح تر قول یہ ہے کہ مراسیل میں مقبول و مردود اور موقوف سبھی اقسام ہیں سو جس کے حال سے یہ معلوم ہوا کہ وہ ثقہ ہی سے ارسال کرتا ہے تو اس کا مُرسل قبول کیا جائے گا اور جو ثقہ اور غیر ثقہ سب سے ارسال کرتا ہے اور جس سے اس نے حدیث مُرسل روایت کی ہے۔ اس کا علم نہیں تو ایسی مرسل حدیث موقوف ہوگی اور جو مراسیل ثقات کی روایت کے خلاف ہوں تو وہ مردود ہوں گے اور جب مرسل دو طریقوں سے مروی ہو ایک مرسل الگ شیوخ سے اور دوسرا الگ سے

فان مثل ذلك لا يتصور في العادة تماثل الخطأ فيه وتعمد الكذب اھ (منہاج السنۃ جلد ۲ ص۱۷۱) — تو یہ اس کے صدق پر دلالت کرتا ہے کیونکہ عادتاً اس میں خطا اور جان بوجھ کر جھوٹ بولنے کا تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔

امام نوویؒ پہلے ان حضرات کا ذکر کرتے ہیں جو مرسل کو قابل استدلال نہیں گردانتے۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ

ومذهب مالك وابي حنيفةؒ واحمدؒ واكثر الفقهاء انه يحتج به ومذهب الشافعي انه اذا انضم الى المرسل ما يعضده احتج به وذلك بان يروى مسنداً او مرسلاً من جهة اخرى او يعمل به بعض الصحابةؓ او اكثر العلماء اھ (مقدمہ نووی بر شرح مسلم ص۱۷) — امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام احمدؒ اور اکثر فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ مرسل قابل احتجاج ہے اور امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ اگر مرسل کے ساتھ کوئی تقویت کی چیز مل جاتے تو وہ حجت ہوگا مثلاً یہ کہ وہ مسنداً بھی مروی ہو یا دوسرے طریق سے وہ مرسل روایت کیا گیا ہو یا بعض حضرات صحابہ کرامؓ یا اکثر علماء نے اس پر عمل کیا ہو

حضرت امام شافعیؒ نے یہ بحث اپنی کتاب الرسالۃ فی اصول الفقہ ص۶۳ طبع بولاق میں کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ مرسل معتضد کے حجت ہونے کے امام موصوفؒ بھی قائل ہیں اور اس کی ان کے نزدیک چند شرطیں ہیں جن کا اختصار کے ساتھ امام نوویؒ نے تذکرہ فرمایا ہے ایک شرط یہ ہے کہ

وزاد في الاعتضاد ان يوافق قول صحابي او يفتي اكثر العلماء بمقتضاه .... الخ (تدریب الراوی ص۱۲۱) — امام شافعیؒ نے اعتضاد کے لیے یہ شرط زائد بیان کی ہے کہ وہ کسی صحابی کے قول کے موافق ہو یا اکثر علماء نے اس کے مقتضیٰ پر فتویٰ دیا ہو۔

امام ابن الجوزیؒ اپنی کتاب التحقیق میں اور محدث خطیب بغدادیؒ اپنی تالیف الجامع فی اداب الراوی والسامع میں امام احمدؒ بن حنبلؒ سے نقل کرتے ہیں۔

ربما كان المرسل اقوى من المسند۔ (شرح نقایہ جلد ۱ ص۴۲ طبع ہند) — بسا اوقات حدیث مرسل مسند سے قوی تر ہوتی ہے۔

اور عہد حاضر کے محقق علامہ زاہد الکوثریؒ (المتوفی ۱۳۷۱ھ) لکھتے ہیں کہ

والاحتجاج بالمرسل کان سنة متوارثة جرت علیه الامة فی القرون الفاضلة حتی قال ابن جریرؒ رد المرسل مطلقاً بدعة حدثت فی رأس المأتین اھ کما ذکرہ الباجیؒ فی اصوله وابن عبد البرؒ فی التمهید وابن رجبؒ فی شرح علل الترمذیؒ اھ

مرسل کے ساتھ احتجاج کرنا ایک ایسا متوارث طریق تھا جس پر قرون فاضلہ میں امت عمل پیرا رہی ہے امام ابن جریرؒ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مطلقاً مرسل کو رد کر دینا بدعت ہے جو دوسری صدی کے آخر میں ایجاد ہوئی جیسا کہ علامہ باجیؒ نے اپنے اصول میں اور ابن عبد البرؒ نے تمہید میں اور ابن رجبؒ نے شرح علل ترمذی میں ذکر کیا ہے۔

(تانیب الخطیب ص۱۵۲ طبع مصر)

تقلید شخصی تو بقول فریق ثانی چوتھی صدی کے بعد کی بدعت ہے مگر مطلقاً مرسل کو رد کرنا دوسری صدی کے بعد کی بدعت نکلی ان تمام اقتباسات سے یہ بات بالکل مبرہن ہو چکی ہے کہ مرسل حدیث کے حجت ہوتے نہ ہونے کا جھگڑا تو دوسری صدی کے بعد سے تاہنوز چلا آرہا ہے مگر دوسری صدی تک ساری امت مرسل کو حجت سمجھتی تھی۔ لہٰذا محض مرسل مرسل کہہ کر ہستی گلو خلاصی چاہنا جیسا کہ فریق ثانی کر رہا ہے آسان نہیں ہے حق بات یہ ہے کہ مرسل جبکہ اس کی سند صحیح ہو اور کسی مرفوع متصل روایت کے خلاف بھی نہ ہو تو وہ بالکل حجت ہے۔

بعض حضرات تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے مراسیل :

علمی اور تحقیقی طور پر بعض حضرات تابعینؒ اور اتباع تابعینؒ ایسے بھی ہیں جن کے مراسیل کو امت مسلمہ نے بخوشی قبول کیا ہے حتی کہ خود حضرت امام شافعیؒ نے بھی ان کو تسلیم کیا ہے اور وہی اس کے رد کرنے میں پیش پیش ہیں۔ چنانچہ امام شافعیؒ کا مشہور قول یہ بتایا گیا ہے کہ وہ حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ کے مرسل کو حجت مانتے ہیں۔ (تدریب الراوی ص ۱۲۰)

اور امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ سعید بن المسیبؒ کے مراسیل اصح ترین ہیں۔

(تدریب ص ۱۲۳)

امام احمدؒ بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ سعید المسیبؒ کے مراسیل صحیح تر ہیں اور ابراہیم نخعیؒ کے مراسیل لاباس بہا ہیں۔ (ایضاً ص ۱۲۳ و ص ۱۲۲)

اور امام ابن معینؒ نے فرمایا کہ مراسیل ابراہیم نخعیؒ مجھے شعبیؒ کے مراسیل سے زیادہ محبوب ہیں۔ (ایضاً صـ۱۲۲) اور امام المحدثین علیؒ بن المدینیؒ فرماتے ہیں کہ حسن بصریؒ کے مراسیل جن کو ان سے ثقہ راوی نقل کریں بالکل صحیح ہوتے ہیں۔ (ایضاً) اور علیؒ بن المدینیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے مجاہدؒ کے مراسیل، عطاءؒ کے مراسیل سے کئی درجہ زیادہ پسند ہیں (ایضاً صـ۱۲۳) اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مراسیل ایک دوسرے کی نسبت سے صحیح تر ہوتے ہیں مگر بعض ایسے بھی ہیں جو فی نفسہ صحیح بلکہ اصح ہیں۔ لہٰذا مؤلف خیر الکلام کا یہ بہانہ کہ ترجیح سے اعتضاد سمجھ لیا حالانکہ ضعیف پر ضعیف کو بھی ترجیح ہوتی ہے۔ الی ان قال یاد رکھنا چاہیے کہ مرسل کو مرسل سے اس وقت قوت ہوتی ہے جب دونوں کبار تابعینؒ سے ہوں..... الخ (صـ۳۵۳) محض اپنے قلب کی تسکین کا سامان ہے اور ناخواندہ حواریوں کو طفل تسلی دینا ہے اور بس کیونکہ ان مراسیل میں مطلقاً بعض مراسیل فی نفسہا صحیح ہیں اور اعتضاد کے لیے کبار تابعینؒ کی کوئی قید نہیں ہے۔ یہ محض مؤلف مذکور کی اختراع ہے کیونکہ حضرات ائمہ ثلاثہؒ اور دوسری صدی تک کی ساری امت تو ویسے ہی مرسل کو حجت مانتی ہے اور امام شافعیؒ مرسل معتضد کو (جو بعض حضرات صحابہ کرامؓ یا اکثر علماء کے عمل کے موافق ہو) حجت سمجھتے ہیں اور امام کے پیچھے قرأت کا ترک کرنا خصوصاً جہری نمازوں میں نہ صرف یہ کہ بعض حضرات صحابہ کرامؓ کے عمل سے مؤید ہے بلکہ جمہور صحابہ کرامؓ کا یہی معمول تھا اور بقول حافظ ابن تیمیہؒ جہری نمازوں میں ترک قرأت پر اجماع امت ہے لہٰذا ہر حیثیت سے یہ مراسیل حجت ہیں لا شك فیہا۔

فائدہ۔ اگرچہ بعض محدثینؒ نے مرسل اور منقطع میں اصطلاحی طور پر کچھ فرق کیا ہے لیکن علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں:

وقد اطلق المرسل علی المنقطع من ائمۃ الحدیث ابوزرعۃ وابوحاتمؒ والدارقطنیؒ۔ اھ (توجیہ صـ۲۴۳)

حدیث منقطع پر مرسل کا اطلاق ان ائمہ حدیث نے کیا ہے امام ابوزرعہؒ، امام ابوحاتمؒ اور امام دارقطنیؒ

مؤلف خیر الکلام نے حضرت مجاہدؒ کے اثر کے بارے میں امام بیہقیؒ کی کتاب القرأۃ صـ۲۷ کے حوالہ سے جو یہ لکھا ہے کہ یہ منقطع ہے اور منقطع ضعیف کی قسم ہوتی ہے (محصلہ صـ۳۵۳) محض طفل تسلی ہے کیونکہ مرسل فی نفسہ صحیح قول کی بنا پر حجت ہے اور حکم منقطع و مرسل ایک

وغیر الامام (کتاب القرأۃ ص۹۶ جزء القرأۃ ص۱۳) امام کے پیچھے ہو یا اکیلا۔

جواب:۔ اس کی سند میں زیادؒ بن ابی زیاد جصاص ہے امام ابن معینؒ اور ابن مدینیؒ اس کو لیس بشیء کہتے ہیں نسائیؒ اور دار قطنیؒ اس کو متروک کہتے ہیں ابو زرعہؒ اس کو واہی کہتے ہیں علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کے ضعیف ہونے پر سب کا اجماع اور اتفاق ہے (میزان جلد ۱ ص۳۵۶ و تہذیب جلد ۳ ص۳۶۸) مؤلف خیر الکلام نے بھی علامہ ذہبیؒ کا حوالہ نقل کیا ہے (ص۴۲) یہ روایت بھی نہایت کمزور اور ضعیف ہے اور ان کی ایک روایت یوں ہے لا تجوز صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب و آیتین فصاعداً (کتاب القرأۃ ص۱۶) کہ نماز سورۃ فاتحہ اور دو آیتوں اور اس سے کچھ زیادہ کے بغیر صحیح نہیں ہوتی۔ لیکن اس میں ایک تو خلف الامام کا کوئی ذکر نہیں ہے اور دوسرے اس میں و آیتین فصاعداً کی زیادت موجود ہے۔

لطیفہ:۔ حضرت عمرانؓ بن حصینؓ سے مرفوعاً ایک روایت مروی ہے کہ ظہر کی نماز میں ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ نے فرمایا کس نے میرے ساتھ منازعت اور ہاتھا پائی کی ہے؟ غرضیکہ آپؐ نے امام کے پیچھے قرأۃ کرنے سے منع کر دیا (دار قطنی جلد ۱ ص۱۲۴) اس روایت پر فریق ثانی کی طرف سے جن میں امام دار قطنیؒ بھی ہیں یہ اعتراض ہوا ہے کہ سند میں حجاجؒ بن ارطاۃؒ ہے اور وہ ضعیف ہے ہم نے حجاجؒ بن ارطاۃؒ سے کوئی روایت نہیں لی۔ لیکن فریق ثانی کی ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ حجاجؒ بن ارطاۃؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ اور مسلمؒ وغیرہ کے روات میں ہیں (ازالہ ستر ص۱۴۱) علامہ ذہبیؒ ان کو احد الاعلام اور علم کا ظرف لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص۱۷۵) ابو زرعہؒ اور ثوریؒ ان کی توثیق کرتے ہیں (تہذیب جلد ۲ ص۱۹۶)۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں کان بارعاً فی الحفظ والعلم کہ حفظ اور علم میں وہ بلند پایہ رکھتے تھے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص۱۵۳) امام ترمذیؒ ان کی ایک حدیث کو حسن کہتے ہوئے تحسین کرتے ہیں (جلد ۱ ص۱۱۴) بلکہ ایک حدیث کو حسن صحیح کہتے ہیں (جلد ۱ ص۱۱۲) افسوس ہے کہ ان کی روایت تو فریق ثانی کے نزدیک حجت نہیں ہے لیکن زیادؒ کی روایت حجت ہے جو لیس بشیء ہے اور اس کی تضعیف پر اجماع ہے ان کی ایک روایت یوں ہے کہ ظہر کی نماز میں ایک شخص نے سبح اسم ربک الاعلیٰ کی سورت آپؐ کے پیچھے پڑھی تھی (مسلم جلد ۱ ص۱۷۲، نسائی جلد ۱ ص۱۰۶، ابو داؤد جلد ۱ ص۱۲۷) چونکہ لغت

توفیقی ہے اس لیے قرأ کو جھر کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا اور پڑھنے والا بھی صرف ایک شخص تھا اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس نے قراۃ ظہر کی نماز میں کی تھی جو سرّی ہے مگر آنحضرت صلی اللہ تعالے علیہ وسلم نے اس کو بھی گوارا نہیں کیا اور پوری تحقیق گذر چکی ہے کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے خصوص سبب کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اور منازعت و مخالجت میں قرأت سورۂ فاتحہ اور دوسری تمام سورتیں یکساں ہیں کیونکہ علت ایک ہے اور مازاد علی الفاتحۃ کو منازعت کے لیے متعین کر دینا اور سورۂ فاتحہ کو اس سے خارج تصور کرنا دعویٰ بلا دلیل ہے جو بہر حال مردود ہے۔

حضرت ہشامؓ بن عامرؓ کا اثر :۔ حمیدؒ بن ہلالؒ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں۔

ان ھشامؓ بن عامرؓ قرأ فقیل له اتقرأ خلف الامام قال انا لنفعل (کتاب القرأۃ ص۶۷ والسنن الکبریٰ جلد ۲ ص۱۷۱)

کہ ہشامؓ بن عامرؓ نے قرأت کی ان سے پوچھا گیا کہ آپ امام کے پیچھے قرأت کرتے ہیں؟ فرمایا ہاں ہم یوں ہی کرتے ہیں۔

جواب :۔ یہ اثر بھی قابل التفات نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں ابو بحر بربہاریؒ ہے اور عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ کذاب تھا وثانیاً اس بات میں اختلاف ہے کہ حمیدؒ بن ہلالؒ کی ہشامؓ بن عامرؓ سے ملاقات ثابت ہے یا نہیں؟ امام ابو حاتمؒ کہتے ہیں ملاقات ثابت نہیں ہے اور ان کی روایت مرسل ہے (دیکھئے تہذیب التہذیب جلد ۳ ص۹۲ و جلد ۱۱ ص۱۰) وثالثاً اس اثر میں سورۂ فاتحہ کا ذکر نہیں بلکہ مطلق قرأت کا ذکر ہے فریق ثانی کا دعویٰ صرف سورۂ فاتحہ کی قرأت کا ہے نہ کہ مطلق قرأت کا۔

حضرت معاذؓ بن جبل کا اثر :۔ ایک سائل نے حضرت معاذؓ سے قراۃ خلف الامام کے متعلق سوال کیا۔

قال اذا قرأ فاقرأ بفاتحۃ الکتاب وقل ھو اللہ احد واذا لم تسمع فاقرأ فی نفسك ولا توذ من عن یمینك ولا من عن شمالك (السنن الکبریٰ جلد ۲ ص۱۶۹)

انہوں نے فرمایا کہ جب امام قرأت کرے تو تم بھی سورۂ فاتحہ اور قل ھو اللہ احد پڑھا کرو اور جب اس کی قراۃ نہ سنو تو دل میں پڑھا کرو دائیں اور بائیں پہلو والوں کو اذیت نہ دیا کرو۔

جواب :۔ یہ اثر بھی قابل استدلال نہیں ہو سکتا اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں احمدؒ بن محمودؒ

واقع ہے حافظ ابن حجرؒ ایک سند کے متعلق جس میں احمدؒ بن محمودؒ واقع ہے لکھتے ہیں کہ سند باطل ہے اور اس سند کے راوی ضعیف ہیں دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ مجہول ہیں (لسان المیزان جلد ۶ صـ ۲۱۴) وثانیاً اس کی سند میں ابوشیبہ مہریؒ ہے علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ بلج مہریؒ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں لا یدری من ذا ولا من شیخہ بلج مہریؒ اور اس کا استاد ابوشیبہ مہریؒ پتہ نہیں یہ دونوں کون تھے؟ امام بخاریؒ فرماتے ہیں اس کی سند مجہول ہے (میزان جلد ۱ صـ ۱۶۴ ولسان جلد ۲ صـ ۹۲) وثالثاً اس سند میں علیؒ بن یونسؒ واقع ہے اگر یہ علی بن یونس بلخیؒ ہے تب بھی کمزور ہے (میزان جلد ۲ صـ ۲۴۱ ولسان صـ ۲۶۸) اور اگر علیؒ بن یونس مدنیؒ ہے تب بھی ضعیف ہے (ایضاً، وایضاً صـ ۲۶۹) اگر کوئی اور ہے تو اس کی توثیق درکار ہے ورابعاً اس اثر سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاذؓ نے صرف سرّی نمازوں میں اجازت دی ہے وخامساً اس میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ قل ھو اللہ احد کی قراءت کا بھی ذکر ہے اور فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کا اثر:۔ حضرت سالمؒ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں ان ابن عمرؓ کان ینصت للامام فیما جھر فیہ ولا یقرا معہ (کتاب القراۃ صـ ۱۰ وتحقیق الکلام جلد ۲ صـ ۱۶۱) کہ حضرت ابن عمرؓ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے خاموش رہا کرتے تھے اور قراءت نہیں کرتے تھے، فریق ثانی کا کہنا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرّی نمازوں میں وہ امام کے پیچھے قراۃ کیا کرتے تھے۔

جواب:۔ یہ اثر بھی فریق ثانی کو مفید نہیں اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں ابن جریجؒ ہیں، امام دارقطنیؒ علامہ ذہبیؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ وہ مدلس تھے (تہذیب جلد ۶ صـ ۴۰۵، میزان جلد صـ ۱۵۱، ابکار صـ ۲۳۷) اور یہاں وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں اور عنعنہ مدلس کا مقبول نہیں وثانیاً اس میں زہریؒ ہیں اور مبارکپوری صاحبؒ ان کی مدلس روایت کو بھی صحیح تسلیم نہیں کرتے اور یہاں بھی وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں وثالثاً یہ اثر عبارۃ النص کے طور پر ہماری دلیل ہے کہ حضرت ابن عمرؓ جہری نمازوں میں قراءت کے قائل نہ تھے رہا سرّی نمازوں میں اس سے قراءت کا اثبات کرنا تو مفہوم مخالف پر مبنی ہے اور ہمارے نزدیک مفہوم مخالف حجت نہیں ہے (تعلیق الممجد صـ ۹۳ واعلاء السنن جلد ۴ صـ ۷۷) ورابعاً اگر مفہوم مخالف کو بعض فقہاء

کے قول کے مطابق صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی اس سے اتنا ہی ثابت ہوگا کہ حضرت ابن عمرؓ سِرّی نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے اور فریق ثانی کا دعوٰی اس سے خاص ہے کیونکہ ان کا دعوٰی صرف سورۂ فاتحہ پڑھنے کا ہے وخامسًا موطا امام مالکؒ وغیرہ کے حوالہ سے بسند صحیح ان کا یہ اثر نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ امام کے پیچھے کسی نماز میں کسی قسم کی قرأت کے قائل نہ تھے اور ان کا یہ مسلک ایک مسلّم حقیقت ہے اور ان سے ایک روایت یوں ہے انه كان ينهى عن القرأة خلف الامام (الجوهر النقی جلد ۲ ص ۱۶۳) کہ حضرت ابن عمرؓ امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔ مولانا سیّد نذیر حسین صاحب دہلویؒ (المتوفی ۱۳۲۰ھ) جو فریق ثانی کے مقتدر اور پیشوا ہیں تحریر فرماتے ہیں کہ مقتدی کو سورۂ فاتحہ پڑھنے کی علماء احناف کے نزدیک اجازت نہیں ہے اور ان کا استدلال ان صحابہ کرامؓ کی روایات سے ہے اور یہ قرأت خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ حضرت جابرؓ بن عبد اللہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوسعیدؓ الخدریؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت عمرؓ بن الخطاب، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت علیؓ وغیرہم (منع قرأت خلف الامام۔ بحوالہٗ ایضاح الادلۃ ص ۵۷) اور صحیح اسانید کے ساتھ جلد اوّل میں ان اکابر کے آثار نقل کئے جا چکے ہیں کہ یہ جملہ حضرات امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور یہی بات مولانا نذیر حسین صاحبؒ فرما رہے ہیں حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ کا ایک اثر کتاب القرأۃ ص ۱۲۹ و ص ۱۴۷ میں ہے لیکن اس میں مکحولؒ مدلس ہیں اور عنعنہ سے روایت کرتے ہیں علاوہ ازیں امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ عبد اللہ بن عمرؓ نہیں بلکہ عبد اللہؓ بن عمروؓ بن العاص ہیں (ص ۱۲۹) اور مستزاد براں اس میں خلف الامام کا جملہ بھی مذکور نہیں ہے لہٰذا یہ روایت منفرد کے حق میں ہے۔ حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ سے ابو العالیہؒ نے مکہ مکرمہ میں دریافت کیا کہ کیا میں نماز میں قرأت کیا کروں؟ فرمایا میں بیت اللہ کے رب سے حیا کرتا ہوں کہ نماز میں قرأت نہ کروں ولو بام الكتاب اگرچہ ام القرآن ہی ہو (جزء القرأۃ ص ۱۲) لیکن اس میں بھی خلف الامام کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ علاوہ بریں کتاب القرأۃ ص ۶۵ میں اسی اثر کے آخر میں فاتحۃ الکتاب کے بعد ما تیسر کی زیادت بھی موجود ہے اور یہ زیادت اس بات کو متعین کر دیتی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کا یہ اثر مقتدی کے حق میں نہیں ہے کیونکہ فریق ثانی کے نزدیک

بھی اس کو ما زاد علی الفاتحہ پڑھنے کی گنجائش نہیں ہے اور کتاب القراۃ صہ ۶۴ میں ان کی اسی روایت میں بام الکتاب کے بعد فزائدا یا فصاعداً کی زیادت بھی مروی ہے حضرت ابن عمرؓ سے ایک اثر ان الفاظ سے مروی ہے۔

سئل ابن عمرؓ عن القراۃ خلف الامام فقال ماکانوا یرون باساً ان یقرأ بفاتحۃ الکتاب فی نفسہ (جزء القراۃ صہ ۱۲) ان سے سوال کیا گیا کہ کیا امام کے پیچھے قراۃ کی جا سکتی ہے؟ فرمایا لوگ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے کہ اپنے دل میں سورۃ فاتحہ پڑھ لیں۔

لیکن اس کی سند میں ایک تو ابو جعفر رازیؒ ہے جس کا نام عیسٰی بن ماہان ہے جس کا ترجمہ نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ ضعیف ہے اور دوسرا راوی اس سند کا یحیٰی البکاءؒ ہے امام احمدؒ، ابوداؤدؒ، ابوزرعہؒ اور ابن عدیؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں، دار قطنیؒ اس کو ضعیف اور علی بن الجنیدؒ اس کو مختلط کہتے ہیں، ازدیؒ کہتے ہیں کہ یہ متروک ہے ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ صہ ۲۷۹) امام نسائیؒ اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں (ضعفاء صغیر صہ ۵۵) حافظ ابن حجرؒ اس کو ضعیف الحدیث لکھتے ہیں (تقریب صہ ۳۹۵) مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ عیسٰی بن ماہان متکلم فیہ ہے مگر حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ صدوق ہے اس کا حافظہ اچھا نہیں تقریب صہ ۳۲۴) اور یحیٰی البکاءؒ کو ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ ہے انشاء اللہ جب راوی مختلف فیہ ہو تو اس کی حدیث حسن ہوتی ہے (محصلہ صہ ۳۲۴) الجواب، ہاں بس ایسے ہی راویوں کی ایسی ہی حسن قسم کی حدیثوں پر آپ کے مذہب کی بنیاد ہے اور مسلمانوں کی اکثریت کی نمازوں کو باطل اور کالعدم ٹھہرانے والوں کی وکالت فرما رہے ہیں۔ سبحان اللہ تعالیٰ اور آگے لکھتے ہیں کہ تطبیق کی یہی صورت ہے کہ نفی سے مراد جہری نماز میں فاتحہ سے ما زاد کی نفی مراد لی جائے اور فاتحہ کو اس نفی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے انتہیٰ صہ ۳۲۵ الجواب نہ معلوم یہ حضرات کس روایت کی کس سے تطبیق دے رہے ہیں؟ صحیح اور ضعیف کی تطبیق کا کیا معنیٰ؟ الحاصل حضرت ابن عمرؓ ہوں یا کوئی اور صحابی ہو ان میں کسی سے بسند صحیح یہ ثابت نہیں کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کو سورۃ فاتحہ پڑھنی ضروری اور واجب ہے۔

حضرت عبادۃؓ بن الصامت کا اثر:۔

حضرت محمودؓ بن ربیع فرماتے ہیں کہ:۔

سمعت عبادةؓ بن الصامت یقرأ خلف الامام فقلت له تقرأ خلف الامام فقال عبادةؓ لا صلوٰۃ الا بقراۃ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۸)

میں نے حضرت عبادہؓ کو امام کے پیچھے قرأت کرتے سنا میں نے دریافت کیا کہ آپ امام کے پیچھے قرأت کرتے ہیں؟ حضرت عبادہؓ نے فرمایا قرأت کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی۔

امام بیہقیؒ نے اپنی سند کے ساتھ ان کی ایک اور روایت بھی نقل کی ہے جس میں امام کے پیچھے آہستہ قرأت کرنے کی اجازت ہے اور پھر لکھا ہے۔

ومذهب عبادةؓ فی ذلك مشهور (ص ۱۶۸ ج ۲)

حضرت عبادہؓ کا مذہب اس میں مشہور و معروف ہے۔

جواب:۔ سند کے لحاظ سے گو کلام کرنے کی کافی گنجائش ہے مگر ہم سند کے لحاظ سے اس پر کوئی کلام نہیں کرتے حضرت عبادہؓ بن الصامت نے صحیح سمجھا یا غلط بہرحال یہ بالکل صحیح بات ہے کہ حضرت عبادہؓ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے اور ان کی یہی تحقیق اور یہی مسلک و مذہب تھا مگر فہم صحابی اور موقوف صحابی حجت نہیں ہے خصوصاً قرآن کریم، صحیح احادیث اور جمہور حضرات صحابہ کرامؓ کے آثار کے مقابلہ میں لیکن یہ روایت خود اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ میں امام کے پیچھے قرأت کرنے کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور یہ مسئلہ ان میں رائج بھی نہ تھا ورنہ محمودؓ بن ربیع جو خود صغار صحابہؓ میں تھے حضرت عبادہؓ بن الصامت کی امام کے پیچھے قرأت سے کبھی تعجب نہ کرتے اور نہ یہ پوچھنے کی نوبت ہی آتی کہ حضرت آپ امام کے پیچھے کیوں قرأت کرتے ہیں؟ یقینی امر ہے کہ حضرت عبادہؓ بن الصامت نے نماز میں تکبیر، قیام، رکوع، سجود، تشہد، اور سلام وغیرہ جملہ امور ادا کیے ہوں گے مگر ان میں سے کسی چیز کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی کہ حضرت آپ نے رکوع کیوں کیا ہے؟ سجدہ کیوں کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ اگر سوال کیا ہے تو اس چیز کے بارے میں کہ آپ نے امام کے پیچھے قرأت کیوں کرتے ہیں؟ یہ بھی مت بھولیئے کہ حضرت عبادہؓ بن الصامت نے محمودؓ بن ربیع کو یہ نہیں فرمایا کہ برخوردار تمہاری تمام سابق نمازیں بے کار کالعدم اور باطل ہیں کیونکہ تم نے قرأت نہیں کی اور تمام نمازیں واجب الاعادہ ہیں اور نہ سہی تو یہی نماز جو تم نے ابھی ابھی میرے ساتھ بغیر قرأت کے ادا کی ہے وہی دوبارہ پڑھ لو اور لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت محمودؓ بن ربیع حضرت عبادہؓ کے داماد تھے (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۶۳) انہوں نے ان کو یہ بھی نہ فرمایا کہ تم امام کے پیچھے ترک قرأت کے مرتکب

ہوئے ہو اور تارکِ قرأت کی نماز باطل اور کالعدم ہے اور من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر لہٰذا میری لخت جگر کو میرے گھر پہنچا دو اور خود مزے اڑاتے پھرو۔ حضرت عبادہؓ وہی جلیل القدر صحابی ہیں جو فرماتے ہیں کہ ہم نے جناب رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک پر اس شرط سے بیعت کی ہے کہ ان لانخاف فی اللہ لومۃ لائم (مستدرک وقال صحیح جلد ۳ ص ۳۵۶) اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ہرگز نہ گھبرائیں گے اور ایک معمولی قسم کے مسئلہ میں حضرت امیر معاویہؓ سے اُلجھ کر ملک شام ترک کر دیا تھا اور یہ فرمایا کہ ہمارا اجتماع ناممکن ہے لیکن حضرت عمرؓ کی زبردست مداخلت سے اپنے ارادہ سے باز آئے (دیکھئے مستدرک جلد ۳ ص ۳۵۵، مسند دارمی ص ۹۳ اور ابن ماجہ ص ۳ وغیرہ) مگر جب قرأت خلف الامام کے مسئلہ کی باری آتی ہے تو اپنے پڑھنے کی وجہ تو بتلاتے ہیں لیکن اس اہم مسئلہ کے اظہار پر کما حقہٗ وہ جوش و خروش ظاہر نہیں کرتے جو اس کے رکن اور ضروری ہونے پر کرنا چاہئے تھا۔ اگر حضرت عبادہؓ کے نزدیک قرأت خلف الامام واجب فرض اور رکن ہوتی تو اس کے اظہار میں پوری قوت اور طاقت صرف کرتے اور اس میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ کرتے اس بحث کو پیشِ نظر رکھنے سے یہ بات بخوبی سمجھ آسکتی ہے کہ حضرت محمودؓ بن ربیع مطلقاً امام کے پیچھے قرأتِ فاتحہ کے قائل نہ تھے اور حضرت عبادہؓ گو قائل تو تھے لیکن محض استحباب کے طور پر اور اگر کسی کو حکم بھی کیا ہے تو صرف استحبابی امر سمجھ کر۔ اگر اس کو رکن اور فرض سمجھتے تو کتمان حق سے بچتے ہوئے حضرت ابن مسعودؓ کی طرح (جنہوں نے قرآن کریم کی دو سورتوں کے تقدم و تأخر فی النزول کے بارے میں اعلان کیا تھا) یہ اعلان فرماتے من شاء باھلتہ جس کا جی چاہے میں اس کے ساتھ مباہلہ کرنے کے لیے تیار ہوں جب حضرت عبادہؓ نے ایسا نہیں کیا تو قطعی بات ہے کہ وہ امام کے پیچھے بلاشک سورۂ فاتحہ پڑھتے تو تھے (اور جہری نمازوں میں پڑھتے بھی صرف تنہا اور اکیلے تھے دوسرے حضرات صحابہؓ کا ان سے اتفاق نہ تھا) مگر صرف مستحب سمجھ کر ہم نے جو یہ کہا ہے کہ دوسرے صحابہ کرامؓ حضرت عبادہؓ بن الصامت سے جہری نمازوں میں قرأۃ خلف الامام کے مسئلہ میں اتفاق نہیں رکھتے تھے اسینہ زوری نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ چنانچہ امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ

وانما تعجب من قرأۃ عبادۃؓ بن الصامت خلف الامام فیما یجھر فیہ بالقرأۃ لذھاب	جو لوگ امام کے پیچھے جہری نمازوں میں قرأت کے قائل نہ تھے انہوں نے حضرت عبادہؓ کی جہری نمازوں میں قرأت

من ذهب الى ترك القرأة خلف الامام فيما
يجهر الامام فيه بالقرأة حين قال النبي
صلى الله عليه وسلم مالي انازع القرآن
ولم يسمع استثنى النبي صلى الله عليه
وسلم قرأة فاتحة الكتاب سراً وقوله
صلى الله عليه وسلم فانه لاصلوٰة لمن
لم يقرأبها وسمعه عبادةؓ بن الصامت
واتقنه واداه واظهره فوجب الرجوع
اليه في ذلك (انتهى بلفظہٖ كتاب القرأة ص۴۷)

پر تعجب کا اظہار کیا اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب یہ فرمایا کہ میرے ساتھ قرآن
میں منازعت کیوں کی جا رہی ہے؟ اور اس کے بعد آپ نے
آہستہ سورۃ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا اور اسی طرح آپ نے یہ
فرمایا کہ جس آدمی نے نماز میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز
نہ ہوگی تو یہ استثنا صرف حضرت عبادۃؓ بن الصامت نے
سُنی اور دیگر حضرات صحابہؓ نہ سن سکے اور اس کو حضرت
عبادۃؓ نے خوب محفوظ رکھا اس کو ادا کیا اور ظاہر کیا سو انکی
بات کی طرف رجوع کرنا ضروری ٹھہرا۔

صحابی اور تارک نماز؟ یہ دو متضاد باتیں ہیں اور واقعہ صبح کی نماز کا ہے جس میں سینکڑوں حضرات
صحابہؓ شریک ہوں گے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مالی انازع الخ سے تنبیہ فرما کر سب
حضرات صحابہ کرامؓ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی اور یہ حکم بھی پیش نظر تھا۔ یا ایھا الرسول
بلغ ما انزل الیک من ربک اور فاصدع بما تؤمر (یعنی اے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
اللہ تعالیٰ کے حکموں کو کھول کر بیان کریں جن میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے) مگر باایں ہمہ جناب رسول
خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ حکم آہستہ (سِرًا) بیان کرتے ہیں اور حضرت عبادۃؓ کے بغیر اس حکم کو کوئی
دوسرا سنتا ہی نہیں؟ پھر حضرت عبادۃؓ پر لوگ متعجب کیوں نہ ہوں کہ حضرات صحابہ کرامؓ جو آنحضرت صلی
اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ایک ایک حکم اور ارشاد کو عزیز از جان سمجھتے تھے اور ہمہ تن گوش ہو کر سنتے تھے
کوئی بات نہیں سمجھ آتی تو پھر استدعا کرتے تھے اور کوئی ضروری امر ہوتا تو آپ تین تین مرتبہ ایک ایک
جملہ کو دہراتے تھے لیکن جب امام کے پیچھے قرأت سورۃ فاتحہ کے حکم کے بیان کرنے کا نمبر آتا ہے تو
آپ آہستہ بیان کرتے ہیں؟ تین مرتبہ بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے؟ اور یہ حکم صرف
حضرت عبادۃؓ سنتے ہیں کسی دوسرے کے پلے کچھ نہیں پڑتا؟ اور دیگر حضرات صحابہ کرامؓ آپ سے
دریافت کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے کہ حضرت آپؐ نے کیا ارشاد فرمایا ہے؟ اگر امام کے پیچھے
سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کا مسئلہ ضروری فرض، واجب اور رکن ہوتا تو یقیناً آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ و

سلم ایک بار نہ فرماتے بلکہ کئی بار فرماتے سرّاً نہ فرماتے بلکہ جہراً فرماتے صرف حضرت عبادہؓ کو نہ سناتے بلکہ تمام حضرات صحابہؓ کو سناتے اور اگر حضرت عبادہؓ بھی اس حکم کو ضروری سمجھتے تو یقیناً بغیر خوف لومۃ لائم کے اس کی خوب نشر و اشاعت کرتے اور حضرات صحابہ کرامؓ کو اس بات کا قائل کر لیتے کہ وہ بھی جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرتے۔ یہ حکم تو ضروری نہ تھا اس لیے اس کی پرزور اشاعت کی ضرورت ہی انہوں نے نہ سمجھی۔ بخلاف اس کے ترک قرأت کا حکم ضروری تھا اس لیے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے صرف ایک شخص نے قرأت کی تو آپ نے فرمایا میرے پیچھے کس نے قرأت کی ہے؟ کیوں میرے ساتھ منازعت اور مخالجت ہوتی رہی ہے؟ حتیٰ کہ آپ نے ببانگ دہل یہ ارشاد فرمایا مالی انازع القرآن نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ارشاد سب نے سنا اور یہ ارشاد سن کر تمام حضرات صحابہؓ کرام نے جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت ترک کر دی۔ جیسا کہ مفصل پہلے گذر چکا ہے۔ باقی اگر حضرت عبادہؓ سے بسندِ صحیح یا کسی اور صحابی سے بلا قیل و قال خلف الامام کی قید سے کوئی روایت صحیح ہوتی تو یقیناً اس کی طرف رجوع کیا جاتا مگر روایات کا حال آپ ملاحظہ کر ہی چکے ہیں اور بقول شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ حضرت عبادہؓ کے موقوف قول سے ہی غلطی در غلطی پیدا ہوئی ہے الغرض حضرات صحابہ کرامؓ کے یہ آثار پہلے تو سنداً ہی صحیح نہیں ہیں اور اگر کچھ صحیح بھی ہیں تو ان میں صرف سرّی نمازوں کا ذکر ہے کسی میں مطلق قرأت کا ذکر ہے اور اکثر میں ما زاد، ما تیسر اور فصاعداً وغیرہ کی زیادت بھی موجود ہے لہٰذا یہ آثار فریق ثانی کو ہرگز مفید نہیں ہو سکتے۔

آثار حضرات تابعینؒ وغیرہم

فریق ثانی نے اپنے اس دعویٰ پر کہ امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورہٗ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے ورنہ نماز ناقص، بیکار، کالعدم اور باطل ہوگی، حضرات تابعینؒ و اتباع تابعینؒ وغیرہم کے آثار اور اقوال سے بھی استدلال کیا ہے حالانکہ ان کے نزدیک در موقوفات صحابہؓ حجت نیست اگرچہ بصحت رسد پھر آثار حضرات تابعینؒ وغیرہم سے استدلال کیونکر صحیح ہو سکتا ہے جب کہ وہ سنداً اور روایۃً بھی صحت کے معیار پر پورے نہیں اترتے اور معنوی اور درایتی پہلو کے پیش نظر بھی وہ ان کو چنداں مفید نہیں ہو سکتے مگر مشہور ہے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، حضرات تابعینؒ وغیرہم کے وہ آثار جو بحث سکتات

وغیرہ اور دیگر مواقع پر نقل کئے جاچکے ہیں اور جن پر کلام بھی کیا جاچکا ہے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے اِس موقع پر صرف وہ آثار پیش ہوں گے جو پہلے نقل نہیں ہوئے۔

حضرت مکحول رح کا اثر :- ان سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ مغرب عشاء اور صبح کی نماز میں ہر رکعت میں آہستہ سورۂ فاتحہ پڑھی جائے اور جہری نمازوں میں جب امام سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد سکوت اختیار کرے تو اس وقت آہستہ سورۂ فاتحہ پڑھی جائے اور اگر امام خاموش نہ ہو تو اس کے ساتھ یا اس کے بعد یا اس سے پہلے ہر حالت میں سورۂ فاتحہ پڑھو اور کسی حالت میں نہ چھوڑو (بیہقی رح جلد ۲ ص ۱۷۱)

جواب :- یہ اثر بھی قابل التفات نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اگر بالفرض یہ اثر صحیح بھی ہو تب بھی نص قرآنی، صحیح احادیث اور جمہور حضرات صحابہ کرام رض کے صحیح آثار کے مقابلہ میں اس کو سنتا کون ہے؟ وثانیاً قرأتِ سورۂ فاتحہ کے لیے سکتہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے جیسا کہ بحث سکتاتِ امام میں اس کی سیر حاصل تحقیق پیش ہو چکی ہے اور جہر امام کے ساتھ ساتھ پڑھتے جانا منازعت اور مجاحت کا موجب ہے جو کتاب و سنت اور اجماعِ امت سے مردود ہے۔

حضرت عروہ بن زبیر رض کا اثر :- ان سے مروی ہے انہوں نے ارشاد فرمایا کہ

لا تتم صلوٰۃ لاحد من الناس لا یقرأ فیھا بفاتحۃ الکتاب فصاعدًا مکتوبۃ ولا سبحۃ (کتاب القرأۃ ص ۴۷)

کسی شخص کی کوئی نماز خواہ وہ فرضی ہو یا نفلی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس میں سورۂ فاتحہ اور اس سے کچھ زیادہ کی قرأت نہ کی جائے۔

جواب :- یہ اثر بھی قابل استدلال نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں محمد بن العباس رح ہے کتب اسماء الرجال سے اس کی تعیین نہیں ہو سکی کہ یہ کون اور کیسا ہے؟ وثانیاً اس میں احمد رح بن سوید رح ہے جس کا کتب رجال میں کوئی نام و نشان ہی نہیں ملتا، مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ مگر عدم علم سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مجہول ہو اھ ص ۳۳۹ الجواب :- یہ ٹھیک ہے مگر مؤلف مذکور کا یہ علمی اور اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ اس راوی کی نشاندھی کرتے اور کتب رجال سے اس کی توثیق نقل کرتے وثالثاً اس کی سند میں حماد رح بن سلمہ رح ہے ان کے اس اثر کا مقابلہ احسن اثر سے نہیں ہو سکتا جو جلد اوّل میں بسند صحیح نقل کیا جاچکا ہے مبارکپوری صاحب رح لکھتے ہیں۔ سو یہ معارضہ بھی صحیح نہیں

علیٰ وجوب الاستماع والانصات لقرأة الامام۔۔۔ الخ (احکام القرآن ج۳ ص۴۹)

استماع وانصات کے وجوب پر واضح دلیل ہوتی۔

علامہ سید محمود آلوسیؒ (مفتی بغداد المتوفی ۱۲۷۰ھ)

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

لانها تقتضی وجوب الاستماع عند قرأة القرآن فی الصلوٰة وغیرها و قد قام الدلیل فی غیرها علیٰ جوا نہ الاستماع و ترکه فبقی فیها علیٰ حاله فی الانصات للجهر وکذا فی الاخفاء لعلمنا بانه یقرأ و یؤید ذلك اخبار جمة (روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۳)

آیت کا مقتضٰی یہ ہے کہ نماز میں یا خارج از نماز جب بھی قرآن کریم کی قرأت ہوتی ہو تو خاموش رہنا چاہیے۔ لیکن خارج از نماز سماع وعدم سماع دونوں کے جواز پر دلیل قائم ہو چکی ہے۔ لہٰذا جہری نمازوں میں انصات بہرحال ضروری ہے اور اسی طرح سری نمازوں میں بھی کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ امام قرأت کرتا ہے اور متعدد حدیثیں بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔

اس کے بعد علامہ موصوفؒ نے متعدد صحیح حدیثیں، عقلی و ترجیحی دلائل پیش کرکے بڑے وزنی دلائل سے اپنا دعوٰی ثابت کیا ہے۔

قارئین کرام! آپ حقیقت کی تہ کو پہنچ چکے ہوں گے۔ ابھی بہت سے مفسرین کرامؒ مثلاً علامہ خازنؒ[۲] (المتوفی ۷۴۱ھ) اور شیخ احمدؒ[۳] جونپوریؒ (المتوفی ۱۱۳۰ھ) وغیرہ وغیرہ کی عبارتیں باقی ہیں، مگر ہمارا مقصد صرف منصف مزاج لوگوں کے لیے معتبر مفسرین کے

---

[۱] مولانا میر صاحبؒ لکھتے ہیں کہ متاخرین حنفیہ میں بڑے پائے کے مفسر ہیں۔ تفسیر واضح البیان ص ۴۲۱

[۲] مشہور تفسیر ہے اور ۷۲۵ھ میں مصنف اس کی تالیف سے فارغ ہوئے تھے۔ (اکسیر ص) آیت مذکورہ کی تفسیر انھوں نے جلد ۲ ص ۲۷۲ میں کی ہے۔

[۳] یہ اورنگ زیب عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۱۱۸ھ) کے استاد تھے۔

(اکسیر ص ۳۴)

اور تفسیر احمدی ص ۲۸۰ میں انھوں نے آیت مذکورہ کی سیر حاصل تفسیر کی ہے۔

چند اقوال بطور نمونہ عرض کرنے تھے اگر استقصار کیا جائے تو تقریباً محال ہے اور ہمارا موضوع بھی یہ نہیں۔ اس لیے اب ہم بعض ضروری عبارتیں نقل کرکے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

امام بیہقی رح جن کی کتاب القراۃ پر مسئلہ زیر بحث میں فریق ثانی کا مدار ہے۔ رقم طراز ہیں کہ

انا لا ننکر نزول ھٰذہ الاٰیۃ فی الصلوٰۃ او فی الصلوٰۃ والخطبۃ کما ذھب الیہ من ذکرنا قولہ من سلف ھذہ الامۃ غیر انھم او بعض من روی عنھم اختصر الحدیث فقالوا فی الصلوٰۃ مطلقاً۔

(کتاب القرأۃ ص۵۶)

ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں یا نماز اور خطبہ دونوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جیسا کہ سلفِ امت کے اقوال ہم نے نقل کیے ہیں لیکن ہمارا اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے یا ان میں سے بعض نے حدیث کو مختصر کر دیا ہے اور اس آیت کا شان نزول مطلقاً نماز کو قرار دیا ہے۔ (اور خطبہ وغیرہ کا ذکر تک نہیں کرتے۔)

امام بیہقیؒ کو اس کا اقرار ہے کہ آیت مذکورہ کا شان نزول صرف نماز یا نماز اور خطبہ دونوں ہیں اور جمہور امت کا بھی یہی قول ہے مگر ان کا اعتراض یہ ہے کہ آیت کو فقط نماز پر کیوں قصر کر دیا ہے؟ اس میں خطبہ وغیرہ کا ذکر بھی آنا چاہیے جیسا کہ احادیث میں آتا ہے لیکن امام موصوفؒ کا یہ اعتراض محض دفع الوقتی اور تسکین قلب کا سامان ہے۔

اوّلاً: اس لیے کہ جمعہ اور عید کی فرضیت مدینہ طیبہ میں ہوئی ہے اور آیت مذکورہ مکی ہے جیسا کہ علامہ بغویؒ کے حوالہ سے عرض کیا جا چکا ہے۔ پھر اس کا شان نزول خطبہ کیسے ہوا؟

وثانیاً: جس حدیث (بلکہ احادیث) کے اختصار کا الزام امام موصوفؒ نے عائد کیا ہے۔ ان میں ایک بھی صحیح نہیں ہے جیسا کہ اپنے مقام پر عرض ہو گا۔ پھر ان سے استدلال و احتجاج کیسا؟

وثالثاً: آیت کا حکم خطبہ کو عموم الفاظ کے لحاظ سے شامل ہے نہ کہ شان نزول کے لحاظ سے۔ جیسا کہ آپ پوری وضاحت سے یہ پڑھ چکے ہیں۔ مگر یہ کس قدر حقیقت فراموشی ہے کہ جس نماز کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اس میں استماع و انصات تو ضروری نہ ہو اور خطبہ (وغیرہ بالتبع امور) کو اس کی آڑ بنا کر اصل حقیقت سے گریز اور پہلوتہی کی جائے؟

قاضی شوکانیؒ (محمد بن علیؒ المتوفی ۱۲۵۵ھ)

اس مسئلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ

لان عمومات القرآن والسنۃ قد دلت علی وجوب الانصات والاستماع والمتوجہ حال قرأۃ الامام للقرآن غیر منصت ولا مستمع ..... الخ

(نیل الاوطار جلد ۲ ص ۲۲۶ ونقلہ النواب فی ھدایۃ السائل ص ۱۹۱)

(امام جب قرأت قرآن کر رہا ہو تو مقتدی کو اس وقت اِنِّیْ وَجَّہْتُ وَجْہِیَ لِلَّذِیْ ... الآیۃ کی دعاء استفتاح نہیں پڑھنی چاہیے) کیونکہ قرآن کریم اور سنت کے عمومات اور اکثر دلیلیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔ کہ امام جب قرأت کر رہا ہو تو اس وقت مقتدی پر انصات اور استماع واجب ہے۔ حالانکہ اس حالت میں امام کے ساتھ پڑھنے والا استماع اور انصات پر عامل نہیں ہے۔

قاضی صاحبؒ بھی جمہور اہل اسلام کی طرح جہرِ امام کے وقت مقتدی کی قرأت کو قرآن کریم کی کثیر توجہ سے مانع قرآن و سنت کے عمومی دلائل کے خلاف سمجھتے ہیں اور تصریح کرتے ہیں کہ اس کے خلاف کرنے والا عموماتِ قرآن اور اور سنت کا مخالف ہے۔ قاضی صاحبؒ نے سکتات امام میں مقتدی کے لیے قرأت فاتحہ کو احوط کہا ہے، لیکن قرأت مقتدی کے لیے سکتات کا شریعت میں کوئی وجود ہی نہیں ہے جس کی پوری تشریح اپنے مقام پر عرض ہو گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

مؤلف خیر الکلام کا مناقشہ نمبر ۳ میں یہ کہنا کہ اس میں فاتحہ کا ذکر نہیں اور قاضی شوکانیؒ ہر حالت میں فاتحہ خلف الامام کے قائل ہیں اور استماع و انصات آہستہ پڑھنے کے منافی نہیں (محصلہ خیر الکلام ص ۵۴۷ و ۵۴۸) تو یہ محض لفظی ہے۔ ہم نے کب فاتحہ کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے تو یہ حوالہ صرف اس لیے پیش کیا ہے کہ جہر امام کے وقت مقتدی کا پڑھنا استماع و انصات کے بالکل منافی ہے اور یہی کچھ قاضی صاحب فرماتے ہیں۔ حتیٰ کہ باقرار مؤلف خیر الکلام قاضی صاحبؒ مقتدی کے لیے فاتحہ کی قرأت کو سکتات میں احوط کہتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو خیر الکلام ص ۵۴۸) کہ قاضی صاحبؒ نے فرمایا کہ

---

[1] قاضی صاحبؒ موصوف اپنے وقت کے متبحر اور وسیع المطالعہ محقق عالم تھے۔ نواب صدیق صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ القاضی، العلامہ، الامام، الانور، الزکی، المنور اور عز الاسلام تھے اور لکھتے ہیں کہ وہ کمال عالم انسانی پر حاوی تھے۔ (اکسیر ص ۹)

اگر ممکن ہو تو فاتحہ کو امام کے سکتات میں پڑھنے میں زیادہ احتیاط ہے۔ (نیل جلد ۲ صـ۲۳۷) اور فرماتے ہیں کہ قرآن وسنت کے عمومی دلائل مقتدی پر استماع وانصات کو واجب قرار دیتے ہیں۔

حافظ ابو عمرؒ بن عبد البرؒ (یوسف بن عبد اللہ المتوفی ۴۶۳ھ):

لکھتے ہیں کہ حضرت امام مالکؒ (وغیرہ) جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے امام کے پیچھے قرأت کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔

وحجته قوله تعالیٰ واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون لا خلاف انه نزل فی هٰذا المعنیٰ دون غیره ومعلوم انه فی صلوٰة الجهر لان السر لا یسمع فدل علیٰ انه اراد الجهر خاصة۔
(بحوالہ اوجز المسالک جلد ۱ ص ۲۴۸)

اور ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ جب قرآن کریم کی قرأت ہو رہی ہو تو تم اس کی طرف توجہ کرو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم ہو اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ اس آیت کا شان نزول صرف یہی ہے۔ نہ کہ کوئی اور۔ اور یہ ظاہر ہے کہ استماع تو صرف جہری نمازوں میں ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس آیت سے فقط جہری نمازیں مراد ہوں گی نہ کہ سرّی۔

انشاء اللہ العزیز یہ بات تو اپنے مقام پر آئے گی کہ آیت میں صرف استماع کا لفظ ہی نہیں جو بقول ان کے محض جہری نمازوں کو شامل ہے (اور نیز استماع اور سماع میں بھی فرق ہے۔) بلکہ اس میں انصات کا لفظ بھی ہے جو سرّی نمازوں کو بھی شامل ہے لیکن حافظ المغرب قرآن کریم کی مذکورہ آیت کا شان نزول نماز اور خلف الامام کا مسئلہ بتلاتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ پوری ذمہ داری اور وضاحت سے تحریر فرماتے ہیں کہ آیت مذکورہ کا شان نزول صرف نماز اور خلف الامام کا مسئلہ ہے اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف

لہ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، شیخ الاسلام اور حافظ المغرب لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۳ صـ۳۰۶) علامہ ابو الولید باجیؒ ان کو احفظ اہل المغرب کہتے ہیں (ایضاً صـ۳۰۷) امام حمیدیؒ کہتے ہیں کہ وہ فقیہ، حافظ کثیر التصنیف قرأت اور علم خلاف کے عالم اور علوم حدیث اور اسماء الرجال کے مسلّم امام تھے (ایضاً صـ۳۰۷) غرضیکہ وہ حفظ اتقان میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ علامہ ابن حزمؒ کہتے تھے کہ میں نے فقہ الحدیث پر ابن عبد البرؒ کی کتاب التمہید کی مانند کوئی کتاب نہیں دیکھی چہ جائیکہ اس سے بہتر اور اعلیٰ اور کتاب الاستذکار اسی کا ملخص ہے (تذکرہ جلد ۳ صـ۳۰۷) حافظ ابن القیمؒ ان کو الامام الحافظ اور اپنے زمانہ میں امام اہل السنت لکھتے ہیں۔ (اجتماع الجیوش الاسلامیہ صـ۴۶)

نہیں ہے۔ انصاف شرط ہے کہ اس اجماع واتفاق کے بعد اور کون سی تفسیر معتبر اور قابل اعتماد ہو سکتی ہے؟ جو حضرات صحابہ کرامؓ سے لے کر قاضی شوکانی صاحبؒ تک ہر دور، ہر طبقہ اور ہر مسلک کے فقہاؒ و محدثینؒ، مورخینؒ اور مفسرینؒ کے ہاں طے شدہ حقیقت ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (جن کے نام اور محاسن سے مقدمہ میں آپ اچھی طرح متعارف ہو چکے ہیں۔) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فالنزاع من الطرفين لكن الذين ينهون عن القرأة خلف الامام جمهور السلف والخلف ومعهم الكتاب والسنة الصحيحة والذين اوجبوها على المأموم فحديثهم ضعفه الائمة۔

(تنوع العبادات ص۸۶)

مسئلہ زیر بحث میں نزاع تو طرفین سے ہے لیکن جو لوگ امام کے پیچھے قرأت سے منع کرتے ہیں۔ وہ جمہور سلف وخلفؒ ہیں اور ان کے ہاتھ میں کتاب اللہ اور سنت صحیحہ ہے اور جو لوگ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرأۃ کو واجب قرار دیتے ہیں۔ ان کی حدیث کو ائمہؒ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے۔

مطلب ظاہر ہے کہ منکرین قرأت خلف الامام صرف چند نفوس نہیں، بلکہ جمہور سلف وخلفؒ ہیں اور یہ نظریہ جمہور نے اجتہاد اور قیاس ہی سے قائم نہیں کر لیا۔ بلکہ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے لیا ہے اور جو لوگ امام کے پیچھے قرأت تجویز کرتے ہیں۔ ان کا ہاتھ کتاب اللہ سے یکسر خالی ہے اور محض حدیث پر ان کے استدلال کی بنیاد قائم ہے اور حدیث بھی وہ ہے جس کی تضعیف ائمہ حدیث سے منقول ہے۔ (پوری تفصیل اپنے مقام پر آئے گی انشاء اللہ العزیز۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ

وقول الجمهور هو الصحيح فان الله سبحانه وتعالى قال واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون قال احمد اجمع الناس على انها نزلت في الصلوٰة۔

(فتاوی جلد ۲ ص۴۱۲)

جمہور کا مسلک اور قول ہی صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جب قرآن کریم پڑھا جائے تو تم اس کی طرف توجہ کرو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔ امام احمدؒ بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ سب لوگوں کا اس پر اتفاق اور اجماع ہے کہ اس آیت کا شان نزول نماز ہے۔

شیخ الاسلامؒ کی اس عبارت نے اس امر کی مزید تشریح کر دی ہے کہ آیت مذکورہ کا شان نزول ہی نماز ہے اور اس پر تمام اہل اسلام اور ائمہ دینؒ کا یعنی حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ و اتباع تابعینؒ اور جمہور سلف و خلفؒ کا اجماع و اتفاق ہے ۔ یہی شیخ الاسلامؒ ایک دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ

وذکر احمدؒ بن حنبلؒ الاجماع علیٰ انها نزلت فی الصلوٰۃ وذکر الاجماع علیٰ انها لا تجب القرأۃ علی المأموم حال الجهر (فتاوٰی جلد ۲ ص ۱۴۳)

امام احمدؒ بن حنبلؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے ۔ نیز اس پر بھی اتفاق نقل کیا ہے کہ جب امام جہر سے قرأۃ کرتا ہو تو مقتدی پر قرأت واجب نہیں ہے ۔

اور نواب صاحبؒ اس آیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

وایں آیت دلالت نمی کند مگر بر منع قرأت در حال جہر امام بقرأت لقولہ فاستمعوا واستماع نمی باشد مگر از برائے قرأت مجہور بہانہ برائے قرأت مخافتت ... الخ

(دلیل الطالب ص ۲۸۰)

قارئین کرام! آپ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے لے کر قاضی شوکانیؒ اور نواب صاحبؒ تک کی عبارات ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ اس مذکورہ آیت کا شان نزول صرف نماز ہے خطبہ (وغیرہ) عموم الفاظ کے لحاظ سے بالتبع اور ضمنی طور پر اس حکم میں شامل ہے ۔ اور حافظ ابن عبد البرؒ اور شیخ الاسلامؒ سے یہ بھی سُن چکے ہیں کہ اس بات پر تمام اہل اسلام کا اجماع اور اتفاق ہے کہ اس کا شان نزول فقط نماز ہے ۔ اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے ۔ اور اجماع کے نقل کرنے والے بھی امام اہل السنت اور مقتدائے ملت حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ ہیں اور آپ یہ بھی سُن چکے ہیں کہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرأت کرنا اجماع اور اتفاق کے سراسر خلاف ہے ۔ اس تمام بحث کو پیش نظر رکھتے ہوئے فریق ثانی بے بنیاد دعاوی کو (جن کا ذکر سخن ہائے گفتنی میں ہو چکا ہے) دیکھیے کہ حق کس کے ساتھ ہے؟ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ کس کے ہاتھ میں ہے اور جمہور سلف و خلفؒ کی معیت کس کو نصیب ہے؟

نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ

کوئی دعویٰ اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا۔ جب تک کتاب اللہ و سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور بیّنۂ عادلہ سے اس پر ثبوت نہ پیش کیا جائے۔ دلیل الطالب ص۳۹

الحمدللہ تعالیٰ کہ قرآن کریم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد جمہور سلف و خلفؒ کی معیت بھی ہمیں حاصل ہے جو بفحوائے حدیث کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتی اور نہ ہوگی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس آیت کے سلسلہ میں فریق ثانی کی طرف سے قدیماً و حدیثاً جو جو اعتراضات اور معارضات وارد کیے گئے ہیں ان پر بھی طائرانہ نگاہ ڈال لیں کہ ان کی حقیقت کیا ہے ان کو ایک خاص ترتیب سے ہم نقل کرتے ہیں اور ہر ایک کا جواب ساتھ ساتھ عرض کرتے جائیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

پہلا اعتراض:

مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ علامہ زیلعیؒ نے "نصب الرایہ ۲ ص۱۴" میں امام بیہقیؒ کے حوالہ سے امام احمد بن حنبلؒ کا جو یہ قول نقل کیا ہے کہ آیت واذا قرئ القرآن کا شان نزول اجماع اور اتفاق سے نماز ہے تو مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے امام بیہقیؒ کی معرفت السنن و الآثار اور کتاب القراۃ کا مطالعہ کیا ہے لیکن ان میں مجھے یہ قول نہیں مل سکا۔

(تحقیق الکلام جلد ۲ ص۹۵، تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص۲۵۹ و ابکار المنن ص)

جواب:

مبارک پوری صاحبؒ کا یہ اعتراض چند وجوہ سے باطل ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ علامہ جمال الدین زیلعیؒ[1] (المتوفی ۷۶۲ھ) نقل میں بڑے محتاط اور ثقہ ہیں اور پھر انھوں نے امام بیہقیؒ کی کسی خاص کتاب کا نام بھی نہیں لیا۔ اور امام بیہقیؒ کثیر التصانیف تھے۔ لہٰذا مبارکپوریؒ صاحب کا ان کی صرف دو یا تین کتابیں دیکھ کر یہ نظریہ قائم کرنا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے؟

---

[1] جو الشیخ الامام، الحافظ اور الحجۃ تھے۔ مولانا عبدالحی صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ من اعلام العلماء اور فقہ حدیث اور اسماء الرجال کے مسلّم امام تھے۔ فوائد البہیہ ص۲۲۵

وثانیاً — نواب صاحبؒ نے تو جمہور کیساتھ اس امر پر اتفاق کیا ہی تھا کہ عدم علم اُو علم بعدم نیست۔ (بدور الاہلہ ص۳۷۹) مگر مبارک پوری صاحبؒ کو بھی اس کا اقرار ہے کہ عدم نقل عدم وقوع کو مستلزم نہیں (تحقیق الکلام ۲ ص ۱۳) اگر مبارکپوری صاحبؒ کو اس کا علم نہیں ہو سکا تو اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ یہ جملہ اور قول ہی کتابوں سے نکل کر بھاگ گیا ہے؟

وثالثاً — تنہا علامہ زیلعیؒ ہی اس قول کے ناقل نہیں بلکہ علامہ موفق الدین ابن قدامہؒ (مغنی جلد۱ ص۶۰۵ میں) اور علامہ شمس الدینؒ بن قدامہؒ (شرح مقنع للکبیر جلد۲ ص۱۳ میں) اور حافظ ابن ہمامؒ (فتح القدیر جلد۱ ص۲۴۱ میں)، اور ملا علی القاریؒ (شرح نقایہ جلد۱ ص ۸۳ میں اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (اپنے فتاوے میں جیسا کہ گزر چکا ہے) وغیرہ سب اس کو نقل کرتے ہیں۔ مبارک پوری صاحبؒ کو ان کتابوں کی طرف مراجعت کرنی چاہیے تھی تاکہ علامہ زیلعیؒ کے قول کی صداقت معلوم ہو جاتی۔

ورابعاً — لیجیے ہم مبارکپوری صاحبؒ کے ہم مسلک اور ہم مشرب عالم سے یہ منوا دیتے ہیں مولانا عبد الصمد صاحب پشاوریؒ غیر مقلد نقل کرتے ہیں کہ

والاصح کونہا فی الصلوٰۃ لما روی البیہقیؒ عن الامام احمدؒ قال اجمعوا علی انہا فی الصلوٰۃ۔	صحیح ترین بات یہ ہے کہ آیت واذا قرئ القرآن کا شان نزول ہی نماز ہے جیسا کہ امام بیہقیؒ نے امام احمدؒ سے نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نماز کے بارے میں نازل ہونے پر اجماع و اتفاق ہے۔

(اعلام الاعلام فی قرأۃ خلف الامام ص۱۹)

لہ بعض ائمہ نے حدیث قلتین کی تصحیح کی نسبت امام طحاویؒ کی طرف کی تھی۔ مولانا شوق نیمویؒ نے لکھا کہ مجھے شرح معانی الآثار میں تصحیح نہیں مل سکی۔ اس پر مبارک پوری صاحبؒ یوں گرفت کرتے ہیں کہ تصحیح کی نسبت کرنے والوں نے امام طحاوی کی کسی خاص کتاب کا نام نہیں لیا۔ لہٰذا نیموی صاحبؒ کو ان کی دوسری کتابیں دیکھنی چاہیے تھیں۔ (نہ معلوم یہ مفید مشورہ یہاں کیوں بھول گئے ہیں — ؟ مگر کیا جائے: ع "تمہیں عادت ہے بھول جانے کی"۔

ٹلہ المتوفی ۶۸۲ھ جو الامام الفقیہ الزاہد الخطیب اور قاضی القضاۃ تھے۔ (مقدمہ مغنی ص ۱۲)

ٹلہ المتوفی ۸۶۱ھ اپنے وقت کے امام محدث اور فقیہ تھے اور ان کا شمار اہل ترجیح میں ہے۔ (فوائد البہیہ ص۱۸۰)

ٹلہ المتوفی ۱۰۱۴ھ علم و تحقیق کے یگانہ اور محدث و فقیہ تھے۔ (تعلیقات ص ۸)

نوٹ: یہ کتاب نواب صاحبؒ کی مشہور کتاب "لقطۃ العجلان" کے ساتھ منضم ہے۔ اور دونوں یکجا طبع ہوئی ہیں۔ اس سے بڑھ کر ہم مبارک پوری صاحبؒ کو اور کیا ثبوت دے سکتے ہیں؟

دوسرا اعتراض

مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس آیت کا خطاب مومنوں کو نہیں بلکہ کافروں کو ہے۔ جو تبلیغ کے وقت شور و غل مچایا کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ قرآن نہ سنو جیسا کہ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر (الکبیر جلد۴ ص ۵۰۲) میں لکھا ہے اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ اگر واقعی خطاب مومنوں کو ہوتا تو لعلکم کے لفظ کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ یہ لفظ ترجی کے لیے آتا ہے اور مومن بہرحال رحمت خداوندی کا مورد اور مستحق ہیں۔ (تحقیق الکلام جلد۲ ص و تحفۃ الاحوذی جلد۱ ص ۲۵۹) اور مولانا میر صاحبؒ لکھتے ہیں اور نہ اس کا خطاب مومنوں سے ہے جس نے اس کا خطاب مومنوں سے سمجھا اس نے سلسلۂ عبارت اور سیاق مضمون پر غور نہیں کیا۔ (تفسیر واضح البیان ص ۵۰۲) اور یہی مضمون کم و بیش مولانا عبد الصمد صاحب پشاوریؒ لکھتے ہیں۔ (اعلام از اعلام ص ۱۹۰) اور یہی عذر لنگ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۳۴۳)

جواب

یہ اعتراض بھی بالکل بے جان اور بے بنیاد ہے۔ اس لیے کہ آپ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت ابن مسعودؓ سے لے کر قاضی شوکانیؒ تک اکثر حضرات مفسرین کا بلکہ تمام امت کا اجماع و اتفاق سن چکے ہیں کہ اس آیت کا خطاب نہ صرف مومنوں سے ہے بلکہ اس کا شان نزول ہی نماز ہے۔ اس اجماع کے مقابلہ میں ایسے لغو اور پادر ہوا نظریہ اور رائے کو کون سنتا ہے؟ ہم سہولت کے لیے اس اعتراض کا یوں تجزیہ کر سکتے ہیں یہ تجزیہ اس لیے ضروری ہے کہ بات سمجھ آ سکے، کہ ان حضرات کے اعتراض کے یا بزعم خود استدلال کے تین مرکزی نقطے ہیں۔ ہم ان کو الگ الگ بیان کر کے ان کا جائزہ لیتے ہیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ یہ آیت کافروں کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ مومن اس کے مخاطب

نہیں ہیں - دلائل یہ ہیں :

(۱) امام رازیؒ نے یوں کہا ہے -

۲- لَعَلَّكُمْ کا لفظ اس کی تائید کرتا ہے -

۳- سیاق و سباق کا تقاضا یہی ہے -

پہلی جزو کا جواب

یہ ٹھیک ہے کہ حضرت امام رازیؒ (المتوفی ۶۰۶ھ) منطق و فلسفہ اور عقلیات وغیرہ کے مسلّم امام تھے - لیکن فنِ روایت اور نقلیات میں ان کا پایہ نہایت کمزور تھا - حافظ ابنِ حجرؒ لکھتے ہیں امام رازیؒ عقلیات کے مسلّم امام ہیں، لیکن احادیث و آثار میں ان کا پایہ کمزور ہے - یہی وجہ ہے کہ ان کی تفسیر میں رطب و یابس سبھی کچھ موجود ہے - (لسان المیزان جلد۴ ص۴۲۶) امام سیوطیؒ نقل کرتے ہیں کہ تفسیر کبیر میں سبھی کچھ ہے مگر اس میں تفسیر نہیں - (درمنثور جلد۳ ص۱۵۵ و اتقان جلد۲ ص ۱۸۹) - نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ مؤلف وے از علم حدیث بے خبر است و در علوم کلام و فنون رسمیہ امام اہل زماں بعضے از اہل معرفت بعلوم کتاب و سنت گفتہ اند - فیہ کل شيء الا التفسیر - (اکسیر ص۱۰۲)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ رازیؒ از علم حدیث خبر ندارد (اکسیر ص۱۱۳) فریقِ ثانی ہی ازراہِ انصاف فرمائے کہ قرآنِ کریم کی مذکورہ آیت کی تفسیر جو حضرات صحابہ کرام رضؓ و تابعینؒ اور جمہور سلف و خلفؒ سے صحیح اسانید سے نقل کی جاچکی ہے (بلکہ اسی پر اُمّت کا اجماع ہے اور کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے) وہ قابلِ حجت ہے یا امام رازیؒ کی تفسیر؟ ؎

من نہ گویم کہ ایں مکن آں کُن !
مصلحت بین و کار آساں کُن !

دوسری جزو کا جواب

امام رازیؒ کا لفظ لَعَلَّ سے یہ استدلال کرنا کئی وجوہ سے غلط ہے :

اوّلاً : لفظ لَعَلَّ اگرچہ ترجی کے معنیٰ میں ہے - لیکن حضرات مفسرین کرامؒ اور ائمہ نحوؒ اس

امر کی تصریح کرتے ہیں کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وجوب کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے، علامہ خازنؒ لکھتے ہیں، لَعَلّ و عسی من اللہ واجب (جلد۲ ص۲۲۳) اور صاحب مدارک علامہ عبداللہ بن احمد النسفیؒ (المتوفی ۷۰۱ھ) لکھتے ہیں کہ

ولعل للترجی والاطماع ولکن من کریم فیجری مجری وعدہ المحتوم وفائہ وبہ قال سیبویہ۔ (مدارک جلد۱ ص۵)

لَعَلّ کا لفظ ترجی اور طمع دلانے کے لیے آتا ہے۔ لیکن ذاتِ باری سے یہ حتمی اور ضروری وعدہ کے طور پر آتا ہے اور سیبویہؒ اسی کا قائل ہے۔

علامہ جار اللہ رحہ لکھتے ہیں کہ بادشاہوں کی عادت ہے کہ جب کسی چیز کا وعدہ کرتے ہیں تو اپنی شانِ استغنا کو ملحوظ رکھ کر لَعَلّ و عسی استعمال کرتے ہیں۔ (کشاف جلد۱ صہ۹۲)

اور مولانا تھانویؒ (المتوفی ۱۳۶۲ھ) لکھتے ہیں، شاہی محاورہ میں لَعَلّ کے معنیٰ عجب نہیں کے آتے ہیں۔ (بیان القرآن جلد۱ ص۱) لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی شانِ بے نیازی کے مطابق لعلکم کے لفظ کے ساتھ مومنوں سے خطاب کیا ہے تو اس میں خرابی کیا ہے؟

ثانیاً۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مومنوں کے لیے لعل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ نہ معلوم وہاں یہ منطق کیسے چلے گی؟ ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے لعلکم تتقون۔ (پ۲۔ بقرۃ) تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

اور ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ رجوع کرو اللہ تعالیٰ کی طرف اے مومنو سب کے سب لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (پ۱۸۔ نور ع۴) تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اور اس آیت میں خطاب بھی تمام مومنوں کو ہے جب مومن ہیں تو ان کی کامیابی یقینی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے کہ قَدْ افلح المومنون۔ (پ۱۸ المؤمنون رکوع۱) تحقیق مومن فلاح پا چکے ہیں۔ اگر لعلکم کے خطاب سے مومن مراد نہیں ہو سکتے تو قرآنِ کریم کی اِن آیات کا کیا مطلب ہو گا؟

اور ایک مقام پر یہ فرمایا ہے کہ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان کہی جائے تو تم جلدی پہنچو۔ آگے ارشاد ہوتا ہے لعلکم تفلحون (پ جمعہ۲) تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

وثالثاً۔ اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے تو کیا قرآن کریم اور صحیح احادیث میں اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ بعض مومن اپنی ناشائستہ حرکات کی بنا پر خدا تعالیٰ کی رحمت کے مستحق نہیں رہتے ؟ کیا قاتل، چور، شرابی، زانی، راشی اور سود خور وغیرہ کے لیے لعنت اور غضب وغیرہ کے الفاظ قرآنِ کریم اور حدیث میں وارد نہیں ہوئے ؟ اور کیا وہ خدا تعالیٰ کی رحمت کے حق دار اور محتاج نہیں ؟ یا ان کے لیے یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی رحمت کے دروازے کھلے اور رحمت واجب ہے ؟ اور کیا رحمت کا مستحق صرف کافر ہی ہو سکتا ہے ؟

ورابعاً۔ تمام علمائے اسلام کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ قرآنِ کریم تمام اقوام عالم کے لیے ایک دستور العمل اور ضابطۂ حیات ہے اور قرآن کے کسی حکم اور آیت کو اس کے شان نزول اور خاص سبب پر منحصر کر دینا بالکل بے کار اور بے حقیقت ہے۔ اگرچہ اکثر احکام کے نزول کا کوئی نہ کوئی سبب اپنی جگہ ضرور ہو گا۔ حضرت امام شافعیؒ لکھتے ہیں کہ آیات کے اسباب و شان نزول کچھ ہی ہوں۔ مگر احکام کی دار و مدار الفاظ پر ہے۔ (کتاب الام جلد ۵ ص ۲۴۱)

حافظ ابنِ تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم کے عمومی احکام کو اسباب نزول پر مقید کر دینا باطل ہے۔ (الصارم المسلول ص ۵۰) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ جمہور علماء اصول و فروع کے نزدیک اعتبار عموم لفظ کا ہے نہ کہ خصوص سبب کا۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۹) حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ جن اسباب کی وجہ سے عبادات کی مشروعیت ہوئی ہے۔ ان کا دوام شرط نہیں ہے، جیسا کہ طواف میں رمل اور صفا و مروہ پر سعی کا سبب مشرکین کا اعتراض تھا، لیکن باوجود ان مشرکوں کے ختم ہونے کے اس کا حکم قیامت تک باقی رہے گا۔ (بدائع الفوائد جلد ۳ ص ۱۶۱)

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص مورد کا (فتح الباری جلد ۸ ص ۱۴۱)

امام سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ اعتبار تعمیم الفاظ کا ہو گا نہ کہ خصوص سبب کا (اتقان جلد ۱ ص ۴۷)

قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ عام کو سبب پر بند کر دینا مرجوح اور کمزور مذہب ہے۔ (نیل الاوطار جلد ۲ ص ۱۲۹)

نواب صدیق حسن خان صاحب لکھتے ہیں کہ خصوص سبب کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا بلکہ اعتبار عموم لفظ کا ہو گا۔ (دلیل الطالب ص ۴۱۳) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: وعبرت

بعموم لفظ است نہ بخصوص سبب، چنانکہ در اصول متقرر است (بدور الاہلہ ص ۲۰۹)

مولانا عبدالصمد پشاوریؒ لکھتے ہیں کہ والحق ان المقرر اعتبار عموم المبنی و لو خص سببہٗ (اعلام الاعلام ص ۱۹۰) اور اس قاعدہ کو مبارک پوری صاحبؒ بھی صاف لفظوں میں تسلیم کرتے ہیں (دیکھئے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۶۳) مؤلف خیر الکلام نے پہلے تو لاجواب ہو کر اِدھر اُدھر کی بے کار باتیں کی ہیں پھر اقرار پر بھی مجبور ہو گئے ہیں۔

چنانچہ لکھتے ہیں کہ یہ آیت نماز کو بھی شامل ہے خواہ اس طرح شامل ہو کہ اس آیت میں مقتدیوں کو خطاب ہو یا سب مسلمانوں کو جس میں مقتدی بھی داخل ہیں یا اس طرح شامل ہو کہ خطاب تو کفار کو ہو مگر نمازی اور سب مسلمان عموم علت کی بنا پر داخل ہوں۔ (اھ ص ۳۴۸)

اگر بالفرض آیت مذکورہ کا شانِ نزول صحیح روایات اور آثار سے نماز نہ بھی ثابت ہوتا۔ بلکہ یہ آیت کافروں کے حق میں ہی نازل ہوتی۔ تب بھی اس کو کافروں پر منحصر سمجھنا اور مسلمانوں اور مومنوں کو اس سے خارج کر دینا باطل ہے۔ حالانکہ اس کا شانِ نزول ہی (مومن اور) نماز ہے۔ مگر افسوس ہے کہ فریقِ ثانی یہ کہتا ہے کہ اس آیت کا جو اوّلین سبب اور مصداق تھا۔ اس کو یہ آیت شامل نہیں ہے۔ یہ تو صرف کافروں کو شامل ہے۔ حیرت اور تعجب ہے اس غلط نظریہ پر۔

وخامساً۔ اگر فریق ثانی کی یہی منطق صحیح تسلیم کر لی جائے تو نہ معلوم ان کا قرآنِ کریم کے ان عمومی احکام کے بارے میں کیا ارشاد ہوگا جو بظاہر ایک کافر اور مشرک قوم کے بارے میں نازل ہوئے تھے۔ مثلاً ایک مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے نبیؐ آپ اِن کافروں سے کہہ دیجیے کہ آؤ میں تمھیں وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں، جو تمھارے رب نے تم پر حرام کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ قتلِ اولاد کا ارتکاب نہ کرو۔ فواحشات کے قریب نہ جاؤ۔ خُون ناحق نہ کرو۔ یتیم کا مال نہ کھاؤ وغیرہ وغیرہ۔ (پارہ ۸، سُورۃ انعام) کیا یہ کہنا بجا اور صحیح ہوگا کہ یہ احکام تو کافروں اور مشرکوں کے حق میں نازل ہوئے ہیں۔ لہٰذا مومن کے لیے شرک کرنا، قتل کرنا اور یتیم کا مال ہڑپ کر لینا بالکل جائز ہے؟ فریق ثانی نے یہ عجیب قاعدہ نکالا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ فرما دیں کہ ہم تو گروہ بندی کا

شکار ہو کر قاعدہ سے بے نیاز ہیں ؎

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتادو قاعدہ　　اے اسیرانِ قفص میں تو گرفتارِ وں میں نئیس

تیسری جزو کا جواب

ہو سکتا ہے کہ بہیر صاحبؒ کا سیاق و سباق کے بارے میں قاعدہ ہی کوئی نرالا اور ماوراء الادراک ہو اور ہم اس کو نہ سمجھ سکیں۔ لیکن بحمد اللہ تعالیٰ اس آیت کا سیاق اور سباق ہم بیان کر سکتے ہیں اور بہیر صاحب کو فکر و غور کی دعوت دیتے ہیں اور مخلصانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ ارشاد فرمائیں کہ غور کس نے نہیں کیا؟

اہلِ ایمان کے تین درجے ہو سکتے ہیں۔ اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ۔ جو لوگ توحید و معرفت کے تمام زینوں کو طے کر کے اس مقام پر فائز ہو جاتے ہیں کہ کارخانۂ زمین و آسماں کی علوی اور سفلی چیزیں مشاہدہ کے طور پر ان کے سامنے آجاتی ہیں اور وہ عین الیقین تک پہنچ جاتے ہیں تو ایسے لوگ اصحاب بصیرت کہلاتے ہیں اور جو لوگ نظر و استدلال سے کسی حقیقت تک پہنچنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور وہ علم الیقین کے درجہ تک پہنچ کر خود ان کا قدم ہدایت سے ایک انچ نہیں ہٹتا اور لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنتے ہیں تو وہ ہادی اور مہدی کہلاتے ہیں اور جن کو نہ پہلا درجہ حاصل ہوتا ہے اور نہ دوسرا، صرف یہی جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے وہ گروہ عامۃ المومنین کا ہے، جن کو حق الیقین کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق رحمت کے امیدوار ہوتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔

(پ ۹، اعراف ۲۴)

یہ سمجھ کی باتیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت و رحمت ہے اُن لوگوں کے لیے جو مومن ہیں اور جس وقت قرآن کریم پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے تین طبقوں کی خوبیوں کو علی الترتیب **هٰذا بصائر من ربکم و هدی و رحمۃ** کے ارشاد سے بیان فرما کر لقوم یؤمنون کہہ کر سب کو مومن کا خطاب

اور لقب عطا فرمایا ہے اور آگے قرآن کریم کی طرف توجہ کرنے اور خاموش رہنے کا حکم دیا ہے۔ اس سے زیادہ صحیح اور مضبوط ربط اور کیا ہو سکتا ہے کہ پہلی آیت لقوم یومنون پر ختم ہوتی ہے اور دوسری واذا قریٔ القراٰن الآیۃ سے شروع ہوتی ہے۔ پہلی آیت میں مومنوں کے تین طبقوں کی خوبیوں کا ذکر ہوتا ہے اور دوسری آیت میں بصیرت، ہدایت اور رحمت کے سرچشمے قرآنِ کریم کا ذکر ہوتا ہے۔ پہلی آیت میں اللہ کی رحمت کا ذکر ہے اور دوسری میں لعلکم ترحمون سے مستحقین رحمت کا تذکرہ ہے۔ اس سے بڑھ کر اس مضمون کا اپنے سیاق و سباق سے اور کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اور تمام اہل اسلام اور جملہ معتبر مفسرین کرامؒ اس کا یہی ربط اور تعلق سمجھے ہیں۔ خوفِ طوالت سے صرف دو شہادتیں ہی نقل کی جاتی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

علامہ خازنؒ لکھتے ہیں کہ

واذا قری علیکم ایھا المؤمنون القراٰن فاستمعوالہ یعنی اصغوا الیہ باسماعکم لتفھموا معانیہ وتتدبروا مواعظہ وانصتوا یعنی عند قرأتہ۔ (تفسیر خازن جلد ۲ ص ۲۷۶)

اے مومنو! جب تم پر قرآن کریم پڑھا جائے تو تم اس کی طرف توجہ کرو یعنی بگوش ہوش اس کی طرف مائل ہو جاؤ تاکہ تم اس کے معانی سمجھو اور اس کی نصائح سے تدبر اور غور کر کے فائدہ حاصل کرو اور اس کی قرأت کے وقت خاموش رہو۔

اور حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ کافر لوگ قرأتِ قرآن کے وقت شور و غل مچایا کرتے تھے۔

وقد امر اللہ عبادہ المؤمنون خلاف ذلک فقال واذا قری القراٰن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۸۹)

لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو اس کے خلاف حکم دیا ہے کہ جب قرآنِ کریم پڑھا جاتا ہو تو تم اس کو سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔

اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام مومنوں کے سردار سید الانبیاء و امام المرسلین و خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خطاب کیا ہے کہ آپ اپنے رب کو دل میں عاجزی اور زاری کرتے ہوتے صبح و شام یاد کرتے رہیں گو خطاب آپ کو ہے لیکن گفتہ آید در حدیثِ دیگراں کے قاعدہ کے مطابق حکم سب کو دیا گیا ہے۔

بہر حال اس آیت سے قبل بھی مومنوں کا ذکر ہے اور بعد بھی اکمل ترین مومن سے خطاب

ہے۔ میر صاحب کو اس سے بہتر سیاق و سباق کہاں سے ملیگا مگر ہاں یہ بات الگ ہے کہ دو نسلم کا کوئی جواب نہیں ہے۔ بفضلہٖ تعالیٰ ہم نے تو حقِ وفا ادا کر دیا ہے شاید آپ فرماویں سہ

بلک کر کہہ رہا ہے جانے کیا کیا تیرے گوشے میں
عجب انداز ہے اس کا یہ کوئی دل جلا ہوگا۔

تیسرا اعتراض:

مبارک پوری صاحبؒ (وغیرہ) لکھتے ہیں کہ اس آیت کا شانِ نزول خطبہ ہے جیسا کہ امام بیہقیؒ نے (کتاب القراۃ ص ۷۵ میں) لکھا ہے۔ لہٰذا اس آیت سے قراءت خلف الامام کے عدم جواز پر استدلال صحیح نہیں ہے۔ (ابکار المنن ص ۱۴۵)

جواب

یہ اعتراض بھی بے حقیقت اور بے کار ہے؛ اوّلاً: اس لیے کہ دلائل اور براہین سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول ہی نماز ہے خطبہ وغیرہ اس کے عمومی اور ضمنی حکم میں شامل ہے۔

وثانیاً۔ خطبہ سے اگر جمعہ کا خطبہ مراد ہو تو امام بغویؒ کے حوالہ سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ جمعہ کی فرضیت مدینہ میں ہوتی ہے اور آیت مکّی ہے۔ اور امام ابن جریرؒ لکھتے ہیں کہ جمعہ کی فرضیت سلسہ ھ میں ہوئی ہے حالانکہ آیت مذکورہ بالاتفاق مکّی ہے اور مولانا عبدالصمدؒ لکھتے ہیں کہ جو لوگ اس آیت کا شانِ نزول خطبہ بتلاتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں کیونکہ یہ آیت مکّی ہے اور خطبہ کا حکم مدینہ میں ہوا ہے۔ (اعلام الاعلام ص ۱۸۹) اور اگر خطبہ سے مراد عید کا خطبہ ہے تو وہ بھی صحیح نہیں کیونکہ عید کی نماز کا حکم بھی مدینہ طیبہ میں ہوا تھا۔ (طبری ص ۱۲۸۱)

وثالثاً۔ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس آیت کا شانِ نزول جمعہ یا عید کا خطبہ ہے۔ تو اس سے نماز کو بالیقین خارج کرنا کیونکہ صحیح ہو سکتا ہے؟ جب کہ امت کا ایک معتد بہ طبقہ اس کا قائل ہے کہ اسبابِ نزول میں تعدد بھی جائز ہے جیسا کہ شیخ عبدالرحمٰن بن حسنؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔ (فتح المجید شرح کتاب التوحید ص ۱۵)

اور صحیح[1] احادیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر اس کا شانِ نزول خطبہ بھی ہو اور نماز بھی ہو تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اور یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہو گا نہ کہ خصوص سبب کا۔ الحاصل یہ اعتراض نقلاً و عقلاً ہر لحاظ سے مردود ہے اور ایک بھی صحیح روایت اس کی تائید نہیں کرتی کہ آیت مذکورہ کا شانِ نزول خطبہ ہے۔ روایات پر بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ رہی یہ بات کہ یہ نظریہ امام بیہقیؒ ایسے مشہور امام کا ہے تو یہ کوئی وزنی دلیل نہیں ہے۔ چنانچہ مبارکپوری صاحبؒ ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں کہ امام بیہقیؒ اگرچہ ایک مشہور محدث ہیں۔ مگر ان کا کوئی قول بلا دلیل معتبر نہیں ہو سکتا۔ (بلفظہٖ تحقیق الکلام جلد ۲، ص ۳۲)

---

[1] مثلاً بخاری جلد ۲ ص ۶۸۶ و مسلم جلد ۱ ص ۱۸۳ و ابو عوانہ جلد ۲ ص ۱۲۳ و نسائی جلد ۱ ص ۱۱۶ اور مسند احمد جلد ۱ ص ۲۱۵ وغیرہ میں آیت ولا تجهر بصلوتك ولا تخافت بها ... الآية کا شانِ نزول نماز بیان کیا گیا ہے۔ اور بخاری جلد ۲ ص ۶۸۷ و مسلم جلد ۱ ص ۱۸۳ اور ابو عوانہ جلد ۲ ص ۱۲۳ میں اسی آیت کا شانِ نزول دعا بتلائی گئی ہے اور محققین کی تصریح ہے کہ یہ تعدد اسباب نزول کا واضح ثبوت ہے۔

فائدہ: یہ تو آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ آیت مذکورہ کا صحیح اور حقیقی شان نزول نماز اور صرف نماز ہے۔ اور جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول خطبہ ہے تو وہ صرف اس مفہوم کے اعتبار سے کہ اس آیت کا مضمون عموم الفاظ کے لحاظ سے خُطبہ کو بھی شامل ہے۔ گویا یہ بھی اس کا شان نزول ہے۔ چنانچہ امام سیوطیؒ (تفسیر اتقان جلد ۱ ص ۳۱ میں) اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ (الفوز الکبیر ص ۲۲ میں) اور نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں: "وقسمے آنست کہ معنی آیت خود تام است بغیر احتیاج دانستن حادثہ کہ سبب نزول شدہ است و حکم عموم لفظ راست نہ خصوصِ سبب را قدمائے مفسرین بقصد احاطۂ آثار مناسبہ بآں آیت یا بقصد بیان ماصدق آں عموم آں قصہ را ذکر کردہ اند ایں قسم را ذکر کردن ضرور نیست۔ وصحابہؓ و تابعینؒ بسیار بود کہ نزلت فی کذا و کذا می گفتند و غرض ایشاں تصویر ما صدق آں آیت بود و ذکر بعض حوادث کہ آیت آں را بہ عموم خود شامل شدہ است خواہ ایں قصہ متقدم باشد یا متاخر و خواہ اسرائیلی باشد .... یا جاہلی یا اسلامی تمام قیود آیت را در گرفتہ باشد یا بعض آں را و ازیں جا دانستہ شد کہ اجتہاد را دریں قسم دخلی ہست و قصص متعددہ را آں جا گنجائش پس ہر کہ ایں نکتہ مستحضر دارد حل مختلفات سبب نزول بادنیٰ عنایت میتواں نمود۔ (اکسیر ص ۱۹) بہر حال شان نزول اسی واقعہ میں گو نماز ہے لیکن خطبہ بھی ماصدق آں آیت کا مصداق ہے۔

چوتھا اعتراض

مُبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ آیت واذا قری القرآن .... الاٰیۃ قرآن کریم کی دوسری آیت فاقرؤا ماتیسر من القرآن .... الاٰیۃ سے منسوخ ہے۔ لہٰذا اس سے مسئلہ خلف الامام کیسے ثابت ہوگا اور اس دعوی کے دلائل یہ ہیں:

۱- امام ابونصر مروزیؒ (المتوفی سنہ ۲۹۴ھ) لکھتے ہیں کہ آیت فاقرؤا .... الاٰیۃ مدینہ میں نازل ہوئی ہے کیونکہ اس آیت میں جہاد اور قتال کا حکم ہے اور جہاد کی فرضیت مدینہ میں ہوئی ہے۔ (قیام اللیل صلے)

۲- امام سیوطیؒ نقل کرتے ہیں کہ باقی تمام سورۃ مزمّل مکّہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے۔ مگر فاقرؤا ما تیسّر... الاٰیۃ (تفسیر اتقان جلد ۱ ص ۱۳)

۳- حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ زکوٰۃ مدینہ طیبہ میں فرض ہوئی ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ روزے بالاتفاق مدینہ فرض ہوئے ہیں اور حضرت قیسؓ بن سعد فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کی فرضیت سے قبل ہمیں صدقہ فطر ادا کرنے کا حکم تھا۔ جب زکوٰۃ فرض ہوئی تو نہ ہمیں فطرانہ ادا کرنے کا تاکیدی حکم دیا گیا اور اور نہ اس سے منع کیا گیا۔ (فتح الباری جلد ۴ ص ۱۱) اور اس آیت فاقرؤا ماتیسّر..... الاٰیۃ میں زکوٰۃ کا حکم بھی ہے۔ اور زکوٰۃ صدقہ فطر کے بعد فرض ہوئی اور صدقہ فطر صوم رمضان کا تتمہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیت فاقرؤا ماتیسّر... الاٰیۃ مدنی ہے۔ لہٰذا یہ ناسخ اور آیت واذا قری القرآن ... الاٰیۃ منسوخ ٹھہری اور منسوخ آیت سے استدلال اور احتجاج باطل ہے۔

(اوکما قال تحقیق الکلام ۲ ص۳۶)

جواب: یہ دعوی بھی قطعاً باطل اور بے بنیاد ہے۔ ترتیب وار ہر ایک شق کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔

پہلی شق کا جواب: حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ امام ابونصرؒ کا یہ دعوےٰ غلط ہے۔ اس لیے کہ تمام اہل اسلام اس پر متفق ہیں کہ سورۃ مزمّل کی آخری آیت بھی مکی ہے۔ امام ابونصرؒ کو قتال اور جہاد کے حکم سے جو شبہ ہوا ہے۔ وہ مردود ہے۔ کیونکہ اس میں ارشاد یوں ہوتا ہے۔

لہ ان کی یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۲۶۹، ابن ماجہ ص ۱۳۲، طیالسی ص۱۶۸ اور مستدرک جلد ۱ ص۴۱۰ وغیرہ میں مروی ہے۔

عَلِمَ اَنْ سَیَکُوْنُ مِنْکُمْ مَّرْضٰی وَآخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ ... الآیۃ

اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ عنقریب تم میں بعض آدمی بیمار ہوں گے اور بعض دیگر اللہ تعالیٰ کے راستہ میں نکلیں گے۔

اور بیماری وسفر میں پابندی کے ساتھ تہجد کی نماز ادا نہیں ہو سکے گی۔ اس کی تاکید اللہ تعالیٰ نے ساقط کر دی ہے اور اس آیت میں سَیَکُوْنَ (حرف سین جو استقبال کے لیے آتا ہے) سے خوشخبری سنا کر وجود[1] مشقّت سے پہلے ہی تہجد کی نماز کی فرضیت ساقط کر دی گئی ہے۔ اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ جہاد اور قتال کا حکم اس وقت نازل ہو چکا تھا؟ بہر حال آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے اور اس میں زمانۂ مستقبل میں جہاد اور قتال کے حکم کی خوشخبری سنائی گئی ہے اگر امام ابو نصرؒ سیکون میں حرف سین پر ہی نگاہ ڈال لیتے جو استقبال کے لیے آتا ہے تو ایسی فاحش غلطی کا ارتکاب نہ کرتے اور نہ اس آیت کو مدنی کہنے پر مجبور ہوتے۔ (فتح الباری جلد ۸ ص ۳۹۳)

دوسری شق کا جواب: امام سیوطیؒ نے یہ قول نقل کیا ہے لیکن پورے زور کے ساتھ اس کی تردید بھی کی ہے اور لکھتے ہیں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سورۂ مزمّل کی آخری آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے تو وہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ کیونکہ حضرت عائشہ[2] رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سورۂ مزمّل کا آخری حصّہ پہلے حصّہ کے نزول کے پورے ایک سال بعد نازل ہوا ہے۔ (تفسیر اتقان جلد ۱ ص ۳۸) اور سورۂ مزمّل قرآن کریم کی ابتدائی سورتوں میں سے ایک ہے چنانچہ مُبارکپوری صاحب لکھتے سب سے پہلے سورۂ قلم نازل ہوئی اور اس کے بعد سورۂ مزمّل۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۸)

---

[1] اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ وجودِ مشقّت سے قبل تنسیخ صحیح نہیں یا اس میں تردّد ہو تو اس کو معراج کی وہ طویل حدیث پڑھنی چاہیے جس میں پچاس نمازوں کی فرضیت کے بعد وجود مشقت سے قبل ہی باقی سب نمازیں معاف کر کے صرف پانچ ہی باقی رکھی گئیں ہیں۔

[2] ان کی یہ روایت مسلم جلد ۱ ص ۲۵۶، نسائی جلد ۱ ص ۱۸۲، ابو عوانہ جلد ۲ ص ۳۲۲ اور مستدرک جلد ۱ ص ۵۰۴ وغیرہ میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے اور اسی مضمون کی روایت حضرت ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے۔ مستدرک جلد ۲ ص ۵۰۵ وسنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۵۰۰۔ الغرض یہ صحیح روایتیں ابن غرسؒ کی اس روایت سے جس میں یونسؒ بن حبیبؒ وغیرہ راوی موجود ہیں جن کا اتا پتا کتب رجال سے نہیں ملتا۔ بدرجہا زیادہ قابل اعتماد ہیں۔

جب صحیح روایت سے یہ ثابت ہو گیا کہ سورۂ مزمّل من وعن سب کی ہے تو اس کو مدنی کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟

تیسری شق کا جواب: یہ دعویٰ کرنا کہ زکوٰۃ کی فرضیت مدینہ میں ہوئی صحیح نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ نفس زکوٰۃ کا حکم مکہ مکرمہ میں نازل ہو چکا تھا۔ کیونکہ سورۂ مومنون، سورۂ حم سجدہ اور سورۂ لقمان وغیرہ تمام مکی سورتوں میں زکوٰۃ کا حکم موجود ہے پھر یہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ زکوٰۃ مکہ میں فرض نہیں ہوئی تھی۔ باقی یؤتون الزکوٰۃ کو تزکیۂ نفس پر محمول کرنا تاویل بعید اور توجیہ رکیک کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور حضرت جعفر طیارؓ نے دربار نجاشیؓ میں جو تقریر کی تھی اس میں زکوٰۃ کا ذکر موجود ہے حالانکہ مہاجرین حبشہ ۵ نبوت میں ہجرت کر گئے تھے۔ (طبری ص ۱۱۱۸، زاد المعاد جلد ۲ ص ۶۱)

امام الائمہ ابن خزیمہؒ المتوفی ۳۱۱ھ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ مکہ مکرمہ میں فرض ہو چکی تھی۔ (فتح الباری ج۳ ص۲۱۱)

امام رازیؒ لکھتے ہیں کہ زکوٰۃ مکہ میں فرض ہو چکی تھی۔ (تفسیر کبیر جلد ۴ ص ۲۳۵) سید آلوسیؒ لکھتے ہیں کہ اکثر علما کی تحقیق یہ ہے کہ زکوٰۃ مکہ میں فرض ہو چکی تھی۔ (روح المعانی جلد ۱۹ ص ۱۴۱) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ سورۂ مزمّل کی آخری آیت ان لوگوں کی تائید کرتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نفس زکوٰۃ تو مکہ میں فرض ہو چکی تھی لیکن اس کے نصاب اور مقدار کی تعیین مدینہ طیبہ میں ہوئی ہے۔

(تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص ۴۳۹)

حضرت ابن عمرؓ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار اور تعیین نصاب سے پہلے اپنی ضرورت سے زائد سب مال صرف کر دینے کا حکم تھا۔ (فتح الباری جلد ۳ ص ۲۱۶) اس تحقیق کو پیش نظر رکھنے کے بعد حضرت قیسؓ بن سعد کی روایت کا مطلب یہ ہوگا کہ زکوٰۃ کے نصاب اور مقدار کی تعیین سے قبل صدقہ فطر[۱] کی اس لیے تاکید کی جاتی تھی تاکہ فقراء اور مساکین کی امداد اور اعانت

---

[۱] یہ روایت ابو داؤد جلد ۱ ص۱۹۲ میں مختصراً اور مسند احمد جلد ۵ ص ۲۹۱ اور مستدرک جلد ۲ ص ۳۱۰ وغیرہ میں مفصلاً موجود ہے۔ قال الحاکمؒ والذہبیؒ علیٰ شرطہما۔

[۲] یہ بات بھی نہ بھولیے کہ صحابہ کرامؓ کی مکی زندگی اور مدینہ طیبہ کا ابتدائی دور غربت اور افلاس کا دور تھا اس میں زکوٰۃ کے نصاب اور مقدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا صدقہ فطر کے تاکیدی حکم سے اس کی تلافی کر دی گئی تھی۔

بخوبی ہو سکے اور جب ۸ھ کے لگ بھگ زکوٰۃ کا نصاب اور مقدار مقرر ہوئی تو صدقہ فطر کا وہ تاکیدی اور فرضی حکم باقی نہ رہا۔ گو روزہ و صدقہ فطر کا حکم اور زکوٰۃ کا نصاب اور مقدار کی تعیین مدینہ طیبہ میں ہوئی اور صدقہ فطر بعض ائمہؒ کی تحقیق میں اب بھی واجب ہے مگر فرض نہیں۔

اس بحث کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے مبارک پوری صاحبؒ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ کس بے باکی سے یہ لکھتے ہیں کہ اندرونی اور بیرونی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فاقرؤا ما تیسّر... الآیۃ مدنی ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۳۶) فوا اسفا آپ دلائل واضحہ کے ساتھ یہ معلوم کر چکے ہیں کہ اندرونی اور بیرونی عقلی اور نقلی شہادتوں سے فاقرؤا ما تیسّر.... الآیۃ کا مکی ہونا ثابت ہو چکا ہے۔

پانچواں اعتراض

مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ فاقرؤا ما تیسّر... الآیۃ سے واذا قرئ القرآن.. الآیۃ منسوخ نہیں۔ لیکن اس میں نسخ کا احتمال تو موجود ہے۔ جب اس میں یہ احتمال موجود ہے تو اس سے استدلال کیسے؟ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۳۶)

جواب: یہ اعتراض بھی مردود ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ نسخ کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ وہ محض بے بنیاد احتمالات سے ثابت نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے اثبات کے لیے قطعی، محکم اور اٹل دلائل کی ضرورت ہے اور صرف ظن اور تخمین سے قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہو سکتی۔

وثانیاً۔ یہ احتمال صرف مبارکپوری صاحبؒ کے خیالِ مبارک میں ہی آیا ہے یا امام احمدؒ بن حنبلؒ، حافظ ابن عبد البرؒ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ وغیرہ بلکہ جمہور سلف و خلفؒ کو بھی یہ نکتہ ہاتھ آیا ہے؟ اگر یہ احتمال کسی دلیل و برہان پر مبنی ہوتا تو جمہور اہل اسلام کا اس آیت سے استدلال کیسے صحیح ہوتا؟ اور باوجود ان حضرات کے علم کی گہرائی کے اس احتمال کی طرف ان کا ذہن کیوں نہ گیا؟

وثالثاً۔ خود مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ آیت فاقرؤا ما تیسّر سے قرأت کی فرضیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ا ص ۲۰۷) تو اس آیت سے ہر ہر مقتدی کی قرأت کے وجوب پر استدلال کیونکر درست ہوا؟ اور آیت واذا قرئ القرآن... الآیۃ اس سے منسوخ کیسے ٹھہری؟ کیونکہ اس میں استماع اور انصات کا حکم سب مقتدیوں پر بہرحال واجب اور

لازم ہے اور فاقرؤا سے فرضیت ہی ثابت نہیں ہے۔

ورابعًا۔ مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ سورۂ مزمل پہلے نازل ہوئی ہے۔ (جس میں فاقرؤا ما تیسّر کی آیت ہے) اور سورۂ اعراف بعد کو نازل ہوئی ہے (جس میں واذا قریٔ القرآن ... الآیۃ ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۹) اور پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ مزمل کا آخری حصہ بھی مکی ہے اور اوّل و آخر میں صرف ایک سال کا وقفہ ہے۔ پھر محض خیال سے متاخر سورۃ کو متقدم سے منسوخ کرنے کا کیا مطلب ؟

وخامسًا۔ نواب صاحبؒ سورہ اعراف کے متعلق لکھتے ہیں کہ دروے یک آیت یا دو آیت منسوخ است باقی ہمہ محکم۔ اوّل۔ خذ العفو وأمر بالعرف۔ دوم۔ واعرض عن الجٰھلین (افادۃ الشیوخ ص ۶۵) تو محکم آیات کے منسوخ ہونے کا کیا معنٰی ؟

چھٹا اعتراض: مولانا میر صاحب سیالکوٹی رح لکھتے ہیں کہ ان دونوں آیتوں میں احناف کے نزدیک تعارض ہے۔ جیسا کہ ملّا جیونؒ اور صاحب تلویحؒ نے لکھا ہے۔ لہٰذا اس تعارض کے ہوتے ہوئے استدلال صحیح نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر واضح البیان ص ۲۳۸) مبارک پوری صاحبؒ نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۳۸، ابکار المنن ص ۱۴۸ و تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۸)

جواب :

بلاشک ملّا جیون حنفی تھے لیکن مدار صرف دلائل پر ہے۔ شخصیتوں پر نہیں ہے اور تلویح کے مصنف علامہ سعدالدین تفتازانیؒ (المتوفی ۷۹۱ھ) حسب تصریح علامہ حسن چلپیؒ (المتوفی ۸۸۶ھ) وعلامہ سیوطی رح (المتوفی ۹۱۱ھ) وعلامہ محمود الکفوی رح (المتوفی ۹۹۰ھ) وعلامہ کاتب چلپی رح (المتوفی ۱۰۶۷ھ صاحب کشف الظنون) شافعی المسلک تھے۔ احناف میں ان کا شمار غلط ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تعارض کے لیے شرائط کیا ہیں ؟

حافظ ابن حجر رح (شرح نخبۃ الفکر ص ۴۷ میں) بیان کرتے ہیں کہ تعارض کی شرطیں یہ ہیں:

۱۔ دونوں حکموں کا محل ایک ہو۔

۲۔ تقدم اور تاخر معلوم نہ ہو سکے۔

۳- ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دی جا سکے۔

۴- دونوں میں تطبیق نہ ہو سکے۔ مگر ان دونوں آیتوں میں تعارض کی ایک شرط بھی موجود نہیں ہے۔

دونوں کا محل جُدا جُدا ہے: ہم عرض کر چکے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ وغیرہ تصریح کرتے ہیں کہ آیت واذا قرئ القرآن کا شانِ نزول فرضی نماز ہے اور آیت فاقرؤا ما تیسّر کا محل نماز تہجد ہے جیسا کہ ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۹۲ اور عون المعبود جلد ۱ ص ۵۰۳ وغیرہ میں اس کی تصریح ہے اور امام بیہقی رح لکھتے ہیں: وھذا معروف مشھور فیما بین اھل العلم۔ (کتاب القرأۃ ص ۱۵۳) اور یہ امر اہل علم میں مشہور و معروف ہے اور حافظ ابن قیّم رح لکھتے ہیں کہ یہ آیت صلاۃ تہجد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (اعلام الموقعین جلد ۲ ص ۳۷۸) خطیب شربینیؒ جو بڑے پایہ کے مفسّر تھے لکھتے ہیں کہ اس آیت کا شان نزول تہجد کی نماز ہے۔ (السراج المنیر جلد ۴ ص ۲۴۸) علاّمہ ابوالسعودؒ لکھتے ہیں کہ یہ صلاۃ تہجد کے بارے میں ہے۔ (تفسیر ابوالسّعود بر کبیر جلد ۸ ص ۴۸۵) مبارک پوری صاحبؒ بھی صاحبِ رُوح المعانی سے یہ مضمون نقل کرتے ہیں (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۰۷)۔ قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ نزلت فی قیام اللیل فلیست مما نحن فیہ (نیل جلد ۲ ص ۲۱۸) یعنی یہ آیت نماز تہجد کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور ہمارے اس مسئلہ سے (کہ سورۃ فاتحہ رکن ہے یا جہاں سے بھی پڑھ لیا جائے صحیح ہے) اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود مولانا میر صاحبؒ لکھتے ہیں کہ سُورہ مزمّل کا یہ رکوع نماز تہجد میں تخفیف کے لیے اترا ہے۔ (تفسیر واضح البیان ص ۴۴۳) جب ایک آیت کا محل فرضی نماز ہے اور دوسری کا تہجد کی نماز ہے تو پھر تعارض کیسے؟ کیونکہ تعارض کے لیے وحدت محل شرط ہے جو یہاں مفقود ہے۔

دونوں کا تقدّم اور تأخّر: پہلے پوری تحقیق گذر چکی ہے کہ ان کے تقدم اور تاخّر کا علم ہے اور تو اور خود مبارک پوری صاحبؒ کو بھی اقرار ہے کہ سُورۃ مزمّل پہلے اور سُورۃ اعراف بعد کو نازل ہوئی ہے۔ سو تعارض کی یہ شرط بھی نہ پائی گئی۔

وجہ ترجیح :

اگر بالفرض دونوں کا محل بھی ایک ہوتا اور تقدّم و تاخّر بھی معلوم نہ ہوتا تب بھی واذاقرئ القراٰن ... الاٰیۃ کے حکم کو ترجیح ہوتی۔ کیونکہ صحیح روایات اور آثار اور جمہور سلف و خلفؒ کی اکثریت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت میں مقتدی کو قرآت خلف الامام سے منع کیا گیا ہے ترجیح کے لیے یہ دلیل کیا کم وزنی ہے ؟

جمع وتطبیق : علاوہ بریں ان دونوں آیتوں میں جمع وتطبیق بھی چنداں دشوار اور مشکل نہیں ہے کیونکہ واذاقرئ ... الاٰیۃ مقتدی کے حق میں ہے جو با جماعت فرض نماز پڑھتا ہو اور فاقرؤا ما تیسّر تہجّد کی نماز کے بارے میں ہے جو انفرادی طور پر پڑھی جاتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلی آیت صرف سورۃ فاتحہ کو شامل ہو کیونکہ قرآن العظیم کا اطلاق اسی پر ہوا ہے اور فاقرؤا ما تیسّر سے ما زاد علی الفاتحہ مراد ہو۔ چنانچہ امام بیہقیؒ لکھتے ہیں : کہ حضرت ابن عباس رضؓ سے بسند صحیح یہ روایت مروی ہے کہ فاقرؤا ما تیسّر سے ما زاد علی الفاتحہ مراد ہے۔ (کتاب القرأۃ ص ۶، ص ۱۵۳، ۱۵۴) اور امام دارقطنیؒ حضرت ابن عباسؓ سے باسناد حسن اسی مضمون کی روایت نقل کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ اس میں ان لوگوں کے لیے حجت ہے جو یہ کہتے ہیں کہ فاقرؤا ما تیسّر ما زاد علے الفاتحہ پر محمول ہے۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۹) اور میر صاحبؒ لکھتے ہیں کہ الغرض آیت فاقرؤا ما تیسّر میں اگر قرآت سے مراد قرآت القرآن فی الصلوٰۃ مراد لی جائے تو اس سے مراد فاتحہ کے بعد کی قرآت ہے۔ (واضح البیان ص ۴۴۵)

اور چونکہ فریق ثانی کے نزدیک بھی ما زاد علی الفاتحہ کی قرآۃ مقتدی کے لیے ممنوع ہے۔ لہٰذا اس سے مراد صرف منفرد ہو گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ فاقرؤا ما تیسّر کا حکم امام کے لیے ہو۔ اور واذا قرئ القراٰن صرف مقتدی کے لیے۔ اندریں حالات جب جمع وتطبیق کی صحیح صورتیں بھی سامنے موجود ہیں تو تعارض کا دعوٰے بالکل باطل ہو گیا۔

ساتواں اعتراض :

مولانا مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ آیت واذا قرئ القراٰن ..... الاٰیۃ پہلا

جواب خود حنفی دیوبندیؒ کے قلم سے کہ جو شخص اس آیت سے خلف الامام کے منسوخ ہونے پر استدلال کرتا ہے اسے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ یہ آیت افتراض صلوٰتِ خمسہ کے بعد نازل ہوتی ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۵)

جواب

کیا قرأت خلف الامام کی ممانعت اور افتراض صلوٰت خمسہ میں کوئی علت اور معلول کا تلازم یا عرفی اور عادی تعلق ہے؟ کیا قرآنِ کریم کی تعظیم کے پیش نظر قرأت خلف الامام کی ممانعت صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ پانچ نمازیں ہی فرض ہوں۔ پانچ سے کم نمازوں میں یہ ممکن نہیں ہے؟ پہلے عرض ہو چکا ہے کہ دار و مدار دلائل پر ہوتا ہے نہ کہ شخصیتوں پر۔ شخصیتیں قابل صد احترام ہیں مگر صحت و سقم کا مبنیٰ دلائل ہیں۔

آٹھواں اعتراض

مُبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ آیت واذا قرئ القراٰن مکّی ہے اور امام کے پیچھے قرأت کرنے کا حکم مدینہ طیبہ میں ہوا ہے۔ لہٰذا متقدم حکم سے متاخر حکم کے خلاف استدلال درست نہیں ہو سکتا۔ اور مدینہ میں قرأت خلف الامام کے جواز پر یہ دلیلیں موجود ہیں:

۱۔ حضرت ابو ہریرہ رضؓ کا قول ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز نہیں ہوتی (موطا امام مالک ص ۲۹)

۲۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام رضؓ کو نماز پڑھائی اور جب فارغ ہوئے تو فرمایا۔ میرے پیچھے کس نے قرأت کی ہے؟ اس حدیث کے آخر میں فرمایا: امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے بغیر اور کچھ بھی نہ پڑھا کرو۔ (کتاب القرأت ص ۵۱)

اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اس پر اتفاق و اجماع ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضؓ ۷ھ میں مسلمان ہوئے تھے۔ (تلخیص الحبیر ص ۱۱۴)

---

[1] یہ مضمون انھوں نے اپنی مشہور کتاب الفرقان ص ۸۹ میں لکھا ہے اور اس کے مولف مولانا ناظر حسن صاحبؒ دیوبندی تلمیذ مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہما ہیں۔

۲- حضرت عبادہ رضؓ بن الصامت مدنیؒ ہیں اور انھوں نے قرأت خلف الامام کا ذکر کیا ہے۔
(تحقیق الکلام جلد ۲ صٓ ۲۸)

میر صاحب سیالکوٹی رح لکھتے ہیں کہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ احادیث مثبتہ قراۃ خلف الامام آیت و اذا قرئ القرآن کے بعد فرمائی گئی تھیں۔ کیونکہ عبادہ رضؓ مدنی ہیں اور حضرت ابوہریرہ رضؓ سنہ ۷ھ میں مسلمان ہوئے تھے۔ (تفسیر واضح البیان صٓ ۲۳۵)

جواب - یہ اعتراض بھی محض بے کار ہے: اولاً۔ اس لیے کہ قرآن کریم کی کسی آیت اور حکم منسوخ ٹھہرانے کے لیے کسی محکم قطعی اور اٹل حکم کی ضرورت ہے۔ حضرت عبادہ رضؓ اور

لہ مبارک پوری صاحبؒ نے بزعم خود بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے اور لکھتے ہیں: اولاً۔ کہ اگرچہ حضرت عبادہؓ بن الصامت بیعت عقبہ اولی (جو سنہ ۱۲ نبوت میں ہوئی تھی) اور بیعت عقبہ ثانیہ میں (جو سنہ ۱۳ نبوت میں ہوئی تھی) حاضر ہوئے تھے۔ لیکن ان کی حاضری سے (یعنی آنحضرت صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام لانے کیلئے حاضر ہونے سے) سورۂ اعراف پہلے نازل ہو چکی تھی کیونکہ مجمع البحار جلد ۲ ص ۵۲۰ میں لکھا ہے کہ سنہ نبوت میں پہلے سورۂ جن نازل ہوئی اور پھر سورۂ اعراف الخ

وثانیاً۔ یہ کہ عقبہ اولی سے قبل نماز باجماعت مشروع ہی نہ تھی۔ اس لیے بہرحال حضرت عبادہؓ کی حدیث کا یہ حکم آیت کے بعد ہی ہوگا۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۸ محصلہ) مگر یہ تمام مقدمات مخدوش ہیں۔ اولاً۔ اس لیے حضرت عبادہ رضؓ کی خلف الامام کی قید کے ساتھ کوئی مرفوع روایت صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا وہ مکی ہوں یا مدنی فرق کیا ہوگا؟

وثانیاً۔ حافظ ابن کثیر رح لکھتے ہیں کہ بیعت عقبہ اُولیٰ رجب سنہ ۱۲ نبوت میں اور بیعت عقبہ ثانیہ سنہ ۱۳ نبوت میں ہوئی تھی۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۱۵۹)

وثالثاً۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ جماعت کے ساتھ نماز ابتدائے نبوت سے مشروع تھی۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۱۸۳) حافظ ابن حجر رح لکھتے ہیں کہ نماز باجماعت ابتدائے اسلام سے مشروع تھا۔ (فتح الباری جلد ۲ ص ۹۰) مسلم جلد ۲ ص ۲۹۶ اور مستدرک جلد ۳ ص ۵۹۲ میں روایت ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ مسلمان ہو کر جب اپنی قوم کے پاس گئے تو حضرت ایماءؓ بن رحضہ ان کو جماعت سے نماز پڑھایا کرتے تھے۔ حالانکہ حضرت ابوذر غفاری رضؓ سے قبل مردوں میں حضرت ابوبکر رضؓ اور حضرت بلال رضؓ (باقی اگلے صفحہ پر)

حضرت ابوہریرہ رضؓ کی اخبار احاد سے قرآن کریم کی آیت کیسے منسوخ ہو سکتی ہے۔

وثانیاً۔ حضرت عبادہ رضؓ کی خلف الامام کی قید کے ساتھ کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ اپنے مقام پر بیان ہو گا۔ پھر ایسی بے حقیقت، ضعیف کمزور اور معلول روایتوں نص قطعی کیونکر منسوخ ہو گئی؟ اور حضرت ابوہریرہ رضؓ سے موطا امام مالک ص ۲۹ میں کوئی روایت ایسی نہیں جس کا مفہوم یہ ہو کہ اگر مقتدی فاتحہ نہ پڑھے تو اس کی نماز باطل ہے رہی اُن کی مرفوع روایت خداج والی تو وہ موجود ہے اور ان کا قول اقرأ بہا فی نفسک یا فارسی بھی موجود ہے مگر اس کا مطلب بطلان صلوٰۃ نہیں ہے جس کی بحث جلد ثانی میں آ رہی ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔

وثالثاً۔ حافظ ابن حجر رحؒ لکھتے ہیں کہ کسی متاخر الاسلام صحابی کی روایت سے متقدم الاسلام صحابی کی روایت کو بلا دلیل محض تقدم و تاخر کی وجہ سے منسوخ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ (شرح نخبۃ الفکر ص ۴۷) نہ معلوم متاخر الاسلام صحابی کی روایت سے نص قرآنی کیسے منسوخ ٹھہرائی جا سکتی ہے؟

ورابعاً۔ کیا صرف حضرت عبادہ رضؓ اور حضرت ابوہریرۃ رضؓ ہی مدنی تھے یا حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضؓ، حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ، حضرت ابوالدرداء رضؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت عبداللہؓ بن بحینہ رضؓ اور حضرت ابوبکرہ رضؓ وغیرہ بلکہ خود حضرت ابوہریرہؓ بھی جن سے قرأت خلف الامام کی ممانعت کی روایتیں مروی ہیں مدنی تھے؟

(بقیہ پچھلا صفحہ) اور بیبیوں میں صرف حضرت خدیجہ رضؓ مسلمان ہوئی تھیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱ و اکمال ص ۵۹۴) مگر اس ابتدائی دور میں بھی جماعت ہوتی تھی۔

لہ نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ناسخ مثل منسوخ باشد در قوت بلکہ اقوی ازاں چہ در صورت ضعف مزیل قوی نہ تواند شد و ایں حکم عقل است و اجماع برآں دلالت کردہ چہ صحابہ رضؓ نص قرآن را بخبر واحد منسوخ نہ کردہ اند۔ (افادۃ الشیوخ بمقدار الناسخ والمنسوخ ص ۵)

حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ علماء حنفیہ کا ضابطہ یہ بیان کرتے ہیں۔ ان تخصیص العام القطعی بخبر الاحاد غیر جائز..... الخ (غیث الغمام ص ۲۲۵) کہ عام قطعی کی تخصیص خبر واحد سے جائز نہیں ہے۔

وخامسًا۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ کے موقوف اور غیر صریح قول سے نص قرآنی کس طرح منسوخ ہوسکتی ہے۔ جبکہ قاعدہ یہ ہے کہ مرفوع حدیث کے مقابلے میں امت میں سے کسی کا قول قابل قبول نہیں ہوسکتا چنانچہ امام شافعی رحؒ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقابلے میں ماو شما کے قول کی کیا وقعت ہے؟ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۲۵۳)

امام ابن خزیمہؒ کا بیان ہے کہ حدیث کے مقابلہ میں کسی کی بات حجت نہیں ہوسکتی۔ یحییٰ بن آدمؒ فرماتے تھے کہ مرفوع حدیث صحیح کے مقابلہ میں کسی کا قول معتبر نہیں ہے۔ (معرفت علوم الحدیث ص۸۴)

امام بخاری رحؒ لکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے جب حدیث ثابت ہو جائے تو پھر کسی امتی کا قول قابل اعتماد نہیں ہے (جزء القراۃ ص۱۱) امام بیہقی رحؒ لکھتے ہیں کہ حضورؐ کی حدیث کے مقابلہ میں کسی امتی کا قول قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص۱۷۳) محدث ابن حزمؒ لکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول کی موجودگی میں کسی کی بات قابل قبول نہیں ہے (محلی جلد ۱۰ ص ۱۷۰) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ جب آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کوئی بات ثابت ہو جائے تو پھر کسی کی بات حجت نہیں ہے۔ (رفع الملام عن ائمۃ الاعلام ص ۶۴) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں: زیرا کہ حجت در روایت صحابی است نہ در رائے وفعل وے (بدور الاہلہ ص۵۸) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ علامہ شوکانی رحؒ در مؤلفات خود ہزار بار می نویسد کہ در موقوفاتِ صحابہ حجت نیست (دلیل الطالب ص۱۱۶)

عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو فریق ثانی کے نزدیک موقوفات صحابہؓ حجت نہیں ہیں اور دوسری طرف ان سے واذا قرئ القرآن کی آیتِ قرآنی منسوخ قرار دی جاتی ہے۔ فوا اسفاہ: "میں وہ جواں ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں"

وسادسًا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جو روایت امام بیہقیؒ کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے وہ کمزور اور ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی داہر بن نوح ہے۔ امام دارقطنی رحؒ کہتے ہیں کہ وہ قوی نہیں۔ ابن حبان رحؒ کہتے ہیں۔ اس کی روایتوں میں خطا ہوتی ہے۔ ابن قطانؒ کہتے ہیں کہ وہ مجہول ہے۔ (لسان المیزان جلد ۲ ص۴۱۳)

دوسرا راوی اس سند میں ربیع بن بدر ہے۔ امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن قتیبہؒ اسکو ضعیف

کہتے تھے (ضعفاء صغیر صہ ۱۲) امام نسائی رح اس کو متروک کہتے ہیں۔ (ضعفاء صغیر نسائی صہ ۴۲) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ متروک تھا۔ (تقریب صہ ۱۲۱) امام ابن معین رح، ابوداؤد رح اور ابن عدیؒ وغیرہ اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۳۳۳) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ (کتاب القرآۃ ص ۱۳۸) یعقوبؒ بن سفیانؒ اور ابن خراشؒ اسے متروک کہتے ہیں۔ جوزقانی رح اس کو واہی الحدیث اور ابوحاتمؒ اس کو ذاہب الحدیث اور ضعیف الحدیث کہتے ہیں۔ عجلیؒ، محمدؒ بن عثمانؒ اور عثمانؒ ابن ابی شیبہ رح سب اس کی تضعیف کرتے ہیں۔ امام حاکم رح کا بیان ہے کہ ضعیف اور کمزور لوگوں سے موضوع اور جعلی روایتیں بیان کرتا تھا۔ ابن حبانؒ، دارقطنی رح اور ازدیؒ سب اسے متروک کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۲۳۹)

حضرات! آپ مبارک پوری صاحبؒ کی کرامت ملاحظہ کیجئے کہ اس روایت سے وہ واذا قرئ القرآن.... الآیۃ کو منسوخ قرار دینے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ تعجب اور حیرت ہے ایسے علم پر۔

وسابعًا۔ کیا جمہور کی طرف سے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے حضرت عبادہ رضؓ وغیرہ نے بیعت عقبہ اولیٰ یا ثانیہ کے موقع پر قرأت خلف الامام کا حکم سنا ہو اور حضرت ابوہریرہ رضؓ کی صحیح اور مرفوع حدیث واذا قرأ فانصتوا اور مالی انازع القرآن الحدیث سے وہ حکم منسوخ ہو گیا ہو۔ کیونکہ حضرت ابوہریرہؓ متاخر الاسلام ہیں اور ۷ھ کو مسلمان ہوتے تھے۔ حدیث، حدیث کے مقابل میں آگئی اور نص قرآنی محفوظ رہ گئی۔

وثامنًا۔ اگر محض احتمال کا نام ہی استدلال ہے تو کیوں نہیں ہو سکتا کہ حضرت عبادہؓ نے بیعت عقبہ اولیٰ یا ثانیہ میں یہ حکم سنا ہو اور آیت واذا قرئ القرآن مدینہ میں نازل ہوئی ہو۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر رح تفسیر جلد ۲ ص ۲۵۴ میں اور نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ اپنی تفسیر فتح البیان جلد ۳ ص ۳۹۳ میں لکھتے ہیں کہ سورہ اعراف مدنی ہے۔ کیونکہ اس سورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی اُمت یہود کا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ یہود کا مرکز مدینہ طیبہ تھا نہ کہ مکہ مکرمہ، لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ ساری سورت ہی مدنی ہے ——— ع

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہو ویسی سنو

نواں اعتراض

امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ آیت واذا قرئ القرآن کا شان نزول یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ اقتدا کی حالت میں بلند آواز سے نماز میں تکلم کیا کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے:

۱۔ محمد بن دینار کہتے ہیں۔ ہم سے ابراہیم ہجری نے بیان کیا۔ وہ ابو عیاض سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ حضرات صحابہ کرام رضؓ نماز میں تکلم کیا کرتے تھے حتیٰ کہ واذا قرئ القرآن .... الآیۃ نازل ہوئی۔

۲۔ مؤمل بن اسمٰعیل حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے یہی مضمون نقل کرتے ہیں۔

۳۔ عبداللہ بن عامر حضرت ابو ہریرہ رضؓ کی روایت بیان کرتے ہیں کہ صحابہؓ بلند آواز سے نماز میں گفتگو اور تکلم کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

۴۔ عاصم بن عمر، حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضؓ نماز میں تکلم کیا کرتے تھے، جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے ممانعت قرأت سے نہیں بلکہ تکلم اور رفع اصوات سے ہے اور تکلم فی الصلوٰۃ و رفع اصوات اور چیز ہے اور قرأت فی الصلوٰۃ الگ امر ہے۔ (کتاب القرأۃ ص۱۰۷)

جواب۔ امام موصوفؒ کا یہ بیان باطل ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ صحیح اسانید سے پہلے یہ امر ثابت کیا جاچکا ہے کہ اس آیت کا شان نزول قرأت خلف الامام کا منفی پہلو ہے۔ عام تکلم اور رفع اصوات اس کا شان نزول نہیں ہے۔

وثانیاً۔ امام موصوف رحؒ نے جتنی روایتوں سے احتجاج کیا ہے۔ وہ سب ضعیف کمزور اور معلول ہیں۔ پہلی روایت میں ایک راوی محمد بن دینار ہے۔ امام ابن معینؒ، دارقطنیؒ اور نسائی رحؒ کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ عقیلی رحؒ کا بیان ہے کہ اس کی حدیث میں وہم ہوتا ہے۔ ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ ان کا حافظہ آخر میں متغیر ہوچکا تھا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۱۵۵)

دوسرا راوی اس کڑی کا ابراہیم ہجری ہے۔ امام ابن معینؒ، نسائیؒ، ابو زرعہؒ، ترمذیؒ، احمدؒ، ابن سعدؒ، حربیؒ اور ابو حاتمؒ سب اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ اور ابو حاتمؒ اس کو منکر

الحدیث کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ وہ قابل احتجاج نہیں۔ علیؒ بن الحسینؒ بن الجنیدؒ کہتے ہیں کہ وہ متروک ہے۔ (میزان جلد ۱ ص ۱۳۱، تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۶۵)

دوسری روایت میں مومل بن اسمٰعیل ہے۔ امام بخاریؒ[1] فرماتے ہیں کہ وہ منکر الحدیث ہے۔ ابو حاتم رح اس کو کثیر الخطاء کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ کا بیان ہے کہ ان کی روایات میں کثرت سے خطا ہوتی ہے۔ یعقوبؒ بن سفیانؒ فرماتے ہیں کہ اہلِ علم کو ان کی روایات سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ وہ منکر روایتیں بیان کرتے ہیں۔ ساجیؒ اس کو کثیر الخطاء کہتے ہیں۔ دار قطنیؒ اور ابن سعدؒ اس کو کثیر الخطاء اور کثیر الغلط کہتے ہیں۔ ابن قانعؒ اس کو یخطیٔ سے تعبیر کرتے ہیں۔ محمدؒ بن نصرؒ مروزی اس کو سیئ الحفظ اور کثیر الخطاء کہتے ہیں۔ امام ابو زرعہؒ کہتے ہیں کہ وہ کثیر الخطاء ہے۔ (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۲۱، تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۳۸۰)

تیسری سند میں عبداللہ بن عامر ہے۔ امام احمدؒ، ابو زرعہ، ابو حاتم، نسائیؒ، ابو داؤدؒ، دار قطنیؒ محدث سعدیؒ سب اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ امام ابن معینؒ ان کو لیس بشیئ اور ابو احمد الحاکم رح لیس بالقوی کہتے ہیں۔ ابن مدینیؒ اس کی ڈبل تضعیف کرتے ہیں (ضعیف ضعیف) ابو حاتمؒ اس کو متروک کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ محدثین ان کے حافظہ کی شکایت کرتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۵۱ و لسان جلد ۳ ص ۳۰۳، تہذیب جلد ۵ ص ۲۷۵)

چوتھی روایت میں عاصم بن عمر ہے۔ امام احمدؒ، ابن معینؒ اور جوزقانی اس کو ضعیف کہتے ہیں۔

---

[1] علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ جس راوی سے متعلق امام بخاریؒ منکر الحدیث کہتے ہیں۔ اس سے حدیث روایت کرنا جائز نہیں۔ (میزان جلد ۱ ص ۵) اور اسی طرح طبقات سبکیؒ جلد ۲ ص ۹ اور تدریب الراوی ص ۲۳۵ میں ہے کہ امام بخاریؒ جس کو منکر الحدیث فرمائیں: لا تحل الروایۃ عنہ۔ ایسے راوی سے روایت بیان کرنا جائز اور حلال نہیں ہے۔

لطیفہ: فریق ثانی صحیح ابن خزیمہؒ کے حوالہ سے فوق الصدر کی جو روایت پیش کیا کرتا ہے اس کی سند میں بھی یہی مومل بن اسمٰعیل واقع ہے (دیکھئے اعلام الموقعین جلد ۲ ص ۹ اور بدائع الفوائد جلد ۳ ص ۹۱) کیا بعید ہے کہ اصل روایت تحت السرہ ہو اور مومل بن اسماعیل کی کثرت خطاء کا نشانہ بن کر روایت فوق الصدر ہوگئی ہو۔

نہ تم صدمے ہمیں دیتے نہ ہم فریادیوں کرتے،
نہ کھلتے راز سربستہ نہ یہ رسوائیاں ہوتیں

امام بخاریؒ اس کو منکر الحدیث اور ترمذیؒ متروک کہتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۴، تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۸۱) یہ ہیں وہ روایات اور آثار جن پر امام بیہقی رحؒ اپنے استدلال کی بنیاد رکھتے ہیں۔ فالی اللہ المشتکی۔

وثالثاً۔ امام بیہقی رحؒ کی یہ غلطی ہے کہ وہ تکلم فی الصلوٰۃ سے صرف عام انسانی تکلم اور گفتگو مراد لیتے ہیں۔ حالانکہ تکلم کا مفہوم عام ہے جس میں قرأتِ قرآن، تسبیح، تہلیل، تحمید، تکبیر، نماز، خطبہ اور جملہ ادعیہ آجاتی ہیں۔ لہٰذا نہی عن التکلم فی الصلوٰۃ میں سورہ فاتحہ کی نہی بھی آجائے گی۔ کیونکہ عام کی نفی سے خاص کی نفی عین عقلی اور منطقی قاعدہ ہے۔ تکلم کا مادہ کلام اور کلمہ ہے۔ اور قرآن کریم میں متعدد مقامات اور مختلف مواضع میں کلام اللہ، کلماتُ ربّی اور کلمات ربك وغیرہ کا قرآن کریم اور اس کی آیتوں پر اطلاق ہوا ہے۔ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جمعہ کے وقت امام کے منبر پر تشریف لانے سے قبل جتنی نماز کوئی پڑھنا چاہے پڑھ لے۔ ثم ینصت اذا تکلم الامام (بخاری جلد ۱ ص ۱۲۱) پھر جب امام آجائے اور تکلم کرے تو اس وقت وہ نمازی خاموش ہو جاتے۔ اس حدیث میں جمعہ کے خطبہ پر تکلم الامام کا اطلاق ہوا ہے خطبہ کیا ہے؟ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وانما الخطبة هی قرأة القرآن (الحدیث مسند طیالسی ص ۲۵) خطبہ تو قرآن کریم کی تلاوت اور اس کی قرأت ہے۔ حضرت ام ہشام رضؓ فرماتی ہیں کہ میں نے سورۃ ق والقرآن المجید جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سُن کر یاد کی ہے۔ آپ اسے ہر جمعہ کے خطبہ میں پڑھا کرتے تھے۔ (مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۱۲۳ و مسلم جلد ۱ ص ۲۸۶) آخری تشہد میں درود شریف کے بعد کوئی متعین دعا شریعت نے نہیں بتائی۔ لیکن ادعیہ ماثورہ میں ربّنا اٰمنّا..... الآیۃ ربِّ اجعلنی مقیم الصلوٰۃ.... الآیۃ۔ ربّنا لا تزغ قلوبنا.... الآیہ ربّنا ظلمنا انفسنا...... الآیہ وغیرہ وغیرہ بھی ادعیہ ثابت ہیں اور آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ آخری تشہد سے فارغ ہونے کے بعد ثم لیتخیر بعد من الکلام ما شاء (بخاری ۲ ص ۹۲۱) جو کلام بھی دل چاہے نمازی انتخاب کر لے۔ ایک شخص نے رکوع کی حالت میں الحمد للہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ پڑھا تھا اور آپ نے فرمایا: من المتکلم (بخاری جلد ۱ ص ۱۱۰ و مسند احمد جلد ۳ ص ۱۰۴) متکلم کون تھا؟ ایک شخص نے یہ دعا کی تھی: اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ وَمُحَمَّدًا وَلَا تَرْحَمْ

مَعنا اَحدًا۔ امام نسائیؒ اس پر ایک باب قائم کرتے ہیں۔ باب الکلام فی الصلوٰۃ (جلد ۱ ص ۱۱۰) امام بخاری رحمہ ایک باب باین عنوان قائم کرتے ہیں:

اذا قال واللہ لا اتکلم الیوم فصلی او قرأ او سبح او کبر او حمد او ھلل فھو علی نیتہ۔ (بخاری ۲ ص ۹۸۸)

اگر کسی شخص نے قسم اٹھائی کہ میں کلام نہیں کروں گا تو اگر اس نے نماز پڑھی یا قرآن کی تلاوت کی یا سبحان اللہ یا اللہ اکبر یا الحمد للہ یا لا الہ الا اللہ پڑھا تو یہ اس کی نیت پر موقوف ہے۔

یعنی اگر وہ تکلم سے قرأت قرآن وغیرہ مراد لے اور اس کی نیت کرے تو تکلم کا اطلاق اس پر صحیح ہے اور وہ حانث ہو جائے گا۔ قاضی شوکانی رحمہ لکھتے ہیں:

فلا یجوز من الکلام الا ما خصّہ دلیل کصلوٰۃ التحیّۃ۔ نیل الاوطار جلد ۳ ص ۱۵۲)

جب امام خطبہ پڑھ رہا ہو تو اس وقت کلام صحیح نہیں ہے۔ مگر جس کو شرعی دلیل نے خاص کر دیا ہو جیسے صلوٰۃ تحیہ۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ قاضی صاحب موصوفؒ صلوٰۃ تحیہ پر کلام کا اطلاق صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ جب یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ نہی عن التکلم قرأتِ قرآن وغیرہ پر مشتمل ہے تو امام بیہقی رحمہ کا یہ استدلال کہ نہی تو تکلم سے ہے۔ تلاوت اور قرأت قرآن سے نہیں بالکل بے بنیاد ہے اور جیسے جہر کے ساتھ پڑھنے سے منازعت اور مخالجت ہوتی ہے۔ اسی طرح آہستہ پڑھنے سے بھی ہوتی ہے۔ جس کی تحقیق آگے آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

ورابعًا۔ امام بیہقی رحمہ نہی عن التکلم فی الصلوٰۃ ان ضعیف اور کمزور روایتوں سے ثابت کرتے ہیں۔ حالانکہ صحیح روایت سے ثابت ہے کہ عام تکلم فی الصلوٰۃ[1] کی ممانعت

---

[1] محدثینؒ و مؤرخینؒ کا اس بات میں شدید اختلاف ہے کہ نہی عن التکلم فی الصلوٰۃ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی یا مدینہ طیبہ میں؟ حافظ ابن قیمؒ (زاد المعاد جلد ۲ ص ۶۱ میں) حافظ ابن کثیر رحمہ (البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۹۲ میں) اور قاضی ابو الطیب الطبریؒ (المتوفی ۴۵۰ھ) دیکھیے بذل المجہود جلد ۲ ص ۹۵) اس کے مدعی ہیں۔ کہ یہ ممانعت مکہ مکرمہ میں نازل ہو چکی تھی۔ اور دلیل باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے۔

آیت قومُوا للہِ قانتین سے ہوئی ہے جیسا کہ بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۶۰ و مسلم جلد ۱ ص ۲۰۴ میں حضرت زید بن ارقمؓ سے مروی ہے اور اس کی پوری تحقیق پہلے گزر چکی ہے کہ آیت واذا قرئ القرآن کا شانِ نزول ہی خاص قرأت خلف الامام کا مسئلہ ہے۔

دسواں اعتراض

حضرت امام بخاری رح فرماتے ہیں کہ آیت فاذا قرئ القرآن ... الآیۃ میں استماع اور انصات کا حکم ہے اور استماع کا تحقق صرف ان نمازوں میں ہو سکتا ہے جن میں قرأت سنی جا سکتی ہو اور سرّی نمازوں میں چونکہ قرأت سُنی نہیں جا سکتی۔ اس لیے ان میں مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنی جائز ہوگی۔ لہٰذا آیت اپنے عموم پر باقی نہ رہی اور منکرینِ قرأت خلف الامام کا علی الاطلاق استدلال اس آیت سے صحیح نہ ہوا (او کما قال جزء القرأۃ ص ۹ اور یہی سوال امام بیہقی رح نے کتاب القرأۃ ص ۶۷ میں اور نواب صاحبؒ نے دلیل الطالب ص ۲۸۰ میں اور مبارک پوری صاحبؒ نے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۵۱ اور ابکار المنن ص ۱۴۸ میں کیا ہے)

جواب۔ ان اکابر کے سوال یا استدلال کے مرکزی نقطے اصولی طور پر صرف دو ہیں۔ ان کا تجزیہ یوں کیا جا سکتا ہے:

۱۔ استماع کا معنی سننا ہے۔

۲۔ سرّی نمازوں میں آہستہ آہستہ امام کے پیچھے قرأت کرنا استماع اور انصات کے منافی نہیں ہے علی الترتیب دونوں شقوں کا جواب ملاحظہ کریں:

استماع کا معنی۔ استماع کا معنی سننا نہیں بلکہ کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے، قرأۃ سُنی جا سکتی ہو یا نہ۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) میں حضرت ابن مسعودؓ کی وہ صحیح روایت پیش کرتے ہیں جو صحاح ستّہ میں موجود ہے کہ حبشہ سے لوٹنے کے بعد انھوں نے بحالتِ نماز آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سلام کہا۔ مگر جواب نہ ملا۔ کیونکہ نہی عن التکلم فی الصلوٰۃ نازل ہو چکی تھی۔ مگر حافظ ابن حجر رح لکھتے ہیں کہ یہ آیت چونکہ بالاتفاق مدنی ہے اس سے معلوم ہوا کہ عام تکلم فی الصلوٰۃ کی نہی مدینہ ہی میں نازل ہوئی ہے (فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۵۹) اور یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ بعض مہاجرین حبشہ مکہ مکرمہ بھی واپس آئے اور بعض مدینہ منورہ میں اور حضرت ابن مسعودؓ کا یہ رجوع مدینہ طیبہ میں ہوا تھا۔

١- آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ جب بسلسلہ جہاد کسی قصبہ یا شہر پر حملہ کرنا چاہتے تھے تو

وکان یستمع الاذان فان سمع ..... پہلے توجہ کرتے۔ اگر اذان کی آواز سن لیتے تو حملہ سے

...... اذانا امسک والا اغار بازرہتے۔ ورنہ حملہ بول دیتے تھے۔

(مسلم ص۱۶۶، ابو عوانہ جلد ا ص۳۳۵، دارمی ص۳۲۳، طیالسی ص۲۷۱)

قطبی پڑھنے والا طالب علم بھی بخوبی اس امر سے واقف ہوگا کہ تقسیم الشیٔ الیٰ نفسہ والیٰ غیرہ محال ہے۔ اگر استماع اور سماع کا ایک ہی معنی ہو تو اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ اذان سنتے تھے۔ سو اگر آپ سُن لیتے تو حملہ نہ کرتے والا حملہ کر دیتے تھے۔ جب پہلے اذان سُن لی ہوتی تھی تو پھر اگر اذان سُن لیتے کا کیا مطلب؟ استماع کا معنیٰ کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ آپ پہلے کان دھرتے اور توجہ کرتے۔ توجہ کے بعد اگر اذان سن لیتے تو فبہا والا حملہ کر دیتے تھے۔ مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ استماع سے مُراد ارادۃ استماع ہے ..... اھ ص ۳۸۱۔ ایک بے کار بہانہ ہے۔ اس لیے کہ مجازی معنی کے لیے قرینہ درکار ہے اور اس جگہ قرینہ مفقود ہے۔ فان سمع ..... الخ کے واضح الفاظ اس کا ابا کرتے ہیں کیونکہ حرف فا سے سماع کا ترتب امر باطنی یعنی ارادہ پر چسپاں نہیں ہوتا بخلاف کان دھرنے کے جو ظاہری امر ہے۔

٢- صراح ص۳۱۳ میں لکھا ہے۔ استماع گوش داشتن۔ کان دھرنا اور توجہ کرنا۔

٣- لغت کے امام ثعلبؒ سے روایت ہے واذا قرئ القرآن ..... الآیہ کا یہ مطلب نقل کیا گیا ہے کہ قال ثعلبؒ معناہ اذا قرء الامام فاستمعوا الی قرآنہ ولا تتکلموا (تاج العروس ج۱ ص۵۹۱) ثعلبؒ کہتے ہیں کہ استماع کا معنیٰ یہ ہے کہ جب امام قرأۃ کرے تو اس کی قرآت کی طرف توجہ کرو اور بولو مت۔

٤- اور امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ والاستماع الاصغاء۔ استماع کا مطلب کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے۔ (مفردات ص ۲۴۲)

٥- اور مختار الصحاح میں ہے: واستمع لہ ای اصغیٰ۔ کہ استمع لہ کا یہ معنیٰ ہے کہ اس نے توجہ کی اور کان دھرے۔

٦- منجد اور قاموس میں ہے: استمع لہ والیہ اصغیٰ۔ استمع لہ اور الیہ کا ایک ہی مطلب

ہے کہ اس نے توجہ کی اور کان دھرے۔ (منجد صفحہ ۳۶۲ ، قاموس جلد ۳ صفحہ ۴۱)

۷۔ امام نووی لکھتے ہیں:

الاستماع الاصغاء۔ (شرح مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۸۴) کہ استماع کا معنیٰ توجہ کرنا اور کان دھرنا ہے۔

۸۔ امام رازی لکھتے ہیں:

لان السماع غیر والاستماع غیر۔ سماع اور چیز ہے اور استماع اور ہے۔

(تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۵۰۲)

۹۔ قاضی شوکانی صاحب قرأت خلف الامام کی حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

یدل علی النھی عن القرأۃ عند مجرد الجھر من الامام ولیس فیہ ولا فی غیرہ ما یشعر باعتبار السماع۔ (نیل الاوطار جلد ۲ صفحہ ۲۴۱)

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جب امام جہر سے قرأت کر رہا ہو تو مقتدی کو اس حالت میں قرأت کرنا منع ہے۔ یہ حدیث اور کوئی دیگر حدیث اس پر دلالت نہیں کرتی کہ مقتدی کو قرأت سے اس لیے منع کیا گیا ہے کہ وہ قرأت سن رہا ہے۔

اس عبارت میں قاضی صاحب واشگاف الفاظ میں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ترک قرأۃ خلف الامام کی علت سماع نہیں ہے۔ موصوف جہر امام کو اس کی علت ٹھہراتے ہیں اور جمہور اہل اسلام بڑے وسیع الظرف ہیں۔ وہ صرف قرأتِ امام کو ترک القرأت خلف الامام کی علت سمجھتے ہیں۔

۱۰۔ نواب صاحب لکھتے ہیں:

ومعتبر استماع است نہ سماع پس ہر کہ بانتہاء وقوف واقف شد ونمی شنود یا اصم است یا صوتِ خطیب خفی است وے ہمچو سامع است۔ (بدور الاہلہ ص ۷۳)

ان تمام پیش کردہ اقتباسات سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ استماع اور سماع دو الگ الگ چیزیں ہیں اور استماع کا معنیٰ کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے۔ اس میں سننے کا معنیٰ ملحوظ نہیں ہے۔ لہٰذا اس آیت کو صرف جہری نمازوں کے ساتھ مخصوص کر دینا

باطل ہے بلکہ یہ آیت سرّی اور جہری ہر قسم کی نمازوں کو شامل ہے اور سماعِ قرأت، ترکِ قرأت کی علت نہیں۔ جیسا کہ قاضی شوکانی صاحبؒ کو بھی مسلّم ہے۔

انصات کا معنیٰ

انصات کا معنیٰ ہے خاموش بودن (صراح ص۶۹) قاموس جلد۱ ص۹۲ میں ہے۔ انصت، سکت یعنی انصات کا معنیٰ خاموش ہونا ہے اور یہی معنی مغرب ۲ ص۲۱۲ اور منجد ص۸۸۳ وغیرہ کتب لغت میں آئے ہیں۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں: الانصات السکوت کہ انصات کا معنیٰ سکوت کرنا اور خاموش رہنا ہے۔ (شرح مسلم جلد۱ ص۲۸۳) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں: اذ لا فرق بین السکوت والانصات عند العرب (کتاب القرأت ص۸۴) اہلِ عرب کے نزدیک سکوت اور انصات میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اور مختار الصحاح میں ہے کہ الانصات السکوت والاستماع انصتہ وانصت لہ (ص ۵۸)۔ انصات کا معنیٰ خاموش رہنا اور کان دھرنا ہے لام کے ساتھ ہو یا بدون لام دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔

اور منجد میں ہے کہ انصت وانتصت لہ سکت مستمعا لحدیثہ (ص۸۸۳) انصت اور انتصت لہٗ کا معنیٰ یہ ہے کہ اس کی بات کے لیے توجہ کرتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

اور تاج العروس میں ہے کہ

وانصتہ وانصت لہ اذا سکت لہٗ مثل نصحہ ونصح لہ وانصتہٗ و انصت لہ مثل نصحتہٗ ونصحت لہٗ والانصات ھو السکوت والاستماع للحدیث یقال انصتہٗ وانصت لہ۔	انصتہٗ اور انصت لہٗ کا معنیٰ ایک ہی ہے کہ اس کے لیے خاموش ہو گیا جیسے نصحہٗ اور نصح لہٗ کا ایک ہی مطلب ہے اور انصات کا معنیٰ سکوت اور بات کی طرف توجہ کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے انصتہٗ وانصت لہٗ۔

(جلد۱ ص۵۹۱)

امام ابو بکر الرازی رحؒ لکھتے ہیں کہ

قد بینا دلالۃ الآیۃ علی وجوب الانصات	ہم نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت وجوب انصات

عند قرأۃ الامام فی حال جهر الامام والاخفاء وقال اهل اللغۃ الانصات الامساك عن الكلام والسكوت لاستماع القرأۃ ولا یکون القاری منصتاً ولا ساکتا بحال وذلك لان السكوت ضد الکلام وهو تسکین الآلۃ عن التحریك بالكلام۔ ۔ اھ (احکام القرآن جلد ۳ ص ۴۹)

پر دلالت کرتی ہے جب کہ امام قرأت کر رہا ہو جہر سے قرأت کرے یا آہستہ اور اہلِ لغت کہتے ہیں کہ انصات کا معنیٰ کلام سے رُک جانا اور قرأت کی توجہ کے لیے خاموش رہنا ہے اور پڑھنے والا کسی صُورت میں مُنصت اور ساکت نہیں ہو سکتا کیونکہ سکوت کلام کی ضد ہے اور سکوت کا یہ معنی ہے کہ زبان کو کلام کے لیے حرکت نہ دی جائے۔

سکوت کا معنیٰ

امام اللغت والادب ابو عبداللہ الحسینؒ بن احمد المعروف بابن خالویہؒ (المتوفی ۳۷۰ھ) لکھتے ہیں: نزف الرجل اذا انقطعت حجتہ عند المناظرۃ وسکت واسکت مثلہ۔ (اعراب ثلاثین سُورۃ من القرآن ۷۶)

یعنی مناظرہ کرتے وقت جب کوئی آدمی بالکل لاجواب ہو کر خاموشی اختیار کر لیتا ہے تو اُس پر نزف کا لفظ اطلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی اپنے کلام کو منقطع کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی اپنے کلام کو منقطع کر دیتا ہے تو اس پر سَکَتَ اور اَسْکَتَ بولا جاتا ہے۔

منجد صد ۳۵۲ اور قاموس جلد ا صد ۹۲ میں لکھا ہے: اسکت انقطع کلامہ فلم یتکلم کہ سکوت کا معنیٰ یہ ہے کلام بالکل ترک کر دیا اور کوئی بات نہ کی۔ مجمع البحار جلد ۲ ص ۱۲۵ میں اس کی تصریح یوں کی ہے۔ جری الوادی ثلاثا ثم سکت ای انقطع یعنی تین دن تک سیلاب چلتا رہا پھر بالکل رُک گیا۔

امام راغب اصفہانی رح (المتوفی ۵۰۲ھ) لکھتے ہیں: السکوت مختصٌ بترك الكلام۔ (مفردات صد ۲۲۵) سکوت ترک کلام کے ساتھ مختص ہے۔

امام رازیؒ تحریر فرماتے ہیں:

لان السکوت عدمی معناہ انہ

سکوت عدمی ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اس

لم يقل شيئاً ولم ينقل امراً ولم يتصرف في قول ولا فعل ولا شك ان هٰذا المعنى عدمي محض۔ (مناظرات امام رازیؒ ص ۳۵)

نے کچھ بھی نہیں کہا نہ کوئی بات نقل کی ہے اور نہ کسی قول اور فعل میں تصرف کیا ہے اور اس کے عدمی محض ہونے میں کیا شک اور شبہ ہو سکتا ہے؟

ان منقولہ حوالوں سے یہ بات قطعیت کے ساتھ ثابت ہو جاتی ہے کہ بغیر مکمل خاموشی کے انصات اور سکوت اور اسکات کا مفہوم کسی طرح بھی محقق نہیں ہو سکتا اور جو لوگ جہری یا سرّی نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرآت تجویز کرتے ہیں۔ وہ کسی طرح انصات پر عامل نہیں تصور کیے جا سکتے اور یہ بھی وضاحت کے ساتھ عرض کیا جا چکا ہے کہ استماع کا معنی کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے، سننا اس کے مفہوم میں شامل نہیں ہے۔ اس لیے سرّی اور جہری کا سوال اٹھانا محض بے جا اور دور از کار بحث ہے۔

آہستہ پڑھنا بھی انصات اور استماع کے سراسر منافی ہے:

جو حضرات بحالتِ اقتدار امام کے پیچھے آہستہ قرآت تجویز کرتے ہیں اور اس کو انصات اور استماع کے منافی نہیں سمجھتے وہ غلطی پر ہیں۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر آتے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو قرآنِ کریم پڑھاتے تو آپ بھی آہستہ آہستہ ساتھ پڑھتے جاتے کہ مبادا حضرت جبرائیل علیہ السلام کے تشریف لے جانے کے بعد میں بھول نہ جاؤں اور کان یحرک شفتیہ آپ آہستہ آہستہ ہونٹ مبارک ہلاتے جاتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو یہ بھی پسند نہ آیا کہ آپ قرآتِ قرآن کے وقت اپنے ہونٹوں کو حرکت دیں اور یہ حکم نازل ہوا۔ لاتحرک بہ لسانک کہ آپ اپنی زبان تک کو حرکت نہ دیں۔

فاستمع له وانصت۔ (بخاری جلد ۱ ص ۳، مسلم جلد ۱ ص ۱۸۴، طیالسی ص ۳۴۲)

سو آپ کان دھریں اور پوری طرح توجہ کریں اور مکمل خاموشی اختیار کریں۔

اس سے معلوم ہوا کہ آہستہ پڑھنا، زبان کو حرکت دینا اور ہونٹ ہلانا استماع اور انصات کے بالکل منافی ہے۔ اسی لیے تو آپ کو تحریک لسان اور تحریک شفتین سے بھی منع کیا گیا۔

حالانکہ آپ آہستہ ہی پڑھتے تھے۔ بعض علمائے نے واذکر ربک فی نفسک ..... الایۃ سے آہستہ قرأت کرنے کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر علیہ الرحمہ ان کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

وھذا بعید مناف للانصات المأمور به۔ (تفسیر ابن کثیر مع المعالم ج ۳ ص ۳۷۲ وغیرہ

یہ معنی حق اور انصاف سے بعید اور انصات مامور بہ کے قطعاً اور سراسر منافی اور مخالف ہے۔

جلد ۲ ص ۲۸۱)

حضرات! آفتابِ نیم روز کی طرح یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مقتدی کے لیے سرّی اور جہری کسی بھی نماز میں قرأت کرنا استماع، انصات اور سکوت کے منافی ہے۔

گیارھواں اعتراض: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ تکبیر تحریمہ اور قرأت کے درمیان جو اسکات اور خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ اس وقت آپ کیا پڑھا کرتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں یہ دعا پڑھا کرتا ہوں۔ اللھم باعد بینی و بین خطایای۔ (الحدیث۔ بخاری جلد ۱ ص ۱۰۳)

امام بیہقی رح اس روایت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ معلوم ہوا کہ آہستہ آہستہ پڑھنے پر اسکات کا اطلاق صحیح ہے۔ لہٰذا جو شخص امام کے پیچھے آہستہ قرأت کرتا ہے تو وہ آیت استماع وانصات کی مخالفت نہیں کر رہا۔ (کتاب القرأت ص ۷۵) یہی بات مبارک پوری صاحب رح وغیرہ نے بھی نقل کی ہے۔ (دیکھیے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۵۱)

جواب۔ یہ اعتراض یا استدلال بھی مخدوش ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ ہمارا استدلال نص قرآنی سے ہے جس میں لفظ استماع اور انصات آیا ہے۔ اسکات اور سکوت کا لفظ صراحت کے ساتھ اس آیت میں مذکور نہیں ہے۔ استماع اور اسکات وسکوت کے درمیان فرق نمایاں ہے۔ امام بیہقی رح نے جو یہ فرمایا ہے کہ ان میں فرق نہیں ہے صحیح نہیں ہے۔ اور اسی سے قاضی مقبول احمد صاحب کو مغالطہ ہوا ہے۔ (دیکھیے الاعتصام) اس میں اہلِ علم کے لیے اشکال کی کوئی وجہ نہیں اور انصات اور سکوت میں جو فرق ہے وہ مبارکپوری صاحب رح کو بھی مُسلّم ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ انصات اور سکوت کا معنی ایک نہیں ہیں بلکہ انصات کا معنی سکوت مع الاستماع ہیں۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۵۱ و

تحفۃ الاحوذی جلد ا صـ۲۵۸) لہٰذا حدیث اَسْکَاتَہ سے استماع اور انصات کی تفسیر کرنا اور اس پر استدلال کی بنیاد رکھنا باطل ہے۔

وثانیاً۔ حافظ ابن حجرؒ حضرت زیدؓ بن ارقم کی امرنا بالسکوت کی روایت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں نماز میں مطلقاً سکوت کا حکم دیا گیا کہ نہ تو تم ثناء و آمین پڑھو اور نہ تسمیع، تحمید، تشہد اور درود وغیرہ پڑھو۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ حکم سابق سے سکوت کا حکم دیا گیا کہ سلام و کلام وغیرہ سے سکوت اختیار کرو تو اس روایت میں سکوت عن الکلام المتقدم مراد ہے۔ (فتح الباری جلد۳ ص ۶۰ محصلہ) گویا جس چیز سے سکوت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے حقیقتاً سکوت ہی مراد ہے۔ اس بیان کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ (المتوفی ۱۳۵۲ھ) حدیث اِسْکَاتَہ کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں اسکات عن التکبیر مراد ہے یعنی تکبیر تحریمہ سے اسکات اور سکوت کرنا (فصل الخطاب ص۵۲) خلاصہ یہ ہوا کہ اسکات کا معنی آہستہ پڑھنا نہیں جیسا کہ امام بیہقیؒ وغیرہ کو دھوکا ہوا ہے بلکہ اسکات کے حقیقی معنی ہی مراد ہیں۔ وہ یہ کہ جس چیز سے خاموش رہنے کا حکم تھا اس کو حقیقتاً ترک کر دینا اور اس سے خاموش ہونا ہے۔ علاوہ ازیں اگر اس سے صرف نظر بھی کر لیا جائے تو یہ ایک مجازی معنی ہے اور آیت زیر بحث میں جمہور سلف و خلفؒ نص صحیح احادیث اور لغت کی روشنی میں حقیقی معنی مراد لیتے ہیں۔ لہٰذا مجازی معنی کو حقیقی معنی کے ترک کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا چنانچہ امام ابوبکر الرازیؒ اسی حدیث کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: انما سمّیناہُ ساکتاً مجازاً لان من لم یسمعہ یظنہ ساکتا اھ (احکام القرآن جلد۳ ص ۴۹) یعنی اس کو ہم نے مجازی طور پر ساکت کہا ہے کیونکہ جو شخص اس کی قرأت کو نہیں سن رہا وہ اس کو ساکت ہی خیال کرتا ہے۔ مجازی معنی خود قرینہ کا محتاج ہوتا ہے اور فریق ثانی اس سے حقیقت کو ترک کرنے پر تلا ہوا ہے۔

بارھواں اعتراض۔ مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ صاحب مجمع البحار نے (جلد میں) حدیث قرأ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فیما امر وسکت فیما امر کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ قرأ کے معنی جہر کے ہیں اور سَکَتَ کے معنی اَسَرَّ کے ہیں یعنی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جہر سے بھی قرأت کی اور آہستہ بھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرأ کے معنی جَہَرَ بھی آتے ہیں۔ اس

معنی کو پیش نظر رکھتے ہوئے آیت واذا قرئ القرآن کا مطلب یہ ہوگا کہ جب قرآن جہر سے پڑھا جائے تو تم خاموش رہو۔ لہٰذا یہ آیت صرف جہری نمازوں کو شامل ہوگی۔ نہ کہ سرّی نمازوں کو۔ (تحقیق الکلام جلد ۱ صفحہ ۵۱ محصلہ)

جواب۔ مبارک پوری صاحبؒ کا یہ بیان بھی قابلِ التفات نہیں ہے۔

اوّلاً۔ اس لیے کہ آیت کا شانِ نزول صحیح روایات سے ترکِ قرأت ثابت ہو چکا ہے۔ اس میں قیاس کی ضرورت ہی نہیں ہے

وثانیاً۔ اہلِ عرب کے نزدیک قرأ اور جہر میں نمایاں فرق ہے اور حقیقت کو بلا کسی قوی اور صارف قرینہ کے ترک کرنا کئی وجوہ سے باطل ہے۔

وثالثاً۔ اگر اس حدیث کا معنی ہی بیان کرنا مقصود ہے تو اس کی صحیح صورتیں بھی عرض کی جا سکتی ہیں۔ کیوں نہیں ہو سکتا کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم امامت کی حالت میں قرأت کرتے تھے۔ (قرأ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فیما اُمِر) اور اقتداء[1] کی حالت میں آپ نے سکوت اور خاموشی اختیار کی (وسکت فیما اُمِر) اور یہ بھی ممکن ہے کہ مطلب یہ لیا جائے کہ آپ نے پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے بعد قرأت کی اور کوئی نہ کوئی سورت یا قرآن کا کچھ حصہ پڑھا (قرأ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیما اُمِر) اور پچھلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے بعد اور کوئی سورت نہ پڑھی۔ اور حقیقتاً سکوت اختیار کیا (وسکت فیما اُمر) اور صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۰۷ وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے کہ پچھلی دو رکعتوں میں

---

[1] بیت اللہ کے پاس دو مرتبہ آپ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی اقتدا میں نماز پڑھی ہے۔ (ابو داؤد جلد ۱ ص ۵۶ ترمذی جلد ۱ ص ۲۱) سفر تبوک سے واپسی پر آپ نے حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف کی اقتدا کی ہے۔ (مسلم جلد ۱ ص ۱۳۴، ابو داؤد جلد ۱ ص ۲۰) اہل قبا کے درمیان مصالحت کرنے کے بعد واپسی پر آپ نے عصر کی نماز میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتدا کی ہے۔ (بخاری جلد ۲ ص ۱۰۶۶) اور نزل جبرائیل فامنی۔ الحدیث بخاری جلد ۱ ص ۴۵۶ و مسلم جلد ۱ ص ۲۲۱ اور مؤطا امام مالک ص ۲ وغیرہ میں موجود ہے۔ جس سے حضرت جبرائیل کی اقتدا میں آپ کا نماز پڑھنا ثابت ہے اور آخری نماز میں آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتدا کی جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ آپ کی نفس اقتدا کے ثبوت کے لیے یہ دلائل کافی ہیں۔

آپ صرف سورۃ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔ جب سکت کے اور قرأ کے معنی کے لیے صحیح احادیث سے اور احتمالات کا بھی ثبوت مل سکتا ہے جن سے حقیقی معنی درست ہو سکتے ہیں تو پھر مجاز مراد لینے کی کون سی مجبوری ہے، جس کے لیے ایسی رکیک اور بارد تاویل اختیار کی جائے؟ اور ہمارا بیان کردہ مطلب ہی سابق اور آئندہ دلائل کا ساتھ دیتا ہے، جس کو صحیح ہونے کے ساتھ جمہور کی تائید کا شرف بھی حاصل ہے۔

ورابعاً۔ کیا مبارک پوری صاحبؒ فَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوسَى الْغَضَبُ اور أُمِرْنَا بِالسُّكُوتِ اور سئل النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم عن اللّوح فسکت (بخاری جلد ۱ ص ۲۴) وغیرہ کا یہ معنی کریں گے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کا غصہ آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ ہمیں نماز میں آہستہ آہستہ سلام وکلام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ سائلین کے سوال کے بعد آپ آہستہ بولتے رہے؟ اور کیا یہ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ کے خلاف نہ ہوگا؟ اور دل میں آہستہ آہستہ بولنے سے سائلین کو کیا فائدہ تھا؟ لہٰذا اس استدلال میں بھی کوئی جان نہیں ہے۔

تیرھواں اعتراض۔

حافظ ابن ہمامؒ نے آیت واذا قرئ القراٰن کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ فاستمعوا میں اللہ تعالیٰ نے جہری نمازوں میں قرأت سے مقتدیوں کو منع کیا ہے اور انصات میں سرّی نمازوں میں ان کو قرأت سے روکا ہے۔ مبارکپوری صاحب ان پر گرفت کرتے لکھتے ہیں کہ ابن ہمامؒ کے کلام میں تین فساد ہیں:

۱۔ ابن ہمامؒ انصات کا معنی سکوت سمجھے ہیں۔ حالانکہ انصات کا معنیٰ مطلق سکوت کے نہیں ہیں بلکہ سکوت مع الاستماع کے ہیں۔

۲۔ ابن ہمامؒ کی تفسیر بالرائے ہے۔ (جس کا حرام ہونا مبرہن ہے)

۳۔ سرّی نمازوں میں سماعِ قرأت کے بغیر تدبّر کیسے متصوّر ہو سکتا ہے؟ (تحقیق الکلام ج ۲ ص ۴۹)

جواب۔ مبارک پوری صاحبؒ کی تینوں شقیں مردود ہیں:

پہلی اس لیے کہ مُبارک پُوری صاحبؒ خود غلطی کا شکار ہیں۔ وہ سماع اور استماع کو ایک سمجھتے ہیں۔ حالانکہ سماع اور استماع میں زمین آسمان کا فرق ہے اور متعدد حوالوں سے پہلے یہ امر ثابت

کیا جاچکا ہے۔ اگر واقعی استماع کا معنی سننا ہوتا تو حافظ ابن ہمامؒ پر اعتراض کی گنجائش تھی۔ اور دوسری[۲] شق اس لیے مخدوش ہے کہ حافظ ابن ہمامؒ کی تفسیر بعینہٖ قرآن کریم، صحیح احادیث لغت اور جمہور مفسرین کی تفسیر ہے۔ لہٰذا اس کو تفسیر بالرائے سے تعبیر کرنا ان دلائل سے غفلت اور بے خبری پر مبنی ہے۔ اور بلا تحقیق یہ الزام لگانا کھُلی جسارت ہے۔ اور تیسری[۳] شق اس لیے باطل ہے کہ اگر مبارکپوری صاحبؒ اس دھوکہ میں مبتلا ہیں کہ استماع کا مطلب سماع ہے (اور جبھی تو وہ سماع قرأت کی آڑ لیتے ہیں) تو اس کی پوری تفصیل پہلے عرض کی جاچکی ہے کہ سماع اور استماع میں فرق ہے۔ اور اگر وہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ انصات کا سماع کے بغیر تحقق نہیں ہو سکتا تو یہ بھی باطل ہے۔ کیونکہ انصات کے مفہوم میں من وجہ استماع اور توجہ تو شامل ہے لیکن اس میں سماع ہرگز شامل نہیں ہے۔ ایک حدیث بایں الفاظ آتی ہے۔

وان نأی وجلس حیث لا یسمع فانصت ولم یلغ کان له کفل من الاجر (الحدیث) (ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۵۱)	اگر کوئی شخص جمعہ کے خطبہ کے وقت امام سے دور بیٹھ گیا جہاں سے امام کی آواز وہ نہیں سن سکتا اور خاموش رہا تو اس کو ایک درجہ ثواب حاصل ہوگا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انصات کے لیے سماع شرط نہیں ہے۔ انصات وہاں بھی ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے جہاں خطبہ وغیرہ کچھ بھی نہ سنا جاسکتا ہو۔ اگر انصات کے تحقق کے لیے سماع شرط ہوتا تو بغیر سماع کے انصات نہ پایا جاسکتا۔ اور یہ بھی مت بھولیے کہ انصات میں گو فی الجملہ استماع ملحوظ ہے لیکن من کل الوجوہ استماع بھی اس میں ضروری نہیں ہے۔ انصات کا معنی خاموش ہونا ہے اور یہ معنی بغیر استماع اور توجہ کے بھی متحقق ہو سکتا ہے اور استماع کے ساتھ بھی متحقق ہو سکتا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

فالانصات هو السکوت وهو یحصل ممن یستمع وممن لا یستمع کان یکون مفکراً فی امر آخر۔ (فتح الباری جلد ص ـــ بحوالہ فتح الملہم ۲ ص ۲۰)	انصات کا معنی سکوت کرنا اور خاموش رہنا ہے اور انصات ایسے شخص سے بھی ہو سکتا ہے جو استماع اور توجہ کرے اور انصات اس شخص سے بھی ہو سکتا ہے جو استماع اور توجہ نہیں کرتا، بلکہ کسی اور امر کی فکر میں ڈوب کر خاموش ہے۔

بہرحال مبارکپوری صاحبؒ کی پیش کردہ تینوں شقیں باطل ہیں اور اس کے مصداق ہیں
کہ ..... ع : میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

مؤلف خیر الکلام نے (اور انھیں کی پیروی میں قاضی مقبول احمد صاحب نے ملاحظہ ہو الاعتصام ۵ اکتوبر ۱۹۶۲ء) اس سلسلہ میں جو مخلص تلاش کیا ہے وہ بھی بڑا ہی عجیب ہے۔ انھوں نے ص ۳۶۰ سے ص ۳۹۹ تک کئی صفحات اس پر سیاہ کر ڈالے ہیں مگر بعض باتوں کو شاید وہ خود بھی نہ سمجھے ہوں کہ میں کیا کہ رہا ہوں صرف کچھ کہنے اور لکھنے کا نام جواب نہیں ہوتا۔ ذیل کے امور کو ملحوظ رکھیں۔

۱۔ ہم نے کتب لغت سے باحوالہ یہ ثابت کیا ہے کہ انصات کے معنی بالکل خاموشی اور استماع کے معنی کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے، مؤلف مذکور کا یہ فریضہ تھا کہ وہ باحوالۂ کتب لغت یہ ثابت کرتے کہ انصات مطلق خاموشی نہیں بلکہ اس میں کلام کرنا درست ہے اور استماع کا معنٰی کان دھرنا اور توجہ کرنا نہیں بلکہ اس کا معنٰی سننا اور آہستہ آہستہ بولنا ہے لیکن جب وہ اس سے بالکل لاجواب رہے تو یہ کہکر جان چھڑالی ہے کہ پھر ہم کو اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ سکوت اور انصات لغت کے لحاظ سے آہستہ پڑھنے کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں یا نہیں ؟ بلکہ ہمارے لیے اس قدر کافی ہے کہ ہم ثابت کردیں کہ قرآن مجید کی آیت زیر بحث میں جو استماع اور انصات آیا اس سے بالکل خاموشی مراد نہیں ۔۔ اھ (ص ۳۷۱) مگر یقین جانیے کہ اس سے بالکل خاموشی مراد ہے۔ حضرات ائمہ لغتؒ اور جمہور مفسرینؒ کی روشن عبارتیں اس کا بیّن ثبوت ہے۔ جن کے حوالے گذر چکے ہیں چونکہ لغت سے ہی ایک ایسا فن ہے جو بلا کسی فریق کے لحاظ کے صحیح بات بتاتا ہے۔ اس لیے مؤلف خیر الکلام لغت سے اپنی تائید پیش کرنے سے بالکل قاصر رہے ہیں۔

۲۔ جن روایات سے انھوں نے استدلال کیا ہے کہ سکوت قرأۃ کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے ان میں ایک روایت بخاری کی اور ایک مستدرک وغیرہ کی ہے کہ اسكاتك ما بين التكبير والقرأة ما تقول ... الخ ويسكت بعد القرأة هنية يسأل الله من فضله۔ تو ہم نے احسن الکلام میں اس کی تصریح کردی ہے کہ نصِ قرآنی میں انصات و استماع

کالفظ ہے اور با قرار مبارکپوری صاحبؒ انصات اور سکوت میں فرق ہے اس لیے یہ جملہ حوالے ہمارے خلاف نہیں ہیں کیونکہ ہمارا استدلال تو انصات و استماع کے لفظ سے ہے اور اور انصات و سکوت میں فرق ہے۔

۳۔ فتح الباری جلد ۱ ص ۳۴۰ کے حوالہ سے ابن جریجؒ سے جو روایت نقل کی گئی ہے کہ لوگ مؤذن کی اذان کے لیے خاموش رہتے تھے بایں ہمہ وہ اذان کے کلمات دہراتے تے جس سے مؤلف خیر الکلام نے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ انصات میں تکلّم درست ہے۔ (محصلہ خیر الکلام ص ۳۷۲) تو یہ اثر بالکل ضعیف ہے کیونکہ اس میں حُدِّثْتُ ہے اور یہ معلوم نہیں کہ بیان کرنے والا کون ہے؟ اور ہے بھی موقوف اس میں مرفوع روایات کے مقابلہ میں کیا حجت ہے؟ علاوہ ازیں اذان پر قیاس باطل ہے کیونکہ اذان میں ہر کلمہ کے بعد وقفہ ہوتا ہے جس میں اجابتِ مؤذّن ہو سکتی ہے۔ بخلاف امام کے پیچھے قرأت کے کہ سکتات کا تو صحیح احادیث سے ثبوت نہیں اور مقتدی کو پڑھنا منع ہے۔

۴۔ مجمع الزوائد جلد ۳ ص ۱۴۳ سے جو روایت نقل کی ہے کہ من صام رمضان فی انصات وسکون ..... الخ اس کی سند درکار ہے کہ آیا صحیح بھی ہے یا نہیں؟ ضعیف قسم کی روایتوں سے قرآن و احادیث صحاح اور اجماع امت اور لغت کو کس طرح رد کیا جا سکتا ہے؟ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں الولید بن الولید ہے۔ امام ابوحاتمؒ اس کی توثیق کرتے ہیں۔ وضعفه جماعة اور دیگر حضرات محدثین کرامؒ اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ (مجمع الزوائد، جلد ۳ ص ۱۴۳) علاوہ ازیں اس سے جھوٹ، گالی گلوچ اور غیبت وغیرہ سے صحیح معنی میں انصات مراد ہے جیسا کہ مقتدی کے لیے انصات عن القرأة مراد ہے۔ کیونکہ باقی باتوں کا تو نماز میں احتمال ہے ہی نہیں اور جن حضرات سے اس کے علاوہ کچھ اور منقول ہے تو وہ لاعلمی پر مبنی ہے۔

۵۔ جو آیات مؤلف خیر الکلام نے ص ۳۶۶ پر پیش کی ہیں کہ قرآنِ کریم کی تلاوت کے وقت کچھ کلمات کہہ سکتے ہیں تو انھوں نے یقولون اور قالوا کے الفاظ پر غور نہیں کیا کیونکہ یہ زبان کے ساتھ پڑھنے پر نص نہیں ہیں دل میں کہنے پر بھی قال اور یقول کا اطلاق صحیح ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک خاص موقع پر اپنے بھائیوں سے کہا: قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا......
الآیۃ۔ حافظ ابن کثیر رح اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ قال ھذا فی نفسہ (ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۴۸۶) یہ قول انھوں نے دل میں کہا تھا، مؤلف مذکور کو معلوم ہونا چاہیے کہ نزاع قرأ اور یقرأ کے الفاظ میں ہے قال اور یقول میں نہیں ہے اور نہ ان کی پیش کردہ آیات سے انصات اور استماع کے وقت قرأت ثابت ہوتی ہے۔

۶۔ مؤلف خیر الکلام نے جو قرائن پیش کیے ہیں کہ انصات وسکوت وغیرہ کے ساتھ قرأت ہو سکتی ہے تو اگر ان کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی مجاز ہے اور انصات واستماع کا جو معنی ہم نے کیا ہے وہ حقیقت ہے جو صحیح احادیث کے علاوہ اجماعِ اُمّت اور لغت سے قوی طور پر مؤید ہے اس لیے اس کو ترک کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے اور نہ اس کو کوئی سننے کے لیے تیار ہے چنانچہ خود مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ کیونکہ ہم کو اس امر کی ضرورت ہے کہ معلوم کریں کہ آیت میں استماع اور انصات کا کیا درجہ ہے خواہ وہ اطلاق حقیقی ہو یا مجازی۔ جب یہ ثابت ہو جائے تو مدعیٰ حاصل ہو جاتا ہے باقی بحث زائد ہے (ص ۲۷۱) آپ پر کیا مصیبت وارد ہوئی ہے کہ آپ اطلاقِ مجازی کے پیچھے کمربستہ ہو کر نصوص صحیحہ کی خلاف ورزی کر رہے ہیں جو کچھ ائمہ لغت اور جمہور امت نے کہا ہے اسے تسلیم کر لیں۔ اور یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جن حضرات سے انصات و استماع اور سکوت وغیرہ کے حوالے مؤلف خیر الکلام نے نقل کیے ہیں چونکہ وہ اس مسئلہ میں فریق کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی تفسیر میں ان کا اپنا ذہن بھی کارفرما ہے اور ان کی تفسیر خود محل نزاع ہے اس لیے صحیح احادیث اور کتب لغت ہی سے ان کے معانی حل ہو سکتے ہیں۔ مؤلف خیر الکلام ص ۲۸۹ میں لکھتے ہیں کہ پس ضروری ہے کہ جو آیت میں بالکل خاموشی کا معنی لیتا ہے وہ دو باتیں ثابت کرے۔ ایکؔ یہ کہ انصات لغت میں بالکل خاموشی کے معنیٰ میں آتا ہے۔ دوؔم یہ کہ اس کے خلاف جو قرائن پیش کیے جاتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں..... اھ

بحمد اللہ تعالیٰ ہم کتب لغت سے ثابت کر چکے ہیں کہ انصات کے معنی لغت میں بالکل خاموشی کے آتے ہیں اور جو قرائن اس کے خلاف پیش کیے گئے ہیں وہ سب مجازی ہیں۔ اس لیے حقیقت کو ترک کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے اور نہ شاذ اور خلافِ اجماع قول کو لے کر جمہور کا مسلک رد

کیا جا سکتا ہے۔

۷۔ مؤلف خیر الکلام نے ص ۳۰۷ میں جو یہ لکھا ہے کہ اگر انصت بدون لام کے ذکر ہو تو سکوت کے معنی میں ہے اور جب اس کے ساتھ لام ہو تو اس میں استماع بھی ہے۔ اور قاموس جلد ۱ ص ۱۵۹ کا حوالہ انصتہٗ ولہ سکت لہ واستمع لحدیث نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ اس کا عطف فاستمعوا لہ پر ہے لہٰذا یہاں بھی لام ہے یا مقدر مانی جائیگی۔ (محصلہ) تو یہ محض لفظوں کا کرتب ہے محض لفظوں کی شعبدہ بازی سے کیا بنتا ہے۔ قاموس میں انصتہٗ ولہٗ لام کے ساتھ ساتھ ہو یا بدون لام کے دونوں کے معنی سکت کیا ہے اور قرآن کریم میں انصات اور استماع دو الگ الگ حکم ہیں۔ ایک کی لام دوسرے کو دے کر کام نکالنا اور اس طرح کی خانہ پری سے کچھ نہیں بنتا۔

۸۔ ہم نے قاموس کا حوالہ دیا ہے۔ اس پر مؤلف خیر الکلام ص ۳۹۳ میں لکھتے ہیں کہ قاموس میں اس سے آگے لکھا ہے کہ وَرَجُلٌ سِکِّتٌ قَلِیلُ الکلام فاذا تکلم احسن (قاموس جلد ۱ ص ۹۳) یہ آدمی سکت ہے یعنی کم باتیں کرتا ہے جب کلام کرتا ہے تو اچھا کلام کرتا ہے .... اھ مگر اس حوالہ سے مؤلف کو کیا فائدہ؟ رجل سکت کا معنیٰ تو یہ ہے کہ خاموش طبع کم گو ہے مگر جب کلام کرتا ہے تو اچھا کلام کرتا ہے۔ اس میں یہ کہاں ہے کہ وہ خاموشی اور انصات کے وقت کلام کرتا ہے جو مؤلف مذکور کا مدعی ہے۔ انصات اور خاموشی اپنے وقت پر ہے اور کلام اپنے وقت پر ہے۔ دونوں کا وقت ایک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف مذکور کو سمجھ عطا فرمائے ان کو ثابت تو یہ کرنا ہے کہ انصات کے وقت کلام ہو رہا ہے۔ اور اس حوالہ میں اس کا ذکر کوئی نہیں۔ خاموشی اپنے وقت پر ہے اور کلام اپنے وقت پر ہے۔ اور اس بات کو ایک عام آدمی بھی بخوبی سمجھتا اور سمجھ سکتا ہے۔ مگر ع: اک دل ہے جو ہر لحظہ الجھتا ہے خرد سے

چودھواں اعتراض

حضرت امام بخاری رح[1]، امام ترمذی رح[2]، امام بیہقی رح[3]، مولانا شمس الحق رح[4]، مولانا ابو عبدالرحمٰن

---

[1] جزء القراۃ ص ۹ و ۵۸

[2] ترمذی جلد ۱ ص ۴۲

[3] کتاب القراۃ ص ۱۷ و ۲۹

[4] التعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۵

محمد عبد اللہ[1]، مولانا عبد الصمد[2] اور مبارک پوری صاحب[3] وغیرہ فرماتے ہیں کہ ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ آیتِ استماع اور انصات کا مطلب یہی ہے کہ مقتدی کو بحالتِ قرآتِ امام توجہ کرتے ہوئے خاموشی اختیار کرنی چاہیئے اور جب امام قرآت کر رہا ہو تو اس وقت مقتدی کو کچھ بھی نہیں پڑھنا چاہیے اور مکمل خاموشی اختیار کرنی چاہیے لیکن مقتدی کو سکتاتِ امام میں قرآت کرنی چاہیے اور سکتات میں قرآت کرنا آیت مذکورہ کے منافی نہیں ہے اور سکتات کا ثبوت یہ ہے۔

۱- حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ امام جس وقت سکتہ کرے تو اس وقت مقتدی کو قرآت کرنی چاہیے کیونکہ جس شخص نے قرآت نہ کی۔ اس کی نماز میں خلل اور نقصان واقع ہوگا۔ (کنز العمال جلد ۴ ص ۹۶)

۲- حضرت ابوہریرہ رضؓ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص امام کے ساتھ فرض نماز میں شریک ہو۔ اس کو امام کے سکتات میں سُورۃ فاتحہ پڑھنی چاہیے۔ (کتاب القرآۃ ص ۵۴، مستدرک جلد ۱ ص ۲۳۸)

۳- عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہٖ سے روایت ہے کہ جب آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انصات اور سکتہ کرتے تھے تو اس وقت حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آپ کے پیچھے قرآت کر لیا کرتے تھے۔ (کتاب القرآۃ ص ۶۹، ۸۶)

۴- ھشامؒ بن عروہؒ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ اے فرزند جب امام سکتہ کرے تو تم اس وقت قرآت کر لیا کرو۔ اور جب امام قرآت کرے تو اس وقت تم خاموش ہو جاؤ۔ کیونکہ فرض نماز ہو یا نفل۔ اگر اس میں سُورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو نماز ادا نہیں ہوتی۔ (جزء القرآۃ ص ۵۸، کتاب القرآۃ ص ۸۷)

۵ حضرت ابو سلمہؓ یا حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ امام کے لیے دو سکتے ہوتے ہیں۔ ان کو سُورۃ فاتحہ کی قرآت کے لیے غنیمت سمجھو۔ (جزء القرآۃ صہ ۵۸ و کتاب القرآۃ صہ ۷۰)

---

[1] عقیدہ محمدیہ جلد ۲ ص ۱۸۳ [3] تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۵۱ و ابکار المنن ص ۱۴۸

[2] اعلام الاعلام ص ۱۹۰ (ہم نے ان تمام حضرات کے دلائل کا قدر مشترک نقل کیا ہے۔)

۶۔ حضرت سعیدؒ بن جبیرؒ کا بیان ہے کہ سلف کا طریقہ یہ تھا کہ جب ان کو کوئی نماز پڑھاتا اور امامت کا فریضہ بجالاتا تو نماز میں ضرور سکتہ کیا کرتا تھا تاکہ مقتدی سورۃ فاتحہ پڑھ لیں۔

(جزء القرأۃ ص ۵۷)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ سکتات امام کا وجود اور ثبوت بھی ہے۔ لہٰذا اس صورت میں قرآنِ کریم اور حدیث دونوں پر عمل ہو جاتے گا۔

جواب ۔ ان حضرات کا یہ استدلال نہایت ضعیف اور کمزور ہے۔ کیونکہ یہ اکثر و بیشتر روایات حضرات صحابہؓ و تابعینؒ پر موقوف ہیں اور پہلے نقل کیا جاچکا ہے کہ فریقِ ثانی کے نزدیک "در موقوفات صحابہؓ حجت نیست"۔ جب حضرات صحابہ کرامؓ کا یہ حال رہا تو تابعینؒ اور اتباعِ تابعینؒ وغیرہم کی کیا پوزیشن باقی رہ جاتی ہے۔ اور یہ جتنے آثار و روایات نقل کی گئی ہیں۔ ان میں ایک بھی صحیح نہیں ہے۔ ترتیب وار جوابات ملاحظہ کریں:

اثر ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ اوّلاً۔ یہ اثر موقوف ہونے کے ساتھ حضرت ابن عمرؓ سے نہیں۔ بلکہ حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ بن العاص سے مروی ہے۔ ابن عمرؓ کا نام لینا راویوں میں سے کسی کی غفلت اور غلطی کا نتیجہ ہے۔ (دیکھیے کتاب القرأۃ ص ۴۵)

وثانیاً۔ اس میں سورۃ فاتحہ کی تصریح موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ اثر مجمل ہے۔

وثالثاً۔ اس کی سند میں مثنیٰ بن صباح راوی کمزور ہے۔ امام بخاری رحؒ لکھتے ہیں کہ اس کے دماغ میں فتور آگیا تھا۔ (ضعفاء صغیر ص ۷۰) امام نسائی رحؒ اس کو متروک کہتے ہیں۔ (ضعفاء صغیر نسائی ص ۵۳) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے (تقریب ص ۳۴۶) امام یحییٰ القطانؒ اور ابن مہدی رحؒ اس کی روایت کو قبول نہیں کرتے تھے۔ امام احمد رحؒ کہتے ہیں کہ وہ محض ہیچ ہے۔ ابن معینؒ اس کو لیس بذاك اور ابن عدیؒ ضعیف کہتے ہیں (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۷)۔ امام ترمذی رحؒ، ابن سعد رحؒ، علیؒ بن الجنید رحؒ، دارقطنی رحؒ، ابن حبانؒ، ساجی رحؒ ابو احمد الحاکم رحؒ، سحنون رحؒ اور امام عقیلی رحؒ وغیرہ سب اس کی تضعیف کرتے ہیں۔

(تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۳۶)

حدیث ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ اس روایت کی سند میں محمدؒ بن عبداللہؒ بن

عُمیر رح موجود ہے۔ امام بخاری رح لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف تھا (ضعفاء ص ۲۸) امام مسلم لکھتے ہیں کہ امام یحییٰ القطان رح اس کی تضعیف کرتے تھے۔ (مسلم جلد۱ ص ۲۰) امام نسائی رح اس کو متروک کہتے ہیں۔ (ضعفاء صغیر ص ۲۵) امام بیہقی رح لکھتے ہیں کہ وہ قابل احتجاج نہیں۔ (کتاب القرأۃ ص ۵۴) امام دارقطنی رح کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ (دارقطنی جلد۱ ص ۱۲۱) امام ترمذی رح کہتے ہیں کہ وہ قوی نہیں (ترمذی جلد۲ ص ۱) امام یحییٰ رح بن معین رح اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد۲ ص ۷۷ ولسان المیزان جلد۵ ص ۲۱۶) علاوہ ازیں اس روایت میں صلوٰۃ مکتوبہ کی قید ہے۔ حالانکہ فریق ثانی کے نزدیک صلوٰۃ تراویح ..... صلوٰۃ عید اور صلوٰۃ وتر وغیرہ میں بھی امام کے پیچھے قرأت فاتحہ ضروری ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضہ سے ایک موقوف اثر بھی مروی ہے۔ کہ سکتۂ امام میں قرأت فاتحہ کے بغیر نماز مکمل نہیں ہو سکتی (کتاب القرأۃ ص ۶۶) لیکن اس کی سند میں اسحاق بن عبداللہ بن ابی فروہ نہایت ضعیف اور کمزور راوی موجود ہے۔ جس کی پوری بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز

روایت عمرو بن شعیب رح عن ابیہ ...... الخ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے روایتی سلسلہ میں محدثین کا کلام معروف و مشہور ہے۔ امام یحییٰ القطان رح فرماتے ہیں کہ اس کی سند ہمارے نزدیک ضعیف اور کمزور ہے۔ (ترمذی جلد۱ ص ۴۳، ۱ ص ۸۲) امام ابوداؤد رح ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ وہ آدھی حجت بھی نہیں۔ امام ابوزرعہ رح فرماتے ہیں کہ محدثین اس لیے ان پر کڑی جرح کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے باپ سے چند روایتیں سنیں ہیں اور وہ باپ دادا کی تمام غیر مسموع روایات کو بلاتحاشا[1] بیان کرتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد۲ صفحہ ۲۸۹) حافظ ابن حجر رح لکھتے ہیں کہ انھوں نے عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے کچھ بھی نہیں سنا۔ وہ کتاب سے نقل کر کے محض تدلیس سے کام لیتے ہیں۔ (طبقات المدلسین ص ۱۱) امام طحاوی رح بھی ان کی سند کو منقطع سمجھتے ہوئے اس کو ضعیف کہتے ہیں (طحاوی جلد۱ ص ۴۵)

---

[1] حضرات محدثین کرام رح کا یہ ضابطہ ہے۔ اگر استاد اپنی کتاب اور بیاض سے روایت کرنے کی شاگرد کو اجازت نہ دے۔ تو وہ اس کتاب اور بیاض سے روایات بیان کرنے کا مجاز نہیں اور اس کی ایسی روایتیں قابل حجت نہیں ہو سکتیں۔ (شرح نخبۃ الفکر ص ۱۰۰)

امام حاکم رہ کہتے ہیں کہ ان کی روایت مرسل ہونے کی وجہ سے ضعیف سمجھی جاتی ہے۔ (مستدرک جلد ا ص ۱۰۷) محدث ابن حزم رح لکھتے ہیں کہ عمروؒ بن شعیبؒ کتاب سے روایت نقل کرتے ہیں جو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے اما حدیث عمروؒ بن شعیبؒ عن ابیہ عن جدہ فصحیفۃ لا تصح۔ (محلی ابن حزم جلد ا ص ۲۳۲)

امام علیؒ بن المدینیؒ فرماتے ہیں کہ عمروؒ بن شعیبؒ جب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے روایت نقل کرے تو وہ کتاب سے (جو انھوں نے پائی تھی) نقل کرتا ہے فھو ضعیف لہذا وہ ضعیف ہے۔ ابن عدیؒ فرماتے ہیں کہ وہ فی نفسہٖ ثقہ ہے مگر عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے مرسل ہے ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ جب وہ طاؤسؒ اور سعیدؒ بن المسیب وغیرہ ثقات سے روایت نقل کرے تو حجت ہے۔ اور جب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے روایت کرے تو اگر جدہ سے عبد اللہؒ مراد ہیں تو حدیث منقطع ہوگی اور اگر محمدؒ مراد ہوں تو مرسل ہوگی (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۵۳) اور محدث ساجیؒ فرماتے ہیں کہ

قال ابن معینؒ ھو ثقۃ فی نفسہ و ما روی عن ابیہ عن جدہ لا حجۃ فیہ و لیس بمتصل و ھو ضعیف... الخ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۸)

امام ابن معینؒ نے فرمایا کہ وہ فی نفسہ ثقہ ہے لیکن جب عن ابیہ عن جدہ سے روایت کرے تو حجت نہیں اور اس کی سند متصل نہیں بلکہ ضعیف ہے۔

امام میمونیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمدؒ بن حنبلؒ سے سنا:

یقول لہ اشیاء مناکیر و انما یکتب حدیثہ یعتبر بہ فاما ان یکون حجۃ فلا (ایضاً ص ۴۹)

انھوں نے فرمایا کہ اس سے بہت سی منکر اشیاء بھی ہیں اس کی حدیث اعتبار کے لیے تو لکھی جا سکتی ہے لیکن حجت کسی صورت میں نہیں ہو سکتی۔

اور امام اثرمؒ فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ بن حنبلؒ نے فرمایا کہ میں اس کی حدیثیں لکھ لیتا ہوں کبھی تو اس سے احتجاج کر لیتا ہوں۔

و ربما وجس فی القلب منہ شیٔ (ایضاً ص ۴۹)

اور کبھی اس سے دل میں کھٹکا گذرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مؤلف خیر الکلام نے (۱۹۳ و ۱۹۴) میں بحوالہ تحفۃ الاحوذی جلد ا ص ۲۶۷